نگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

عیدالضحیٰ نمبر

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ایک ادارہ مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کیا ہم امریکی امداد کے بغیر جی سکتے ہیں؟

ہاں! یقیناً ہم امریکا اور دنیا بھر سے ملنے والی امداد کے بغیر جی سکتے ہیں۔ اس سوال کا پہلا مختصر ترین جواب تو یہ ہے۔ اگر ہم اصل حقائق پر نظر ڈالیں تو حقیقت کھل کر سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو اس حقیقت کو سمجھنا ہوگا اور اس پر ایمان لانا ہی ہوگا کہ پاکستان ایک خالص اسلامی مملکت ہے یہ 98 فیصد مسلمانوں کا ملک ہے جسے اسلام اور اللہ کے نام پر قائم کیا گیا ہے یہ ہمارا نعرہ بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ' کوئی نہیں ہمارا معبود اللہ کے سوا۔ کتنی حیرت کا مقام ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان بحیثیت پاکستانی' ایک اکیلے اللہ کے ماننے والے ہو کر اپنے پروردگار سے مانگنے' اس کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کے بجائے امریکا سے اور دنیا بھر سے مانگتے ہیں۔ دستِ سوال دراز کرتے نہیں شرماتے لیکن وہ ربّ جو ہمارا ہی نہیں تمام دنیا اور کائنات کا ربّ ہے۔ سب کا پالنے والا اور نگہبانی کرنے والا ربّ ہے۔ اس سے نہیں مانگتے جب کہ وہ مانگنے کو نا صرف پسند بھی کرتا ہے بلکہ بار بار مانگنے کو اور زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہی تو ہے جو امریکا اور دیگر ممالک کو بھی دیتا ہے۔ شاید ہم براہِ راست مانگنے سے شرماتے ہیں۔

امریکا جس کی معیشت و اقتصادیات پر یہودی تاجروں کا قبضہ ہے وہ اپنی تجارت اپنے انداز و طریقوں سے ہی کرنے کے عادی ہیں ان کی تو نسل در نسل بے ایمان ہے۔ قرآن ان کی بد معاملگی بے ایمانی پر گواہ ہے' وہ اپنی تجارت کو سود در سود پر چمکانے کے عادی ہیں اور ہمیشہ سے رہے ہیں۔ بے ایمانی کرپشن ان کا وتیرہ اور کاروباری اصول رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی معیشت اور اقتصادیات پر اپنے ان اصولوں کے تحت ہی حملہ کیا ہے۔

پیسے کی چمک اچھے اچھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ تو ان کا اوّلین دشمن شیطان بھی لگا ہوا ہے جو انہیں بہکاتا' ورغلاتا رہتا ہے۔ مفلسی اور غربت سے ڈراتا رہتا ہے۔ شیطان بھی انہیں بھٹکاتا بہکاتا ہے جو راہِ حق پر' راہ راست پر چلنے والے ہوتے ہیں اور مسلمان تو ہے ہی راہِ حق کا مسافر۔ دنیا کے تمام مذاہب کے ماننے والے تو ویسے ہی خود اس کے پیروکار اور مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں انہیں بہکا کر سکھا کر وہ اپنا وقت برباد نہیں کرتا۔

آئی ایم ایف ہو یا عالمی بنک' یہ عالمی سطح کے بنک ہیں جو افراد سے نہیں ممالک سے ڈیل کرتے ہیں اور ممالک کو اس کے حکمران چلاتے ہیں وہی دست سوال دراز کرتے ہیں اور ان تمام ممالک کو جو قرضوں کے ضرورت مند ہوتے ہیں انہیں یہ دونوں عالمی ادارے اپنی اپنی شرائط سے باندھے رکھنے کے لیے اپنی من مانی شرائط پر ہی قرضے فراہم کرتے ہیں اور اپنی شرائط منوانے کے لیے قرض خواہ ممالک کے سربراہان کو اور متعلقہ افراد کو وہ مطلوبہ رقوم کا تقریباً چالیس فیصد تک کِک بیک یا کمیشن کے بطور ادا کر کے ان کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں کہ یہی ان کا سنہری اور تجارتی اصول ہے۔ باقی ماندہ ساٹھ فیصد میں سے پندرہ سے بیس فیصد خود ان اداروں کے

ان افراد کی کمیشن ہوتی ہے جو ان ممالک کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ باقی بچ رہ جانے والا پینتالیس فیصد' وہ بھی کئی قسطوں میں سخت ترین شرائط سے بندھی ملتی رہتی ہے۔ اگر انہیں منظور ہوتا ہے ورنہ تو درمیان میں مزید کوئی شرائط لاگو ہو سکتی ہیں۔ جبکہ مقروض ملک کو نا صرف پوری سو فیصد رقم ادا کرنا ہوتی ہے' ساتھ ہی ساتھ اس کا سود در سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے اور یوں کوئی بھی مقروض ملک ان کے شکنجے میں جکڑتا چلا جاتا ہے لیکن کسی اسلامی ملک اور خصوصاً پاکستان کے ساتھ ان عالمی اداروں کا خصوصی معاملہ ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کریلا بھی ہے اور نیم چڑھا بھی......! کیونکہ پاکستان اوّل تو مسلمان ملک ہے اور ساتھ ہی اس نے اپنے طور اپنی قوت اور ارادے کو بروئے کار لاتے ہوئے جوہری قوت بھی حاصل کر لی ہے جو تمام غیر مسلم دنیا کی آنکھوں میں نا صرف کھٹک رہی ہے بلکہ ان کے حلق میں ہڈی بن کر اٹک گئی ہے کیونکہ انہیں شدید خطرہ پاکستان اور پاکستانی قوم سے لاحق رہتا ہے کہ کہیں یہ کسی اور معاملے میں اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو جائے اور کہیں عالمی قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا اہل نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور اس کے تمام حواری اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ پاکستان کسی بھی طرح ان کے چنگل سے نہ نکل سکے اور وہ اپنی قوت سے اس قابل نہ ہو سکے......! کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان جب ہوش میں آتا ہے تو اپنی کشتیاں ساحل پر پہنچ کر جلا دیتا ہے پھر وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا اور سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی باز نہیں آتا۔

ویسے بھی مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں اور اختیار میں ہے۔ اگر امریکا چاہے بھی تو پاکستان کا نہ رزق روک سکتا ہے' نہ اس پر بغیر اللہ کی رضا کے مسلّط ہو سکتا ہے' اگر وطنِ عزیز کے رہنے والے تمام اہلِ ایمان آج ایک فیصلہ کر لیں کہ ہم اپنے رب سے رجوع کریں گے' صرف اسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے۔

ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے پاکستانی قوم پر بڑا احسان اور فضل کیا ہے کہ اہلِ وطن کو ایسی سرزمین عطا فرمائی ہے جو ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال ہے جس میں تانبہ' لوہا' پیٹرول جیسی دولت بھری پڑی ہے۔ یہ ہماری نااہلی ہے کہ ہم اللہ کی ان نعمتوں کو ٹھکرا رہے ہیں۔ اگر ہم آج فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے تو دنیا کی کون سی طاقت ہو گی جو ہمارا راستا روک سکے۔ اللہ کا کرم و احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسا عظیم خطۂ زمین عطا فرمایا جو اپنے محلِ وقوع اپنے حدود اربعہ کے لحاظ سے اپنی معدنیاتی اہلیت و صلاحیتوں کے اعتبار سے مالا مال ہے' اس کے علاوہ اللہ نے ہمیں پانی اور زرخیز زمین جو سونا اگلتی ہے' عطا فرمائی ہے۔ ہمارے چار سُو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہی نعمتیں ہیں' اگر ہم ان ملنے والی نعمتوں سے خود فائدہ اٹھانا چاہیں تو کون ہمیں روک سکتا ہے لیکن افسوس صد افسوس ہم نے تو خود کو یہودی تاجروں کے یہاں گروی رکھ چھوڑا ہے۔ ہم تو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے انہیں پامال کرتے ہیں۔ اپنا دستِ سوال اپنے مالک و آقا کے سامنے پھیلانے کے بجائے امریکا اور غیر مسلموں کے آگے دراز کر رکھا ہے۔ اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے۔ راہِ حق پر چلنے والا اپنا شکر ادا کرنے والا بنائے اور ہمیں قوت و استقامت عطا فرمائے کہ ہم غلامی کی ان تمام زنجیروں کو توڑ کر صرف ایک غلامی اپنا لیں۔ اپنے مالک و آقا اپنے خالق کی اپنے پالنے والے ربّ کی غلامی۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک یہود ان ان سے کچھ دریافت کرنے آئی اور اس نے (بطور دعا) کہا کہ اللہ تمہیں عذاب قبر سے پناہ دے تو حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب کیا جائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے عذاب قبر سے پناہ مانگتے ہوئے فرمایا کہ ہاں، حضرت عائشہؓ نے کہا کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ عذاب قبر سے پناہ مانگیں۔ بخاری: کتاب الکسوف

عزیزان محترم..... سلامت باشد

نومبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔

حدیث شریف ہے کہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے گفتگو جاری تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ بتاؤ سب سے زیادہ مجھ سے محبت کون کرتا ہے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یک زبان فرمایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر ہماری جان مال اور آل قربان ہم آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار یہ سوال دہرایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی تینوں دفعہ یہی جواب دہرایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں نے مجھے دیکھا میرے کردار و عمل کو دیکھا اس لیے تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور افق کی طرف دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی امت وہ ہوگی جس نے نہ مجھے دیکھا نہ میرے زمانے کو دیکھا نہ تمہیں دیکھا ہوگا مگر وہ میرے نام سے اتنی محبت کرے گی کہ اپنی جان تک قربان کردے گی وہ امت میری دوست ہوگی۔

ماضی قریب میں شیطان کے کچھ پجاریوں نے وقفہ وقفہ سے طرح طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کی جسارت کی لیکن مسلمانان عالم نے اس پر جس ردعمل کا اظہار کیا اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف کو درست ثابت کردیا۔ ہمارے ہاں تو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ مظاہرہ ہوا۔ کراچی میں صرف ایک دن میں دیوانوں نے چھ سینما گھر درجنوں گاڑیاں ٹریفک سگنل نذر آتش اور متعدد افراد کی جانیں لے کر اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ پنجاب میں ایک گرجا گھر اور کئی علاقوں میں غیر مسلموں کی عبادت گاہیں جلا ڈالیں یعنی بال بال قرض میں جکڑی اس قوم کے ایک گروہ نے نبی آخر الزماں کی محبت میں اربوں روپے پھونک کر یہ ثابت کیا کہ ان سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا اور کوئی نہیں..... ایک اور واقعہ بھی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر کتاب میں درج ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کی غرض سے جب طائف تشریف لے گئے تو طائف شہر کے اکابرین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے کے لیے کرائے کے غنڈوں اور شریر بچوں کی خدمات حاصل کرلیں۔ انہوں نے آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک زخموں سے چور ہوگیا۔ ایسے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور بولے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی آپ حکم کریں میں اس پوری وادی کو الٹ دوں یا ان دونوں پہاڑوں کے درمیان کچل دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں ابھی ان لوگوں کو میرا ادراک نہیں۔ یہ نہیں تو ان کی آنے والی نسلیں مجھ پر ایمان لے آئیں۔ میں ان پر رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میں انہیں تباہی کی بددعا کیسے دوں۔ اسلام امن سلامتی کا دین ہے۔ ہمارے آقا نے تو خود پر کچرا پھینکنے والی یہودیہ عورت کے لیے بھی دعا کی۔ یہ ہماری کیسی محبت ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارک پر عمل کرنے کے بجائے شیطان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے چلے جارہے ہیں۔ کیا اللہ کے محبوب کائنات کے سب سے افضل انسان کہ دنیا کی ابتدا سے ان جیسا نہ کوئی ہوا نہ قیامت تک ہوگا ان کا مرتبہ ایسا ہے کہ ایک معمولی قلم یا خاکہ یا کسی تھرڈ کلاس کتاب سے اس دمکتے چاند کی چاندنی کم ہوجائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ایک روز کی تعطیل کا اعلان کرنے والے ہمارے حکمران چھٹی کا اعلان کرنے کے بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ایک فاؤنڈیشن قائم کرکے یہ اعلان کردیتے کہ صدر وزیراعظم اور وزراء سمیت پوری قوم اپنی ایک روز کی تنخواہ اور آمدنی اس فنڈ میں دے گی اور اس فاؤنڈیشن کے تحت قرآن کریم اور سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کی ہر زبان میں چھاپ کر مفت تقسیم کیا جائے گا اور اس فاؤنڈیشن کے تحت اسلام پر تحقیقی کام کیا جائے گا تو شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا اظہار ہوتا۔ فرصت کی گھڑیوں میں سے چند لمحے کشید کرکے اس پہلو پر ضرور سوچیے گا کہ ہم واقعی میں عاشق رسول ہیں؟

اب آیئے اپنے نرم و گرم خطوط اور آراء کی طرف۔

شہناز بانو..... کراچی۔ محترم بھائی عمران! السلام علیکم اور دعائیں۔ بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہوں کہ تمام قارئین بخیر و عافیت ہوں۔ پچھلے دو ماہ سے گفتگو کی محفل سے غیر حاضر رہی۔ اس کی وہی پرانی وجہ تھی کہ مصروف تھی۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کس سلسلے میں؟ تو جناب ناول کی قسطیں لکھنے میں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر اپنا فضل و کرم کیا اور میری دیرینہ آرزو پوری کردی اور اپنے دربار میں اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاوا بھیج دیا۔ ان شاء اللہ جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے میں خانہ کعبہ کے دیدار میں مصروف ہوں گی۔ عمران بھائی کا حکم تھا کہ اگلے چند ماہ کی ایڈوانس قسطیں لکھ کر دے دیں دو مہینے پہلے تیاری کرلی تھی پھر اپنی خرابی صحت کی جانب توجہ دی۔ (جس کی جانب سے ہمیشہ بے پروائی برتتی ہوں) بس خط لکھنے کا ٹائم نکل جاتا

تھا۔ البتہ نئے افق مطالعے میں رہا۔ آج کل دل بہت اداس ہے کیونکہ ایک دشمن اسلام نے ایک انتہائی ناپاک جسارت کی ہے۔ اس سے اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہودی اور نصرانی کتنی زیادہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ مسلمانوں کو دہشت گرد کہنے والے خود کتنے بڑے دہشت گرد ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے پیارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کیا اہمیت رکھتی ہے اس کے والدین اس کی اولاد غرض کہ دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر اور کوئی بھی مسلمان یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ دنیا کا کوئی بھی انسان میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا سوچے بھی۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہودیوں اور عیسائیوں کی کارستانی ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں دہشت گرد ثابت کرسکیں۔ ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت کا ثبوت کس طرح دیں۔ کسی سے لڑ مر کر نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہو کر خود بھی عمل کریں اور دوسروں سے بھی کروائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرکے ہم ثابت کرسکیں کہ ہم زبانی نہیں عملی طور پر بھی مسلمان ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ ایک مومن دس یہودیوں پر بھاری ہے۔ رمضان گزر گیا عید گزر گئی کراچی میں لاشیں گرتی رہیں۔ لوگ اپنے پیاروں کے جنازوں کو کاندھا دیتے رہے یہ سب کون کررہا ہے۔ مسلمان مسلمان کا گلا کاٹ رہا ہے۔ رمضان کے مہینے میں بھی لوگ گناہ کبیرہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ شب قدر میں بھی ظلم جاری رہا کیا ہم اللہ کے قہر و غضب کو آواز نہیں دے رہے؟ جیسے ہمارے اعمال ہیں ویسے ہی حکمران ہم پر مسلط ہیں۔ بھوک اور خوف یہ سب ہماری بد اعمالیوں کے سبب ہیں آج ہمیں بہت ضرورت ہے توبہ کی اللہ کی جانب پلٹنے کی شاید کہ اللہ ہم پر رحم کردے۔ ماہ رمضان میں میں نے دعاؤں میں اپنے تمام ساتھیوں کو یاد رکھا اور باقاعدہ نام لے لے کر دعائیں کیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے اللہ کرے سب جلدی سے اپنے اپنے پیا گھر سدھاریں اور میری دعا اللہ نے قبول بھی کرلی۔ ہماری ایک پیاری بیٹی پیا گھر سدھارنے والی ہے۔ میں اسے بیٹی اس لیے کہتی ہوں کہ وہ بھی کبھی کبھی مجھ کو مما کہتی ہے پوچھو تو جانیں۔ عبداللہ شاہد تمہارے لیے خوب دعا کی جاوید مقبول بھائی آپ کی صحت کے لیے اور باقی سب ساتھیوں کے لیے بھی کس کس کا نام نہیں لکھ رہی۔ نازسلوش ڈھیر مبارک ہو تمہاری کہانی نئے افق کے دفتر سے ہی مل گئی۔ بھئی تم نے دعا بھی تو بہت زور و شور سے کروائی تھی۔ تمہارے لیے تو میری بہت سی دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ بہت خوش رہو۔ این شاہین بہت خوشی ہوئی تمہارے اعتکاف کے بارے میں جان کر اللہ قبول کرے۔ تم نے مجھ سے ملنے کا سوچا پھر رہ گئیں، کیوں بھئی؟ عمران بھائی سے میرا موبائل نمبر لے کر مجھے کال کرلو پر گھر پر ضرور آنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔ میری واپسی 2 نومبر کو ہوگی۔ پھر ان شاء اللہ ملاقات رہے گی۔ امی کیسی ہیں انہیں سلام کہنا۔ بشیر احمد بھٹی صاحب ناول پسند کرنے کا شکریہ آپ کے شہر آنے کا بہت دل چاہتا ہے کیونکہ میری بہن اور کافی رشتہ دار وہاں رہتے ہیں لیکن ٹائم نہیں ملتا۔ ایک مرتبہ اپریل کے مہینے میں ایک شادی میں شرکت کے لیے گئی تھی بہت گرمی تھی بھئی بس اب اسی لیے ہمت نہیں ہوئی۔ بھائی فقیر لنگاہ آپ کی صحت کیسی ہے۔ دعا میں یاد رکھتی ہوں اللہ آپ کو ہمیشہ اچھا رکھے۔ ریاض حسین قمر صاحب آپ نے حاضری کا حکم دیا سو حاضر ہیں اور کوئی حکم؟ بھائی ریاض بٹ کیسے ہیں؟ ناول کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ عبدالمالک کیف ناول ''گردش'' پر تمہارا تبصرہ اچھا لگا اور مجھے ہنسی بھی آئی۔ ناول پڑھتے رہو سب پتہ چلے گا۔ اب ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ شمروز پستول ہاتھ میں لے کر نواب کے کمرے میں گھس جائے اور ٹھائیں ٹھائیں کرکے آجائے۔ لو بھئی کہانی ختم پیسا ہضم۔ ہوں..... میرے بھائی عبداللہ شاہد کیا بات ہے اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو۔ بڑے بھائی سے ہی لڑ پڑے۔ انہوں نے جو موسیقی اور درود پاک والی بات کہی تھی وہ ایسی بھی غلط نہیں تھی۔ تمہیں پتا ہے لوگ موسیقی کو روح کی غذا کہتے ہیں لیکن یہ شیطانی روح کی غذا ہے۔ مومن کی روح کی غذا تو ذکر اللہ ہے اور مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔ اصلاح کرتا ہے تمہیں برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ ایک دن جب بھی دل بہت افسردہ اور پریشان ہو تو بہت پیار اور توجہ سے ذکر اللہ کرکے دیکھو موسیقی مت سنو فرق تمہیں خود پتا چل جائے گا۔ یقین جانو میں تمہاری خیر خواہ ہوں اور ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر تمہارے لیے دعائیں کرتی ہوں۔ ناراض تو نہیں ہونا اپنی بجیا سے.....؟ تم نے لکھا ہے میں پراٹھا کھا کر ناول لکھتی ہوں تو بھیا اس ہائی بلڈ پریشر نے پراٹھے تو کب کے بند کردیے ہیں۔ بہت سوکھا سوکھا ناشتہ کرتی ہوں۔ البتہ لکھنے کے دوران میری پیاری سی بہو گرین ٹی بنا بنا کر دیتی رہتی ہے۔ تمہارا ناول ''حصار'' اچھا تھا۔ اللہ سے دعا ہے مزید اچھا لکھو اور خوش رہو۔ بھائی جاوید مقبول کہاں غائب ہوگئے چلیں عبداللہ شاہد سے دوستی کرلیں۔ لڑائی جھگڑا کرنا اچھی بات نہیں مختصر سی زندگی میں پیار کریں یہی کافی ہے۔ عالیہ کہاں ہو بھئی؟ اب آتے ہیں پرچے کی جانب ''بازی گر'' اس مرتبہ بھی غائب ہے کیا بات ہے۔ خورشید پیرزادہ کے ناول ''بلاوا'' کی پہلی قسط اچھی تھی لیکن دوسری قسط بہت بور لگی۔ ''گنگا کا پجاری'' بہت زبردست ہے۔ پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ سچی کہانیاں سب اچھی تھیں۔ سوائے ''ذرنا آشنا'' کے۔ طرز تحریر اچھا نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آئی۔ خوشبوئے سخن میں عبداللہ شاہد کا گیت اچھا لگا۔ فقیر لنگاہ کا انتخاب بھی اچھا تھا۔ شاعر کا نام بھی لکھا کریں۔ بہت سے ساتھی غیر حاضر ہیں۔ سب کی خیریت کی متمنی ہوں۔ باقی جو رہ گئے ہیں سب کو سلام اور دعائیں اب مزید 2 ماہ بعد ملاقات ہوگی ان شاء اللہ۔ اللہ پاک میرے ملک میں امن کردے۔ لوگوں میں اتفاق اور بھائی چارہ پیدا کردے اور ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

شہنی ارشاد..... کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے تمام احباب بمعہ اپنے گھر والوں کے۔ بہت خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ میری مختصر غیر حاضری کو تمام احباب نے محسوس کیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ بھی آپ سب سے اتنی ہی محبت کرے اور سب کو خوش رکھے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اب خط نہیں لکھوں گی اور نہ ہی کوئی اسٹوری..... کیونکہ عبداللہ شاہد صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں اپنی اسٹوریز عمران بھائی کو رشوت دے کر لگواتی ہوں۔ یعنی رشوت تو وہی لوگ دیتے ہیں جن کا کام غیر معیاری اور مشکوک ہو اور میری اسٹوریز اس قابل بھی نہیں ہوتیں، کیا کہیں گے آپ عبداللہ شاہد؟ عمران بھائی نے مہنگائی کا رونا رونے کے بعد قارئین پر احسان کرتے ہوئے قیمت نہ بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے آپ قیمت بڑھا ہی دیں۔ جنہیں نئے افق سے محبت ہوگی وہ ایک روٹی کم کھا کر بھی نئے افق خرید لیں گے اور پھر آپ بھی دیکھ لیں گے۔ پچھلے چند دنوں سے کراچی کے حالات کافی خراب ہیں خاص طور پر گارمنٹس فیکٹری میں آتشزدگی کا المناک واقعہ تو بھلائے نہیں بھولتا۔ پتا نہیں یہ اللہ کی آزمائش ہے

یا ہمارے اعمالوں کی سزا ہے۔ اس کے علاوہ قتل ڈکیتی اغوا غرض کون سا جرم ہے جو یہاں نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم پر رحم کرے آمین۔ مبارک ہو نازش تمہاری گمشدہ اسٹوری مل گئی۔ عمران بھائی پر فائن لگا دو۔ تمہیں اتنی ٹینشن ہوئی۔ ورنہ میں نے تو تمہیں فاتحہ پڑھنے کا مشورہ دے ہی ڈالا تھا۔ این شاہین ڈیئر تمہیں میری اسٹوریز پسند آتی ہیں اس کے لیے شکریہ۔ میں تو اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک ادنیٰ سی کوشش کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ لوگ ڈائریکٹ نصیحت قبول نہیں کرتے۔ اس لیے سوچا کہ کہانی کے ذریعے بات سمجھائی جائے کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان برائیوں اور اچھائیوں کے سلسلے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ بعض برائیاں کرنے سے ہماری زندگیوں میں کتنے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جب ہم اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے اچھائیاں اپناتے ہیں تو ہماری زندگی کتنی سہل خوش حال اور مطمئن ہو جاتی ہے۔ بشیر بھٹی صاحب آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ میں آپ کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں۔ ''سچا خواب'' پسند کرنے کا شکریہ۔ ایم خان آپ کا نام کیا ہے۔ پلیز پورا نام لکھیں لوگ آپ کو کیا خان صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ آپ نے سچ کہا ہے خان صاحب ہم بھی اس ظلم کا شکار ہو چکے ہیں۔ لنگاہ انکل آپ بھی عمران بھائی پر فائن لگا دیں کہ انہوں نے آپ کا خط کیوں کاٹا۔ ریاض بٹ انکل آپ نے یاد کیا ہم آ گئے کیسے ہیں آپ نئی تفتیشی اسٹوری کے منتظر ہیں۔ محمد فہد آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ نے مجھے ای میل کی تھی میں نے بہت سے ساتھیوں کے اصرار پر فیس بک جوائن کر لیا ہے۔ عبداللہ شاہد میں اللہ کے فضل سے قرآن اور احادیث کی کتب کو ریگولر اپنے مطالعے میں شامل رکھتی ہوں اور سچی کہانیاں تحریر کرتے وقت خود بخود قرآنی آیات اور احادیث میرے ذہن میں آ جاتی ہیں۔ ویسے آپ نے مجھے اور نازش کو لڑوانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ہم بالکل بھی نہیں لڑے بلکہ ہماری دوستی مزید گہری ہو گئی ہے۔ آپ نے یہ کیوں لکھا کہ نازش کو لکھنا نہیں آتا تھا اچھا تو لکھتی ہے۔ آج آپ اپنی خیر منائیں۔ میں آپ سے فل لڑائی کے موڈ میں ہوں۔ آپ کی ''حصار'' اچھی تھی۔ چلیں خوش ہو جائیں میں نے تعریف کر دی ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے یہ رشیدہ کون ہے جو ''بھار'' میں گئی ہے۔ عالیہ انعام کہاں ہو بھئی اتنے دن سے غیر حاضر ہو۔ جاوید مقبول انکل بھی نہیں آئے ارشاد قریشی صاحب سب کہاں ہیں بھئی سب کو سلام۔ اب بات ہو جائے نئے افق پر سچی کہانیاں اچھی تھیں۔ مغربی ادب سے ''اوٹ'' اور ''عذاب چاہت'' بہترین تھیں۔ ''گنگا کا پجاری'' تو نمبرون پر تھی البتہ ''بلاوا'' اور ''سفر زندگی'' نے خاص متاثر نہیں کیا۔ خوش بو سخن میں عبداللہ شاہد کا گیت نمبر لے گیا۔ بہت ہی خوب صورت ہے۔ این شاہین کی دشواری بھی اچھی رہی۔ فقیر لنگاہ اور صابرہ کلثوم کا انتخاب بھی پسند آیا۔ محمد اسلم جاوید کی غزل بھی بہترین رہی۔ مجموعی طور پر نئے افق اس بار اچھا رہا۔ شہناز آپی اور اسد علی حج کے لیے جا رہے ہیں۔ سب سے دعا کی گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا حج قبول کرے۔ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور خیریت سے واپس لائے آمین۔ آپ سب سے دعاؤں کی گزارش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے اور ہمیں عمل صالح اپنانے کی توفیق عطا فرمائے آمین

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! امید ہے بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میں پچھلے کچھ عرصہ کافی مصروف رہی۔ جس کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی۔ لیکن اپنے ہر دلعزیز رسالے کا مطالعہ جاری رہا۔ ٹائٹل میں اس مرتبہ تھوڑا گرین کلر شامل کرنے سے خوب صورت لگ رہا تھا۔ ''دستک'' میں محترم مشتاق احمد قریشی کی تحریر ''غیر مسلم دنیا کی عالم اسلام پر یلغار'' متاثر کن تھی۔ ''اقرا'' میں جناب طاہر قریشی نے احادیث کی روشنی میں صبر اور شکر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ سچی کہانیاں بھی ساری خوب تھیں لیکن پہلے نمبر پر ''جرگہ'' دوسرے نمبر پر ''گرداب'' اور تیسرے نمبر پر ''علاج'' اور ''سربند'' پسند آئیں۔ مغرب سے انتخاب میں اوٹ اور عذاب چاہت اچھی تھیں۔ ناول سارے اچھے جا رہے ہیں۔ خوشبو سخن میں سید عبداللہ شاہد قدیر رانا' سمیع جمال وسیم اختر' محمد اسلم جاوید' واجد نگینوی' چوہدری محمد سلیم جناب فقیر محمد بخش' میثم علی آغا اور جناب ریاض حسین قمر کا کلام اچھا لگا۔ ذوق آگاہی کا سارا انتخاب خوب تھا۔ محترم ریاض حسین قمر صاحب آپ نے شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے میں اس سے متفق ہوں۔ یہ درست ہے شاعری نثر لکھنے سے مشکل ہے۔ اس لیے اس پر بھی اظہار خیال ہونا چاہیے۔ ریاض بھائی مجھے بالکل سمجھ نہیں میں نے آپ کی کون سی کہانی کا خون کر دیا ہے؟ فہد بھائی آپ کو بھی سلام بہت شکریہ آپ نے میری کمی محسوس کی۔ عبداللہ شاہد صاحب مجھے بہت اچھا لگا آپ نے جن خوب صورت الفاظ میں میری غزل کی تعریف کی۔ اس کے لیے آپ کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ کی اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ یہاں جو محنت کے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے یا تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کی تحریر پر رائے دینا پسند نہیں کیا جاتا۔ اکثر تعریف صرف نام دیکھ کر کی جاتی ہے چاہے تحریر اس قابل ہو یا نہ ہو۔ ریاض حسین قمر صاحب غزل پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ یہ آپ کی رہنمائی اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آخر میں میری طرف سے محترم مشتاق احمد قریشی' طاہر احمد قریشی' عفان احمد' اسرار احمد' شہناز آپی' محترم فقیر محمد بخش' ابن مقبول جاوید' ریاض بٹ' ارشاد احمد قریشی' عبدالمالک کیف' ناظم بخاری' محمد فہد' این شاہین' امیر حمزہ' شبنمی ارشاد' طاہرہ جبیں' ریحانہ سعیدہ' نازسلوش ذشے اور گفتگو کے تمام رائٹرز جن کا نام نہیں لکھ سکی سب کو خلوص بھرا سلام قبول ہو۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح سدا مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے۔ چند دن ہوئے ضروری کام کے سلسلے میں شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں اپنے محبوب پرچے سے ملاقات ہو گئی۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری جانب سے دلی مبارک باد قبول کریں۔ مارکیٹ میں یہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ہر ماہ کے آخر میں بڑی بے تابی سے پرچے کا ہمیں انتظار ہوتا ہے۔ غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اس بار سرورق پہلے کی نسبت بہت زیادہ خوب صورت تھا۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے جس خلوص اور محبت سے آپ ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ پرچے کے تمام عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ ہر کہانی کا اپنا ایک الگ رنگ ہوتا ہے۔ گفتگو' اقرا' دستک' بزم سخن' خوشبو سخن' ذوق آگہی' اسماء الحسنیٰ' روحانی علاج وغیرہ اچھے سلسلے ہیں۔ ناقابل فراموش اور غیر ملکی ادب سے ماخوذ کہانیاں اور سلسلہ وار کہانیاں خوب سے خوب تر تھیں جن سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مثلاً گرداب' جرگہ' نیت مراد' ڈرنا آشنا' عذاب چاہت' سفر زندگی' گردش وغیرہ۔ اگر آپ نئے افق میں کچھ تبدیلیاں کریں تو پرچہ عوام میں زیادہ مقبول ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قارئین نئی نئی تحریروں اور عنوان کے متلاشی ہوتے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے مگر ہم لوگ معاشی بحران سے باہر نہیں نکل پائے۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم ہے اب تو رزق کمانا مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ ملکی حالات ایسے ہیں سمجھ سے باہر ہے کراچی میں گارمنٹس فیکٹری کا واقعہ دل پر بہت اثر کر گیا جس میں کافی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ رسول پاک کی شان میں گستاخی کرنے والے شخص کو موت کی سزا دی جانی چاہیے تاکہ ہمارا دل ٹھنڈا ہو جائے۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں نیک تمناؤں کے ساتھ۔ اللہ حافظ

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ اکتوبر 2012ء کا شمارہ اس بار 20 ستمبر کو ہی بے قرار نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ سرورق آج کل خوب صورت اور منفرد ہوتے ہیں۔ جس کے لیے بنانے والے ہاتھ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہمیں اپنے محبوب پرچے کے اشتہارات بھی محبوب ہیں۔ اس کے بعد فہرست پر نظر دوڑائی لیکن اپنی کاوش کہیں نظر نہیں آئی۔ خیر سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہیں۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ میری تحریر اپنی باری کے انتظار میں ضرور لگی ہو گی۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی ''دستک'' ہمارے ذہنوں پر دستک دے رہی ہے۔ یہ بات تو تاریخ کے اوراق پر لکھی ہوئی ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر یا زور زبردستی سے نہیں پھیلا۔ البتہ یہ بات ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ امریکی تھنک ٹینک کے نئے حربوں کا ہم شکار ضرور ہو رہے ہیں اور ہمارے کم عقل بھائی ڈالروں کے لالچ میں آ کر وہ کچھ کر رہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ اب بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف۔ اس بار نازسلوش ذشے بہن کا خط موجود ہے بڑا اچھا اور پر مغز تبصرہ ہے۔ مجھے یاد نہ کرنے کا شکریہ۔ بہن نہ مایوس ہو کوئی بھی کہانی بھیجنے سے پہلے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس ضرور رکھ لیا کریں۔ آپ لکھنے سے ہاتھ نہ کھینچیں مجھے دیکھ لیں۔ میں گزشتہ 8 سال سے مہرے کی تکلیف میں گرفتار ہوں۔ میں کیسے کہانی لکھتا ہوں آپ اندازہ لگا سکتی ہیں۔ این شاہین بہن مجھے یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ اپنی کہانی شائع نہ ہونے کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ لائن میں لگی ہوں گی۔ بشیر احمد بھٹی صاحب میں تو ہمیشہ پوسٹ بکس نمبر 874 پر کہانیاں ارسال کرتا ہوں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ مہربانی نوازش۔ آپ سے محفل کی جان اور رونق برقرار ہے۔ محمد فہد جتوئی میری باتوں سے متفق ہیں اور اس کی روشنی میں ذکر کر رہے ہیں ہمارے حکمرانوں کے سیاہ کرتوتوں کا' ویل ڈن بھائی۔ ہم صرف اپنے دل کی بھڑاس ہی نکال سکتے ہیں۔ اوپر والوں کے کانوں پر تو جوں بھی نہیں رینگتی۔ عبدالمالک کیف اور سید عبداللہ شاہد کے تبصرے بھی جاندار اور مفصل ہیں بہت خوب' مجھے یاد کرنے پر تہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ طاہر قریشی صاحب کی تحریر کردہ اقرا ہمارے ایمان کو تازہ کر رہی ہے۔ خورشید پیرزادہ کی ''بلاوا'' اچھی جا رہی ہے۔ ویسے اپنی جگہ ایک بات ہے کہ باقی آئندہ ماہ کا بورڈ پڑھ کر مجھے کافی کوفت ہوتی ہے۔ بہن شہناز کی گردش خوب رہی۔ شروع میں جس طرح پٹھان چوکیدار کو قابو کیا گیا وہ کنیز اور شہروز کی پھرتی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہانی آگے بھی کافی چابکدستی سے بڑھی ہے۔ بہن آپ گفتگو میں نظر نہیں آ رہی اور آپ کے علاوہ بہن عالیہ انعام' بہن شبنمی ارشاد' ریحانہ سعیدہ بھی غائب ہیں۔ البتہ شبنمی ارشاد کی کہانی ''علاج'' ان کی رسالے میں موجودگی کا احساس دلا رہی ہے اور حسب معمول بہت خوب صورت ہے۔ باقی کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ بہت اچھی ہیں اور ہمارے پیارے پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ موجودہ مہنگائی کے دور میں نئے افق کی قیمت باقی پرچوں سے کم ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جس طرح مناسب سمجھیں کریں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اب بڑھتے ہیں باقی سلسلوں کی طرف۔ ذوق آگہی میں میرا انتخاب موجود ہے۔ بہت نوازش ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا انتخاب خوب ہے۔ نازسلوش ذشے کی مختصر کاوش بھی پسند آئی۔ عبدالمالک کیف کی خوش قسمتی کے کیا کہنے بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول بکھر گئے۔ پروفیسر واجد نگینوی کی معلومات سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا اب اجازت اللہ حافظ۔

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! سانحہ نائن الیون کے گیارہ سال مکمل ہونے کے موقع پر امریکا میں توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی متنازع فلم ریلیز کی گئی۔ جس سے دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ مذکورہ فلم میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارکہ میں گستاخی اور ان کی کردار کشی کی مذموم کوشش کی گئی جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں کا شدید ردعمل جاری ہے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کو امن کا پیغام دینے کا دعویٰ کرنے والے امریکا نے اپنا یہ وتیرہ بنا لیا ہے کہ ہر سال کوئی نہ کوئی ایسی اسلام دشمن شر انگیز اور فتنہ خیز سرگرمی سر انجام دی جاتی ہے۔ جس سے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کی جانب سے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے تو یہ تواتر کے ساتھ ہو رہا ہے کہ کبھی ذرائع ابلاغ میں توہین آمیز خاکے شائع کر دیے جاتے ہیں تو کبھی اظہار رائے کی آزادی کے نام پر مسلمانوں کی دل آزاری کرنے والا فارمولا شائع کیا جاتا ہے۔ کہیں قرآن پاک کو نذر آتش کرنے کی ناپاک جسارت کی جاتی ہے اور کہیں ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ تمام کارروائیاں اور سرگرمیاں دراصل مسلمانوں کے صبر و تحمل اور برداشت کو آزمانے کے ہتھکنڈے ہیں جو ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر دم اپنی جانیں نچھاور کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی لبرل کیوں نہ ہو اور کتنا ہی گناہ گار ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر اپنی جان قربان کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ کسی مسلمان کا یہی وصف ہے کہ جو اسے دنیا کی دیگر تمام امتوں اور قوموں کے افراد سے ممتاز کرتا ہے کہ اس کے دل میں عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا چراغ روشن ہے کہ جس کے لیے اپنی جان مال عزت آبرو کی قربانی دینا اس کے لیے دونوں جہانوں کی سعادتیں سمیٹنے سے زیادہ معنیٰ رکھتا ہے۔ یہ مسلمان کا پختہ عقیدہ ہے کہ شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ گستاخ رسول کی سزا سر تن سے جدا۔ ہماری حکومت کو چاہیے کہ امریکی سفیر کو ملک بدر کریں۔ دوسری طرف کراچی بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں خوف ناک آتش زدگی نے سیکڑوں زندگیوں کے چراغ گل کر دیے اور ہزاروں غریبوں سے ان کے پیاروں کو چھین کر ان کے نقشے سے محروم کر دیا۔ ان مرنے والوں میں گھر کے سرپرستوں کے علاوہ ایسے کم سن بچے اور خواتین بھی شامل ہیں جنہیں خود کفالت کی ضرورت تھی۔ میری اللہ پاک سے دعا ہے کہ تمام مرنے والوں کو اللہ پاک جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے لواحقین کو صبر و تحمل دے۔ عذاب

ہے یا آزمائش آفات ہیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں اور مصائب ہیں کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پورا ملک کراچی سے خیبر تک اور چمن سے اسلام تک مبتلائے ابتلا ہے ابھی ہم نے زلزلے کے نتیجے میں عظیم سانحہ کی کوکھ میں جنم لینے والی المناک داستانوں کو فراموش بھی نہیں کیا تھا کہ پھر بارش نے خوفناک تباہی مچادی۔ دریاؤں کے کنارے بستیاں اور شہر کے شہر زیر آب آئے کہ ان پر سمندر کا گمان ہونے لگا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا فصلوں میں چار چار فٹ تک پانی جمع ہو گیا تھا کئی لوگوں کی فصلیں تباہ ہو گئیں کئی لوگوں کے مکان گر پڑے یہاں تک کہ ہمارے اپنے مکان کی چار دیواری اور بیٹھک گر گئی۔ لگا تار 36 گھنٹے موسلا دھار بارش نے تو لوگوں کو بے گھر کر دیا۔ اب تک کئی لوگ سڑکوں پر بیٹھے ہیں کیونکہ ان کے مکانات گر گئے ہیں۔ لیکن وہ اتنے غریب ہیں کہ دوسرا مکان نہیں بنا سکتے اور ہماری حکومت کا کوئی بھی فرد ان کے پاس نہیں آیا نہ ہی ان کو کوئی امداد مل رہی ہے۔ ہم لاکھ گناہ گار بدکار سیاہ کار اور خواب غفلت کا شکار سہی لیکن آئیے ہم سب اپنے قصبے، گلی محلے، شہر اور گاؤں میں جمع ہو کر اپنے سر جھکائیں اپنا دامن پھیلائیں اور خوب گڑگڑا کر اس رب العالمین سے اس کی رحمت کی بھیک مانگیں۔ اب آتا ہوں رسالے کی طرف ہمیشہ کی طرح ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ دستک، گفتگو، اسماء الحسنیٰ، اقرا پڑھ کر دل کو راحت ملی۔ گفتگو میں کچھ دوستوں نے منہ موڑ لیا ہے۔ کیوں بھئی اتنی بے رخی کیوں؟ پلیز واپس آجاؤ۔ پچھلے ماہ میں خود بھی غیر حاضر تھا کیونکہ میں تھوڑا بیمار تھا۔ آپی شہناز جی آپ کی گردش میں تو اب نکھار آ گیا ہے۔ آپی آپ کراچی میں رہتی آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ میں کچھ دن پہلے دو دن کے لیے کراچی آیا تھا تو توبہ کر کے واپس گیا ہوں کہ میں آج کے بعد کراچی نہیں جاؤں گا۔ جیسے ہی میں لانڈھی اسٹیشن پر اترا تو اترتے ہی ٹیکسی والے کے پڑ چڑھا وہ مجھے نرسری اسٹاپ لے گیا اور 800 روپے لے لیے۔ وہاں پر جو کام تھا وہ کیا پھر میں صدر آیا شاپنگ کرنے تو جیسے ہی اترا تو سب لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میرے ہاتھ میں ایک بیگ کیا دیکھا کئی لوگ میرا پیچھا کرنے لگے کہ مجھے لوٹ لیں۔ جب میں ایزی لوڈ کرانے لگا تب ایک لڑکے نے میرا پرس نکالنے کی کوشش کی جب میں نے اسے دیکھا تو بھاگ گیا پھر میں بھی ڈر گیا کیونکہ میں وہاں اکیلا تھا اور یہاں میرا کوئی واقف نہیں تھا۔ پھر میں نے سوچا چلو صدر آیا ہوں تو نئے افق کا دفتر بھی پاس ہوگا کسی سے پوچھا تو اس نے بتا دیا پھر میں افق کے دفتر آ گیا بدقسمتی سے مشتاق احمد قریشی صاحب تو نہیں تھے لیکن طاہر احمد قریشی اور باقی اسٹاف سے میری ملاقات ہوئی اور مجھے بہت اچھا لگا اور وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ پھر دفتر سے باہر نکلتے ہی کراچی سے بھاگ نکلا۔ خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کا سارا انتخاب بہت اچھا تھا۔ آخر میں تمام نئے افق کے اسٹاف رائٹرز اور تمام نئے افق قارئین کو ناز جی کی طرف سے عیدالضحیٰ مبارک ہو۔

محمد فہد...... مظفر گڑھ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور نئے افق کے تمام قارئین، مصنفین، اسٹاف اور اس کا تمام عملہ بھی۔ اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ کو اپنی حفاظت وامان میں رکھے۔ خاکسار ادارے کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ ادارہ نے میرے نشتر نامے کو شرف پبلشنگ بخشا۔ گو کہ کافی جگہ قینچی نے اپنا کمال دکھایا خیر یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں اب تو عادت ہو چکی ہے۔ اس بار ٹائٹل کافی خوب صورت ہے اتنا خوب صورت کہ نظریں ہٹانے کو دل ہی نہیں کر رہا پر کیا کروں ہٹانی تو پڑیں کیونکہ اگر ٹائٹل ہی دیکھتا رہا تو باقی اندر کا مطالعہ کیسے ہوگا۔ اگر مطالعہ نہیں ہوگا تو تبصرہ کیسے کر پاؤں گا اور اگر تبصرہ نہیں کر پایا تو پھر کسی نئے "خطاب" سے نواز دیا جاؤں گا لیکن اس بار تبصرہ میں نے شمارے کے کسی مضمون پر نہیں کرنا کوئی سیاسی مضمون نہیں، کوئی دنیاوی مضمون نہیں بلکہ زیر قلم عنوان "ناموس رسالت" ہے۔ جی ہاں امریکا کی فلم انڈسٹری میں بنائی گئی دستاویزی فلم جس میں میرے نبی کی شان میں گستاخی کی گئی جس پر پورا عالم اسلام سراپا احتجاج ہے۔ جمعۃ المبارک کے دن نکالی جانے والی ملک گیر ریلیوں میں پرامن احتجاج کی بجائے فساد، توڑ پھوڑ، فائرنگ، سرکاری و پرائیویٹ پراپرٹیز کو آگ لگائی گئی کئی بینک لوٹے گئے، کئی دکانیں توڑ کر لوٹی گئیں، سی این جی اسٹیشنز توڑے گئے، کئی گاڑیاں جلائی گئیں اپنی ہی فورسز کے ساتھ مقابلہ اپنی ہی فورسز پر فائرنگ اپنی ہی فورسز کو زخمی اور شہید کیا گیا کیوں آخر کیوں؟ کیا یہ سب چیزیں کسی یہودی، کسی امریکن یا کسی گستاخ رسول کی تھیں۔ جن فورسز کے ساتھ مقابلہ کیا گیا کیا وہ امریکا کی تھیں؟ کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہی درس دیا ہے؟ جس ہستی کی ناموس کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اس ہستی کا درس کیا تھا؟ ارے جنہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے انہوں نے تو انہیں بھی دعائیں دیں۔ میرا یہ سوال کسی ایک فرد، گھر، محلے، کالونی، دیہات، شہر، تحصیل، ضلع، ڈویژن، صوبہ یا ملک سے نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ سے ہے۔ ایک بار سوچیے گا ضرور۔ محفل کے تمام دوستوں کو محمد فہد کی طرف سے سلام محبت اور ڈھیروں دعاؤں کا تحفہ قبول ہو۔ وہ تمام دوست جو غیر حاضر ہیں جلد از جلد حاضری لگوائیں۔ ناز سلوش ذیشے کیسی ہو جی کرسی صدارت مبارک ہو ویسے کہاں غائب ہو محترمہ؟ ڈیئر سسٹر این شاہین! سلام قبول فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے شکووں کو دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ آپ سے صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ تمام رشتوں کو ایک ہی ترازو میں تولنا چاہیے نا کہ نئے نئے کیونکہ اگر کسی ایک رشتے کی وجہ سے دوسرے رشتے کی اہمیت کم ہو تو وہ رشتہ دور ہو جاتا ہے۔ کلام پسند کرنے کا شکریہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے آمین۔ برادرم بشیر احمد بھٹی سلام محمدی برادرم یاد آوری پر شکریہ۔ محترم ریاض حسین قمر سلام محبت برادرم یاد آوری کا شکریہ۔ جناب ریاض بٹ سلام جناب تبصرہ کی تعریف پر خاکسار ممنون ہے۔ برادرم عبدالمالک کیف صاحب! وعلیکم السلام برادر اللہ کا شکر ہے آپ سناؤ دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ تمام دوستوں سے التماس ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں کیونکہ مارچ 2013ء میں میرے بی اے کے پیپرز ہیں اور دسمبر 2012ء میں اکاؤنٹنگ کے پیپر ہیں۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! رب تعالیٰ سے امید ہے کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ آج بڑے عرصے کے بعد قلم ہاتھ میں تھاما ہے۔ ایک کھویا ہوا لمس ہے جو قلم کے ذریعے لفظوں کی صورت صفحات پر بکھر جایا کرتا تھا۔ اپنائیت کا تیشہ ہاتھ میں لے کر تخلیق کی نہر کھودنے میں دل کو راحت کا احساس ملا کرتا تھا۔ ابھی جذبے لفظوں کا پیراہن پہنتے ہوئے کچھ اجنبیت سی محسوس کر رہے ہیں اور قلم ہاتھ میں وزنی لگ رہا ہے اور اپنا آپ بے وزن سا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر دل کو دلائل آخر کار کر ہی لیں گے کہ کچھ نہ کچھ تحریر کر کے مجھے زندہ ہونے کا احساس رہتا ہے۔ ابھی کافی عرصے سے تو یوں لگتا تھا کہ میں مر گئی اور گرد بکھری ہوئی سلگتی ہوئی کیفیت، ماحول پر طاری موت کا سناٹا، جا بجا موت کا رقص زندگی کو ڈھونڈیں بھی آخر کہاں؟

نجانے کیسے کیسے شیر جواں لپکتے ہوئے شعلوں میں بھسم ہو گئے اور بے حسوں کے لیے اوراق سیاہ کرنے کا سامان مہیا کر گئے۔ ٹارگٹ کلنگ کے نام پر صبح شام اجڑنے والے خاندان نیوز چینلز کے شہرت کمانے کا ذریعہ بن گئے۔ دوسرے کے درد کو اشتہار بنا کر نام کمانے والے یہ عفریت آخر اپنی قوت ماحول کو اور حالات کو سدھارنے میں کیوں خرچ نہیں کرتے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک فلم 30Daysofnight دیکھنے کا اتفاق ہوا زمین کا ایک خطہ جہاں مہینے کے تیس دن صرف رات رہتی ہے اور سورج نہیں نکلتا۔ ایسے میں انسان نما عفریت وہاں اپنی شیطانیت کے ساتھ نکل آتے ہیں جن کا کام ہی انسانوں کو بھنبھوڑنا اور ان کا خون پینا ہوتا ہے۔ ان کی قوت سے ٹکرانے کے لیے ہیرو کافی جتن کرتا ہے آخر کار آخری دن تھک کر خود میں عفریتوں کے خون کا وائرس انجیکٹ کر لیتا ہے کہ ان جیسا بن کر ان کا خاتمہ کر دینا آسان ہوگا اور پھر بالآخر سورج طلوع ہو جاتا ہے اور عفریت اس ہیرو سمیت راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے شہر کراچی میں بھی امن کا سورج نجانے کب طلوع ہوگا اور انسان نما عفریت اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ ایک ایسی ہی روشن چمکیلی اور حسین صبح کے انتظار میں ہر رات گزر جاتی ہے۔ لیکن تاریکی ختم نہیں ہو رہی۔ بدامنی کی یہ غلاظت سورج کی زندگی بخش شعاعوں کو ہم سے دور رکھے ہوئے ہے۔ اللہ ہم میں سے ہر کسی کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ صبح کو کام پر نکلا ہوا اپنا کوئی پیارا شام کو بخیر وعافیت گھر لوٹ آتا ہے تو سکون کا سانس آتا ہے۔ نئے افق کا سرورق اپنی نئی روش کے مطابق انتہائی حسین معلوم دینے لگا ہے۔ اس ماہ بھی کسی جزیرے پر قائم قلعہ نما عمارت اور ٹکراتا ہوا نیلا پانی اور پھر ان پر رکی ہوئی اونچے بادبانوں والی کشتی آسمان پر غوطہ زن پرندوں اور ہچکولے لیتے ہوئے بادلوں کو بھی اپنی خوب صورتی اور رعنائی کی جانب کھینچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے شک منظر بڑا دلکش اور حسین ہے۔ مشتاق انکل کی "دستک" سوچ اور فکر کے دروازوں پر خود کو بڑی خوبی کے ساتھ آزمائی رہتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ نجانے کتنے در وا ہوں گے کہ نیک کام کرنے والے کو صلے کی اور نتیجے کی پروا ہوتی ہی کب ہے۔ گفتگو میں رونقیں ہمیشہ کی طرح بام عروج پر دکھائی دیں۔ اللہ تمام بہنوں اور بھائیوں کو پرخلوص محبت سے سجے اس چمن کو سدا یونہی لہلہاتا رکھے آمین۔ "اقرا" میں اس ماہ جس موضوع کو احادیث کی روشنی میں زیر بحث لایا گیا وہ انتہائی متاثر کن ثابت ہوا اور ہم جیسے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہدایت کا سامان بن گیا۔ "بلاوا" کی پچھلی قسط ہی کا مطالعہ مکمل نہ ہو سکا اس دفعہ تبصرہ ادھار رکھیں۔ "رنگین لڑکی" مغربی معاشرے میں رچی بسی بے وفائی کے عنصر پر مبنی ایک قتل کی روداد تھی۔ جہاں ضمیر میں وفا کا وجود ہی نہ ہو تو محبت جیسا پاکیزہ جذبہ بھی ہوس کی غلاظت میں تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ احمد صغیر صدیقی کی "اوٹ" عقل کو محو حیرت کر دینے والے سنسنی خیز واقعات پر مبنی اک متاثر کن تحریر تھی۔ انسانی عقل بڑے بڑے تماشے دکھاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی صورتحال یوں بھی ہو جاتی ہے کہ عقل بھی جواب دے جاتی ہے اور تعقل میں نہ آنے والی حقیقتوں کو بھی عقل کو تسلیم کرنا پڑ جاتا ہے۔ "عذاب چاہت" ایک انتہائی لطیف اور حسین تحریر تھی۔ جذبوں کو اظہار کے لیے کسی زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ تو وہ جذبہ ہے جو سبک ہوا کی صورت پھولوں کی کیاریوں میں سرسراتا ہے جو کرنوں کی صورت آسمان کی تاریک وسعتوں میں چاند کے ہالے کی صورت اپنا وجود منواتا ہے اور جو بے آب وگیاہ زمینوں پر اچانک سے امڈ آنے والے بارش برساتے ہوئے بادلوں کی صورت نمودار ہو جاتا ہے۔ بس خلوص کا جذبہ موجود رہنا چاہیے۔ چاہتیں خود آ کر قدم چومتی ہیں۔ "گرداب" ہمیں ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں ناممکن کو ممکن بنا دینے کی روداد نے دل جیت لیے۔ "نیت مراد" ناعاقبت اندیشیوں کی کہانی تھی جو ہر ناجائز عمل کے ذریعے اپنی خواہشوں کی تکمیل کو آسان اور جائز سمجھنے لگتے ہیں۔ اللہ اور دین کی راہ کو چھوڑ کر شیطانی عملیات کو اپنے ہر مسئلے کا حل سمجھ کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اپنی دنیا بھی خراب کرتے ہیں اور آخرت بھی۔ "جرگہ" میں ایک انتہائی ظالمانہ عمل اور غیر انسانی فیصلوں کے ہاتھوں برباد ہونے والی زندگیوں کے حوالے سے ذکر ملتا ہے۔ معاملہ انتہائی آسانی سے حل ہوتا ہوا دکھایا گیا۔ کاش کہ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہو جاتا۔ "گنگا کا پجاری" اے حمید کی ایک ایسی تحریر کہ اگر مجھے کسی غار کے آگے کھڑے ہو کر کھل جا سم سم کہنا پڑے اور نتیجے میں خزانے سے بھرے ہوئے صندوق میری نگاہوں کے سامنے آ جائیں تو تب بھی شاید مجھے وہ خوشی حاصل نہ ہو جو اے حمید کی تحریریں پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو میری بات شاید مبالغہ آرائی لگے مگر میں سچ کہتی ہوں کہ اے حمید کی تحریروں کی خوب صورتی بیان کرنے کے لیے میرے نزدیک ہر قسم کی مبالغہ آرائی درست اور جائز ہے۔ اجازت دیں اللہ حافظ۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب۔ سلام محبت اکتوبر کا نئے افق وقت پر ہی اسٹالز پر آ گیا تھا۔ یہ سب آپ کی اور آپ کے ساتھ محنتی اور لگن سے کام کرنے والے آپ کے ساتھیوں کی کوششوں کا ثمر ہے۔ خدا آپ سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین۔ ٹائٹل کے نئے انداز نے جریدے کی نہ صرف خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے بلکہ اسے ایسی انفرادیت بخشی ہے کہ دور سے دیکھتے ہی ہمارا پیارا میگزین پہچانا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے آمین۔ "دستک" میں محترم مشتاق احمد قریشی نے جو کچھ بیان فرمایا ہے وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام ایک سچا مذہب اور دین فطرت ہے اور اس کے ماننے والے پرامن اور انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ ہیں۔ عمران بھائی یہ سب کچھ جو ہمارے ملک میں ہو رہا ہے یہ سب کچھ ہمارے اپنے اعمال ہی کا کیا دھرا ہے۔ جس معاشرے میں 3 معصوم غریب نادار اور یتیم بچوں کو تاوان کے لیے اغوا کر لیا جائے اور بوجہ غربت مطالبہ پورا نہ ہونے پر ان تینوں بچوں کو سفاکی کے ساتھ موت کی نیند سلا دیا جائے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے پھول تو برسنے سے رہے البتہ اس کا غضب اور قہر مختلف صورتوں میں ہم پر نازل ہوتا رہے گا اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے ہمیشہ ہمارے دلوں کو تازگی بخشی ہے وہ بھی آقائے نامدار کی پیاری پیاری احادیث کی صورت گفتگو میں محترمہ ناز سلوش ذیشے جب بھی تشریف لاتی ہیں بڑے کروفر کے ساتھ تشریف لاتی ہیں اور اکثر آتے ہی کرسی صدارت پر تشریف فرما ہو جاتی ہیں وہ بے شک بے شمار خوبیوں کی مالک ہیں ان کا تبصرہ بڑا اچھا تلا ہوتا ہے۔ خداوند کریم انہیں مزید خوبیوں سے نوازے آمین۔ محترمہ این شاہین صاحبہ بھی اچھے تبصرے کے ساتھ گفتگو میں موجود تھیں۔ محترمہ این شاہین صاحبہ غزل پسند فرمانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ بشیر احمد بھٹی صاحب آپ نے سب باتیں بجا لکھی ہیں۔ "ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر" دراصل ہم سب کے دل سے خوف خدا نکل گیا ہے۔ باقی ہم سب بے جان لاشے ہیں۔ ہمارے اندر کا انسان مرا نہیں تو سو ضرور گیا ہے۔ اب تازہ ترین واقعہ ہی لیجیے 21 ستمبر کا دن

جمعۃ المبارک کا دن تھا جسے یوم عشق رسول کا نام دیا گیا اس دن ہم نے جو گل کھلائے وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں اربوں روپے کا اپنا ہی نقصان کر دیا۔ اندھی گولیاں کتنے ہی لوگوں کو ابدی نیند سلا گئیں۔ کتنے معصوم بچے یتیم ہوئے کتنی سہاگنوں کے سہاگ اجڑے اور کتنے ہی گھروں کے واحد کفیل اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئے۔ دم بھرنے نکلے تھے اس ہستی کے عشق کا کہ جن کو طائف کے بازار میں پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔ نعلین مبارک خون پاک سے بھر گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنگ باری کرنے والوں کے لیے دعا فرماتے رہے کیا ہم اس ہستی کے پیروکار نہیں کہ بے قصور لوگوں کی جانیں لے لیتے ہیں اور پھر مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ مسلمان ہونا تو بہت دور کی بات ہے، ہم لوگ غالباً انسانوں کے زمرے میں بھی نہیں آتے۔ خدا ہمیں اپنی رحمت کا سایہ عطا فرمائے آمین۔ محترم ایم خان کا مختصر تبصرہ بھی پسند آیا۔ محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کو گفتگو میں پاکر دل کو سکون ملا کہ ان کے بغیر محفل سونی سونی سی لگتی ہے۔ بھائی ریاض بٹ صاحب کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جس شعر کا انتخاب کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ محترم محمد فہد ایک خوب صورت اور بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں تشریف لائے۔ فہد بھائی گلے شکوے تو اپنوں سے ہی ہوتے ہیں۔ بھلا بیگانوں سے گلے شکوے کوئی کرتا ہے؟ یہ اس محفل کی انفرادیت ہے کہ اس میں شمولیت کرنے والے ایک دوسرے کو اپنے قریبی عزیز سمجھتے ہیں۔ عبدالمالک کیف بھائی اتنا خوب صورت خط لکھنے پر آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ خداوند کریم آپ کو ہمیشہ خوش باش رکھے۔ محفل کا اختتام سید عبداللہ شاہد کے خوب صورت خط پر ہوا خدا تعالیٰ نئے افق کے سب قارئین کو شاد و آباد رکھے آمین۔ خوشبوئے سخن میں عمر اسرار نے بہت خوب صورت انتخاب پیش کیا ہے۔ سید عبداللہ شاہد کا گیت محمد فہد کی غزل این شاہین صاحب کی دشواری اچھی رہیں۔ ظریف احسن کا تیری عظمت کو سلام مرحوم مہدی حسن کی خدمت میں اچھا نذرانہ عقیدت ہے۔ جناب قدیر رانا مجاہد ناز عباسی، مسیح جمال وسیم اختر، محمد اسلم جاوید اور واجد نگینوی کی غزلیں اپنی اپنی جگہ خوب صورت تھیں۔ محترم محمد بخش صابر لنگاہ کا انتخاب خوب تھا۔ چوہدری سلیم اختر کی غزل بہت اچھی تھی۔ میثم علی آغا کی غزل خوشبوئے سخن میں سب سے اچھی رہی۔ وہ ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ انہیں بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ حصہ نثر میں سب شاہکار ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاول پور۔ محترم عمران احمد السلام علیکم اکتوبر کا نئے افق 23 ستمبر بروز اتوار خریدا۔ اس دفعہ ٹائٹل جاودانی ہے اندر کاغذ بھی سفید استعمال کیا گیا ہے۔ امید تھی کہ قیمت بھی پچاس روپے ہوگی کیونکہ کچھ مدیران بحالت مجبوری پانچ دہائیوں کو کراس کر کے چھ ویں دہائی یعنی ساٹھ روپے تک جا پہنچے ہیں۔ قیمت کے معاملے میں نئے افق نے قدم اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ماہنامہ آنچل بھی 50 کا ہو گیا ہے۔ خیر یہ تو آپ کی قناعت پسندی ہے کہ بہت کم قیمت میں سید برابن صفی صاحب کی نشانی عوام تک پہنچا رہے ہیں۔ نیا رخ بھی کبھی نئے افق کے ہم رکاب تھا۔ پھر چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے نئے افق سے بچھڑ گیا۔ نئے افق کا سفر جاری و ساری ہے۔ خدا سے دعا ہے یہ یونہی صدیوں مارکیٹ کی زینت بنا رہے آمین۔ ''گنگا کا پجاری'' کی قسط نمبر 2 کو آخری صفحات سے آپ صفحہ نمبر 138 پر لے آئے ہیں۔ گھر آ کر میں نے چارپائی کے جنوبی پائے پر چار تکیے لگائے تاکہ نیم دراز ہو کر مطالعہ کروں۔ بالکل سیدھے لیٹ کر پڑھنا بھی آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ سیدھے بیٹھ کر پڑھنے سے کمر دوہری ہو جاتی ہے درد کرنے لگتی ہے۔ اس لیے مطالعہ کے لیے تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ چار تکیے علی الترتیب رکھ کے ڈھلوان بنائی جائے پھر ٹیکی لگا کر لیٹا جائے۔ اس کے بعد رب جلیل کا بابرکت نام لے کر مطالعہ کیا جائے نیم دراز ہو کر سب سے پہلے میں نے اوراق پلٹنے میں دیر نہیں کی آخری صفحات میں گنگا کا پجاری کو ڈھونڈا۔ اسے غائب پا کر خیال آیا کہ شاید دوسری قسط اگلے مہینے آئے گی آخری صفحات میں نئی کہانی سفر زندگی شائع ہوئی ہے۔ پھر میں لسٹ کی طرف آیا تاکہ اصل منزل کا نشان ڈھونڈ کر لفٹ کے ذریعے منزل مقصود تک پہنچ کر اصل تجسس کا خاتمہ کیا جائے جو پچھلے ماہ گنگا کے پجاری اور بالا وانے پیدا کر دیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے پچھلے ماہ کا تجسس اب کی قسطوں میں ختم ہوگا تو ان قسطوں کا تجسس اگلے ماہ پر موقوف ہوگا۔ ظاہر ہے یہ سلسلہ روانی سے جاری رہے گا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ برانگیختہ ہو کر روزن دیوار سے جھانک تانک کر اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ دیوار کے پاس کیا ہو رہا ہے۔ کون کس کے پہلو میں سو رہا ہے۔ بچہ کیوں رو رہا ہے؟ بالا وا پر تجسس کہانی ہے آخر شروتی پرکاش کی جنسی خواہش کا شکار ہو گئی۔ فرانس سے در آمد نگین لڑکی خوب رہی۔ مغربی کہانیاں اوٹ اور عذاب چاہت نے خوب لطف دیا۔ مغربی کہانیوں کا اپنا ایک انداز ہے۔ گردش کی قسط نمبر 14 ایک خاص انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ نئے افق کی سلسلہ وار کہانیاں انداز بیاں میں منفرد ہوتی ہیں۔ دیسی ادب سے گرداب نیت مراد جرگہ سر بند علاج' ذرا آشنا بھی لاجواب کہانیاں ہیں۔ ایک عرصہ تک نئے افق میں اسکیچ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب کسی بھی کہانی پر تصویر نہیں ہوتی۔ یہ تصویریں کہانی کی عکاس ہوتی ہیں۔ اپنے مصور کو پھر ایک موقع دیجیے۔ گفتگو میں تمام دوستوں کے طویل تبصرے بھی خوب رہے۔ کبھی کبھار آخری صفحات میں انگلش ناول کا ترجمہ شائع ہوتا تھا۔ برائے مہربانی یہ سلسلہ پھر سے شروع کریں۔ اگر ناول طویل ہو تو بلاشک دو تین قسطوں میں شائع کر دیا کریں۔ ہندی ادب پرائے حمید صاحب مرحوم کی گنگا کا پجاری اچھی جا رہی ہے۔

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد۔ محترم بھائی عمران احمد السلام علیکم: اس دفعہ شمارہ تاخیر سے موصول ہوا۔ اس لیے جو کچھ پڑھا اور جتنا مطالعہ ہو سکا اس پر اختصار کے ساتھ بات چیت کرتا چلوں گا۔ اس بار سرورق دیکھ کر خوش گواری کا احساس ہوا۔ کلاسک کینوس پر سبز پوش پہاڑیوں کے عقب میں قدیم بندرگاہ کے اونچے اور ہیوی ڈرم کو نمایاں کیا گیا تھا اور اس کی ساحلی پٹی پر کھلے آسمان کے دودھیا بادلوں کے نیچے مست خرام بحری جہاز لنگر ڈالے دکھائی دے رہا تھا۔ قدرتی مظاہر میں یہ نیچرل سینری مصور کے برش کا شاہکار نمونہ تھا۔ رنگوں کا امتزاج آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ فہرست کی تزئین و ترتیب اچھی تھی مگر اپنی کہانی نہ دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس مرتبہ بھی ایک مکمل ناول سفر زندگی (محمد شاہد) کے نام سے شائع کیا گیا تھا جسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ہر مہینے ایک مکمل ناول کا سلسلہ بہت خوب اور عمدہ ہے۔ تاہم رسالے میں اس کے صفحات مخصوص ہونا چاہیے۔ اسے توشہ خاص اور آخری صفحات' آخری لمحات کے عنوان سے بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے محترم عمران بھائی۔ میرے قبلہ محترم مشتاق احمد قریشی کی حالیہ دستک ''غیر مسلم دنیا کی یلغار'' ہم نام نہاد اور خود غرض مسلمانوں کے لیے فکر یہ اور مدبرانہ تحریر ہے کہ خدا کرے ہم مسلمانوں کو ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہوش آ جائے آمین۔ آگے

اقرا کے روشن اوراق میں جناب طاہر قریشی معارف الحدیث سے احادیث کی مفصل اور کھلے کھلے الفاظ میں تشریح بیان کر رہے تھے۔ ایک مسلمان کو مصائب اور صدمات میں کیونکر صبر کرنا اور ضبط نفس سے کام لینا چاہیے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس مسلمان کو جو استقامت میسر آتی ہے اس کا درجہ کمال کیا ہوتا ہے اسے پڑھ کر گوناگوں سکون اور طمانیت ملی۔ یہ کیسی تلخ حقیقت ہے کہ مال و دولت اور روپے پیسوں کی موجودگی سے ہم سالہا سال کا سکون اور آرام حاصل کر کے چین کی بانسری بجاتے ہیں اور من چاہی انانیت سے احکامات صادر کرتے ہیں کیا اطمینان کے یہ ہلکورے قرآن و حدیث کی تعلیمات کے منافی نہیں ہیں طاہر بھائی۔ گفتگو میں آپ نے اپنے پیش لفظ میں یہ بجا فرمایا کہ حالت کے ہم خود ذمہ دار ہیں پھر کس سے اپنا رونا روئیں دوم شاید رسالے کی قیمت بڑھانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس لیے آپ قیمت بلاتر دو بڑھا دیں آپ کو کھلی چھوٹ ہے اور...... اور غریب لکھاریوں اور مصنفین کا اعزازیہ بھی تب ہی مہنگا اور اتنا قیمتی رسالہ قابل دسترس ہوگا ہمارے لیے۔ نجانے یہ آزادیٔ فکر کب نصیب ہوگی۔ اس دفعہ شرکائے محفل میں محض دس گیارہ ممبران تھے۔ بہت سے ریگولر دوست احباب چھٹیاں کر کے بیٹھ گئے ہیں یا اسٹوری بھجوا کر گفتگو سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور عمران بھائی بھی اس جرأت رندانہ پر خوب شائع کرتے ہیں ان لکھاریوں کو بہر غرض عصمت اقبال عین' مجاہد ناز عباسی' شبنم ارشاد' عالیہ انعام الٰہی' عبدالحکیم ساجد' ناظم بخاری' امیر حمزہ چاند' انجم ساحلی صاحب' طاہرہ جبیں تارا' اللہ دتہ عابد' ریحانہ سعیدہ' عبداللہ عاطر اور وسیم اختر' میثم علی آغا' سلمٰی غزل آپ معزز دوست بھی گفتگو میں شریک ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ دیگر رسائل میں اپنے خطوط سے حاضری دیتے ہیں۔ شاید ان موحدین قلم کاروں کو عمران احمد کی آشیرواد حاصل ہے۔ اس لیے یہ طرہ امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن یہ اچھا رویہ نہیں ہے اور ہر دل عزیز ناول نگار میری بجیا شہناز بانو بھی محفل میں اپنی غیر موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔ چلیں چھوڑیں گزرے کل کی بات کو آئیں آج کی بات کرتے ہیں جو شروع ہوتی ہے صدارتی کرسی پر جلوہ گر ہونے والی شخصیت سے جو اس ماہ کی سوئٹ پرسنالٹی جو ہمارے سامنے آئی وہ تھیں ناز سلوش ذشے بہت بہت مبارک ہو ذشے تمہیں آف کورس تمہارے جیسی شریر اور البڑ مزاج لڑکی محفل میں کوئی دوسری نہیں۔ کیا قہقہے لگاتی اور کسی خوش گلو طوطی کی مانند چہک مہک کر گفتگو کرتی ہو کہ پڑھ کر چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ عود کر آتی ہے۔ تمہارے پروجیکٹس کی تفصیلات خاصی شاندار ہیں لیکن لاابالی پن مستقبل میں ناکامی کا پتا دے رہی ہیں۔ شبنم نے درست رہنمائی کی ہے تم قدرے سنجیدگی سے اپنے کام پر توجہ دو۔ شہر آزار کی گمشدگی میں ہو سکتا ہے کوئی مصلحت خداوندی چھپی ہو اس لیے صبر کرو اور بہت شاہکار اسٹوری ہے تو پھر سے ری رائٹ کیوں نہیں کر سکتی تم؟ تمہاری آزاد شاعری میں محبت کا JOKE بڑا مزہ دیتا ہے میں نے پریاں دیکھی ہیں۔ گزشتہ ماہ شائع ہوئی تھی۔ اس دفعہ کوئی نظم پڑھنے کو نہیں ملی کیوں ذشے؟ کراچی سے این شاہین نے مطلع کیا کہ وہ گانے نہیں سنتی اور اسے برا سمجھتی ہیں۔ واقعی جسے دل نہ مانے اور طبیعت کے خلاف ہو وہ کام نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ تم نے یہ اچھا کیا کہ منافقت سے کام نہیں لیا۔ راحیلہ تاج کے ''بچے'' کا معمہ زیادہ مشکل تو نہیں تھا۔ دراصل بچہ جرم پکڑے جانے کے خوف سے پھر سے اقدام قتل پر آمادہ ہوا تھا اور ایک فرد پر ایک اینٹ کے لحاظ سے اسے دو بچوں پر دو اینٹیں گرانی تھیں اور یہ بچکانہ چھٹی حس تھی حالانکہ یہ ضروری نہیں تھا کہ بچے کی گرائی اینٹیں ٹھیک نشانے پر لگیں اور یہ محض خوف اور ڈر کی حالت میں آئی کیو بڑھ جانے کا ری ایکشن تھا۔ تمہاری نظم ''دشواری'' میں نارسائی کے جذبات جھلکتے محسوس ہو رہے تھے۔ نظم اگرچہ خوب تھی تاہم اس کے علاوہ بھی موضوعات ہیں جیسے زندگی' خواہشات وغیرہ۔ بندے کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بشیر احمد بھٹی کچھ عرصے سے دوبارہ لوٹے ہیں۔ تبصرہ پسند کرنے اور مبارک بادوں کا بھی شکریہ۔ آپ نے ناولز پر خاصے دلچسپ پیرائیوں میں تبصرہ تحریر کیا ہے۔ مزہ دوبالا ہو گیا۔ ہمارے نئے افق میں کہانیوں کی دربدری کی شکایت نجانے کیوں عام ہوتی جا رہی ہے؟ عمران بھائی اس حوالے سے ضروری اقدام اٹھائیں نا پلیز۔ ایم خان نے دوسری بار بھی مختصر تبصرہ کر کے کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ اس قسم کے رویے میری دیرینہ خواہشات میں سے ہیں لیکن میں قاصر ہوں۔ سوچتا ہوں لوگ کیسی خوب صورتی سے اپنی انٹری دے کر دیگر مصروفیات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب' بزرگوار خوب محنت اور ہمت سے تبصرہ کیا ہے لیکن میرے نام سلام دعائیں نہیں تھیں اس لیے ملال ہوا آپ کی صحت یابی کے لیے دعاگو ہوں۔ کوئی نظم اور شاعری بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا بات ہے لنگاہ صاحب؟ ریاض حسین قمر' تبصرہ لطف اندوزی کا باعث بنا تو محنت وصول ہوگئی' بہت شکریہ۔ لکھاریوں کے خیال سے کچھ مجبوریاں آڑے نہیں آتیں بلکہ یہ ہمارے عمران بھائی خود آڑے آ جاتے ہیں اور وہ بھی پورے کے پورے۔ اپنے فرزند صدیق اور اس کے گھر کی سناؤ سب خیریت سے اور خوش باش ہے نا؟ کیا تم نے بیٹے کی جلدی شادی نہیں کر دی۔ ہر مہینے کی طرح اس دفعہ بھی تمہاری غزل بہت معیاری اور لاجواب کر گئی ہے۔ یار قمر آپ ردیف اور قافیوں کا انتخاب اور چناؤ برمحل اور سہولت سے کرتے ہو اس لیے عمدہ شائع کرتے ہو کیا خیال ہے؟ ریاض بٹ دعاؤں کا شکریہ۔ آپ نے گفتگو میں دوست احباب کو پہلی فرصت میں اپنی حاضری لگوانے اور شامل ہونے کی ہدایت کی ہے اور ان کی غیر حاضری پر اپنی شکایت کا برملا اظہار کیا ہے۔ مسلسل تعلق داری کا یہ حق اور تقاضا بنتا ہے کہ یاد کرنے اور پکارنے پر جوابا ایسے زنی اور تبصرہ کیا جائے۔ ''پھول نے کہا'' فکر و تدبر کو جلا بخشتا عمدہ اقتباس ہے۔ آپ نے ابن مقبول صدیقی کو شعر کے نذرانے کی صورت مطمئن کرنے کی اچھی سعی کی ہے۔ جناب کی عمر و تجربہ بھی آپ کے جیسا ہے اس لیے ان کی عقل میں بات فٹ ہو جانا چاہیے۔ اس بار موصوف محفل میں شریک نہیں ہوئے اور بٹ صاحب میں نے ان کے خیالات اور تجویز پڑھنے کے بعد ان کا نام جاوید احمد سے عجوید صدیقی رکھ لیا ہے۔ عجم سے عجمی اور وید سے کتاب یعنی مطلب ہوتا ہے۔ ''عجمی کتاب'' بتائیے گا یہ نام مناسب نہیں ہے۔ محمد فہد میرے وطن کے پرجوش نوجوان کو توال کو صفائی پیش کرنے کی وجہ سے تمہیں خلاصی دی جاتی ہے اور میری جان کے ٹکڑے تمہیں پلیٹ فارم کے بجائے مرغی فارم استعمال کرنا چاہیے اور ساتھ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کون سا مرغی فارم؟ میرے چھوٹے اور بھولے بھائی! تم تو ریگولر ہو گئے ٹھیک ہے۔ لیکن میں کیا نئے افق میں رائے دیتے ہوئے جھک مار رہا ہوں ہر مہینے اور تمہیں اس پرچے کا گھسیارا اور گفتگو میں کوئی مسخرہ دکھائی دے رہا ہوں۔ تم اپنے چودہ طبق روشن کر کے رسالہ پڑھا کرو سمجھے بھائی۔ دوم میں جلد بدیر تم سے موبائل فون پر رابطہ کروں گا۔ انتظار کرنا ٹھیک ہے نا بھائی۔ عبدالمالک کیف اور واجد نگینوی کے تبصرے بھی مفصل اور دلچسپی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ تبصرہ کرنے کا شکریہ کیف۔ اب مختصر طور پر

کہانیوں کے بارے میں۔ اس دفعہ مغربی اسٹوری احمد صغیر صدیقی کی "اوٹ" باقی دونوں کہانیوں پر سبقت لے گئی۔ حیرت سے ششدر کردینے والی اس کہانی میں آر علڈ روچ کا نفسیاتی واہمہ خاصا بھیانک تھا اور دھوکا گلے کا طوق بن جائے تو آدمی زندہ درگور ہوجاتا ہے۔ کیا ڈاکٹر اسکاز اپنے مریض روچ کے اندر کے رقیب کو پہچان گیا تھا جس کی وجہ سے اس نے تجربہ کرنے سے گریز کیا۔ اس بار سچی کہانیوں میں جس نے وکٹری اسٹینڈ پر نمبرون کا طلائی تمغہ حاصل کیا وہ بہترین اسٹوری حسن اختر کی "سربند" تھی۔ کاشف نے جو محبت بھرے لیٹرز قاتل ادا سائرہ کو تحریر کیے وہ خاصے مزیدار اور مستی بھرے تھے۔ پر خلوص دوستی میں اصغر اور خود کاشف نے جو اپنا مواخذہ کیا اس سے سائرہ کے سامنے دوستی کا جذبہ جیت گیا۔ بہت زبردست اسٹوری تھی۔ ماہ اکتوبر کے زلزلے کے پس منظر میں شبنمی ارشاد کی کہانی "علاج" دوسرے نمبر پر رہی۔ جبکہ تیسرے نمبر پر غزالہ جلیل راؤ کی تحریر "گرداب" پسند آئی۔ جناب عمر اسرار نے خوشبوئے سخن میں پہلے نمبر پر میرے گیت کو شائع فرمایا اس ذرہ نوازی کا بہت شکریہ۔ جناب عقان بھائی کے مراسلات میں "عدل کا نظام" خاصے کی چیز تھی۔ پسند آئی۔ ناولوں میں خورشید پیرزادہ کی "بلاوا" کے اسرار ورموز بڑھتے جارہے ہیں۔ ہم دیکھیں گے نیروا پنی طلسماتی محبت سے روبن کو کیا کیا سراب دکھاتی ہے۔ پھر گردش میں بجیا شہناز بانو اپنی مشاقی قلم سے فن علم وادب کی بلندیوں کو چھورہی ہیں۔ بجیا خود محسوس کرتی ہوں گی کہ پچھلے ناول "زنجیر" سے اس "گردش" کا مورال اور پر فیکشن میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ قاری اور مصنف دونوں مزے لوٹ رہے ہیں لیکن جناب عمران احمد کے ہاتھوں عبداللہ کا قضیہ کشمیر کے مسئلے کی جوں کا توں ہے۔ جھوٹی کثرت رائے بھی کیا رائے ہوتی ہے۔ آمین

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم۔ دوماہ سے ماہنامہ بروقت مل رہا ہے کیونکہ میں نے ایک سال کے لیے بک کروالیا تھا اور اب ماہنامہ کی وجہ سے فکر مندی ختم ہوئی کہ اسے کہاں سے خریدنا ہے۔ سرورق حسب سابق ہر ماہ کی طرح خوب صورتی سے سجایا گیا اس کی مبارک باد مصور اور عمران صاحب کو پیش ہے۔ دستک مشتاق احمد قریشی صاحب "غیر مسلم دنیا کی عالم اسلام پر یلغار" دل والے آنکھوں والے انسانوں دین اسلام کے پیروکاروں کے لیے راہ سبق ہے اور یاد دلاتی ہے محمد بن قاسم جنت مکانی کی کہ وہ ایک عورت کی آواز پر طوفان بن کر چلا اور راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو کاٹ کر رکھ دیا اور اب جبکہ بہت کچھ غیر مسلم اقوام کررہی ہیں اور ہم سورہے ہیں اللہ پاک ہمارے حال پر رحم کرے اور ہمیں صراط مستقیم پر چلائے۔ گفتگو عمران احمد صاحب وقارئین، بہن بھائیوں کا سنگ وساتھ میں آغاز (بخاری ابواب صفۃ الصلوۃ) سے اقتباس پیش کرکے چاروں طرف خوشبو بکھیر دی۔ اس کے بعد اعلامیہ پیش کیا گیا جس میں طوفانی بارشوں سے نقصانات کے بیان نے دل دکھی کردیا۔ دوسری طرف ڈینگی نے الگ پریشانی میں ڈالا ہوا ہے اور پھر کراچی میں گارمنٹ فیکٹری اور لاہور میں جوتا فیکٹری میں لگنے والی آگ جو کہ شعلوں کا روپ دھار گئی جس سے کافی انسانوں کی موت ہوئی۔ اللہ پاک ان مرنے والوں کو جنت الفردوس میں جگہ اور لواحقین کو صبر کی توفیق دے۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کے مایہ ناز بزرگ کامیڈین لہری صاحب بھی اللہ پاک کو پیارے ہوگئے ان کے لواحقین کو بھی صبر خداوند پاک عطا کرے۔ صدارتی کرسی پر ناز سلوش ذشے صاحبہ کو پایا۔ محترمہ مبارک باد اور دعائیں۔ صاحبزادی این شاہین صاحبہ آپ نے دونمبری کا اعزاز حاصل کیا اور ویسے بھی آپ کبھی کراچی اور کبھی منگلا ڈیم میں بہت اچھا انداز لیے ہوئے آپ کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد بشیر احمد بھٹی صاحب ایم خان صاحب کے مراسلے پڑھنے کو ملے بہت خوب پیارو دل سے آپ کی صداکاری پسند آئی دعا گو ہوں آپ کے لیے۔ پانچواں نمبر فقیر محمد بخش لنگاہ کو دیا گیا اس کے لیے عمران صاحب کا دلی طور پر شکریہ اور دعائیں۔ تبصرے کا فیصلہ قارئین، بہن بھائی کریں گے۔ چھٹا نمبر ریاض حسین قمر صاحب نے اپنا بھرپور تبصرہ پیش کرکے حاصل کیا۔ بہت پیاری پیاری باتوں نے محفل کو گرمادیا شکریہ پیارے آپ کی دعاؤں نے دل کو خوش کردیا کہ میرا بھی کوئی ہے۔ اللہ پاک آپ کو اپنی امان میں رکھے اور کامیابیاں اور کامرانیاں آپ کے قدم چومیں دعا گو ہوں باقی میری طرف سے سلام محبت قبول کرو۔ ساتواں نمبر بزرگوار بھائی ریاض بٹ صاحب نے اپنا بیان پیش کرکے حاصل کیا۔ سلام ودعا پیش ہے آپ کی یادآوری اور دعاؤں کا دلی طور پر شکریہ آپ کے شعر نے دل خوش کردیا اور بہت پسند آیا۔ محمد شفاعت حسنین ومحمد ثقلین صابر لنگاہ اور فیملی لنگاہ کی طرف سے بھی خلوص بھرا سلام محبت عرض ہے باقی دعا گو ہوں۔ آٹھواں نمبر برخوردار محمد فہد صاحب نے اپنی محفل میں اپنی چاہت کے پھول برسا کر حاصل کیا جسے دل نے بہت پسند کیا۔ شعر پسند آیا یادآوری کا شکریہ۔ باقی دعا گو ہوں۔ نواں نمبر برخوردار عبدالمالک کیف نے اپنا منفرد وبھرپور بیان پیش کرکے حاصل کیا خوب صورت بیان رہا اور پسند آیا آپ نے یاد کیا جس پر شکریہ۔ ہماری طرف سے دعائیں اور آخر میں محترم سید عبداللہ شاہد نے اپنا بھرپور بیان پیش کیا۔ اللہ پاک آپ کو ایک باوفا ساتھی عطا فرمائے فقیر صابر دعا گو رہے گا بلکہ ہے۔ آپ قدم بقدم ماہنامہ میں اپنی ادبی شخصیت کو جس طرح پیش کررہے ہیں اس کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ اللہ پاک آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ اس کے ساتھ محفل گفتگو میں شامل عزیزوں جو شامل محفل تھے ختم ہوئی مگر کچھ ایسے بھی عزیز، بہن بھائی اور بزرگ ہیں جنہوں نے اس ماہ محفل میں حاضری سے رخصت حاصل کی یا محترم عمران صاحب نے انہیں چھٹی کرادی مگر فقیر صابر نے ان کی غیر حاضری کو دل سے محسوس کیا اور ان کے لیے دلی سلام اور دعائیں پیش وعرض ہیں اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔ اقرأ میں دینی الحدیث کا سبق جو کہ دل کو منور کردیتا ہے جسے ترتیب کرکے پیش کیا طاہر قریشی صاحب نے۔ اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ جناب عمران احمد صاحب محفل بزم سخن کو ختم کرکے اس کی جگہ حافظ شبیر احمد کا روحانی علاج جس سے ہر بہن بھائی فائدہ اٹھا سکتا ہے پیش کرکے آپ نے نئے افق شمارہ کی اور شان بڑھادی ہے۔ خوش بوئے سخن میں صدارتی اعزاز سید عبداللہ شاہد نے گیت پیش کرکے حاصل کیا۔ مبارک باد فقیر کی نظم اکھیاں شامل کرنے کا شکریہ۔ این شاہین صاحبہ کی نظم دشواری بھی دل سے پسند کی گئی مبارک ہو محترمہ۔ ذوق آگہی میں صدارتی نمبر ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب نے فراست کی انتہا میں دین کے اسباق سے آگاہی بخش کر حاصل کیا دلی مبارک باد صدیقی صاحب پیش ہے۔ اس کے علاوہ ہم اور عداوتوں کے تیر جسے عبدالنادر انصاری نے پیش کیا پسند آیا۔ دونوں عزیزوں کو مبارک باد اور دعائیں۔ ہمارے پیارے دوست جناب چوہدری محمد طاہر سلطان جو کہ ماہنامہ نئے افق کے خاموش قاری ہیں کے والد محترم جناب چوہدری محمد اکرم گجر صاحب اللہ پاک کو پیارے ہوگئے۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں

جگہ دے۔ آپ سب بھی ان کے لیے دعائے بخشش ضرور کیجیے گا۔ سلسلہ وار داستانیں "گردش" اور "گنگا کا پجاری" دونوں سلسلوں نے آغاز سے لے کر باقی آئندہ تک تیزی ومیلان برقرار رکھا۔ دونوں مصنفین کو مبارک باد۔ آئندہ اقساط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ سچ بیانیوں میں پہلے نمبر پر "گرداب" دوسرے پر "جرگہ" تیسرے پر "علاج" اور چوتھے نمبر پر "سربند" کے ساتھ ساتھ ریحانہ سعیدہ کی تحریر "نیت مراد" کا مطالعہ کیا۔ یہ سب سچ بیانیاں اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے تھیں۔ فیملی آف لنگاہ کی طرف سے آپ سب کو بہت بہت دعائیں اور مبارک باد۔ آخر میں خورشید پیرزادہ نے "بلاوا" اس ماہ کی قسط میں بھی داستان کو بڑی سنسنی خیزی سے بیان کیا ہے۔ تیزی ومیلان کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت۔ اللہ حافظ

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم اچھے عمران جی السلام علیکم! سادہ رنگوں کے خوب صورت امتزاج سے بھرپور شکوہ ٹائٹل بے حد اچھا لگا۔ دستک میں ابوعبداللہ کی ایمان افروز داستان پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا سبحان اللہ۔ گفتگو میں حدیث شریف کا ذکر معلومات میں اضافہ کا باعث بنا جزاک اللہ۔ آپ کا اداریہ سوچ کے در وا کرتا چلا گیا۔ ناز سلوش ذشے یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ گمشدہ کہانی کے لیے تو ہم خلوص دل سے دعا گو ہیں۔ باقی ناولوں پر کام جاری رکھیں اور کم از کم اپنے قارئین کو محروم رکھ کر بدلہ نہ لیں۔ کہانی اس دفعہ نہ تھی۔ این شاہین کا تبصرہ بھرپور تھا مگر ہمارا ذکر نہ تھا بے حد دعائیں۔ بشیر احمد بھٹی صاحب بھی کہانی کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرانے آگئے۔ پوسٹ بکس پر بھی چیزیں مل جاتی ہیں باقی دعائیں۔ ایم خان اور فقیر محمد بخش لنگاہ کے مختصر ترین تبصرے اچھے تھے۔ ریاض حسین قمر آپ کا یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ تبصرہ بڑا بھرپور اور وسیع ہوتا ہے اور میں عمران صاحب سے آپ کی تجویز (ناقابل تحریر میں) کی بھرپور حمایت کرتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے مدیر معاون جناب اقبال بھٹی کو کرنا چاہیے کیوں جی؟ ریاض بٹ جی ہمسایوں کے حق پر ہونا پھر جی آیا نوں جناب۔ شعر اچھا تھا مگر میں آپ کے دشمن جناب۔ آپ کی کہانی کے لیے بڑا منتظر ہوں۔ محمد فہد بھی ریاض حسین قمر والی تجویز لے کر آئے ہیں۔ بھٹی صاحب غور فرمائیے۔ فہد آپ کا لمبا چوڑا مگر بھرپور اور زبردست تبصرہ مزہ دے گیا۔ لیجیے یہ عبدالمالک کیف صاحب بھی چھوٹے کا لحاظ رکھے بغیر تو تکار سمیت حاضر ہوگئے ہیں۔ ان کا Cell نمبر تھا کئی دفعہ کیا جواب "جی کون" آتا تھا۔ پھر جواب دیا۔ انہوں نے پھر پوچھا ہی نہیں اور پھر لکھنے کے آداب کہاں چلے گئے۔ کٹھور اور بے حس آپ ہیں کہ فون کا جواب بھی نہیں دیتے۔ تنقید میری ہمیشہ سدھارنے اور اچھے سے اچھا بنانے کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اب بہت لوگوں کا دل ہی چھوٹا ہو کم سوچ کا دماغ رکھیں تو پھر جیسے ہمارے عبداللہ شاہد ہیں۔ میرے ساتھ فون پر لمبی چوڑی بات ہوا کرتی تھی۔ عبداللہ شاہد لکھنا ہے اور ادب میں زندہ رہنا ہے تو پھر صحیح اور کڑوی تنقید کو بھی کڑوا گھونٹ سمجھ کر پینا پڑے گا اور اپنے آپ کو صحیح کرتے چلیں جائیں۔ تنقید تو سب کہانیوں پر (علاوہ سچی کہانیوں کے) ضرور کرتا ہوں۔ اس میں دیرینہ قدریں تعلقات کہاں سے آگئے۔ کیا سب کمزوروں اور کہانی کے تانے بانے کے کمزور یا خوامخواہ طوالت کو جان بوجھ کو علیحدہ رکھ دیں اور صرف واہ واہ ہو کیا یہ بد دیانتی نہیں، بے ایمانی نہیں۔ باقی جہاں تک موسیقی وغیرہ کا تعلق ہے تو ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ غلط راستے پر جانے والے کو صحیح بتادیں۔ ان حرام چیزوں کو مسلمان یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اس کی مرضی یہ ایمان کی کمزوری ہے۔ نماز فرض ہے ہر حالت میں پڑھنی ہے۔ ان تمام باتوں سے جذباتی انتہا سے زیادہ ہونے کا پتا چلتا ہے اور اسی جذباتی پن میں غلط فیصلے انسان کرجاتا ہے۔ باقی آپ مسلمان ہیں پھر بھی وہی ڈھاک کے تین پات۔ عمران صاحب واجد نگینوی کے متعلق کچھ نہ فرمایا اقبال بھٹی صاحب آپ کی کہانی کہاں ہے؟ اسماء الحسنیٰ کیا ختم کردیا ہے؟ روحانی علاج بہت بہتر جارہا ہے۔ خوشبوئے سخن میں آزاد نظموں میں این شاہین کی نمبرون پر رہی۔ دوسرے نمبر پر حسنین اور تیسرے نمبر پر ظریف احسن تھے۔ ویری گڈ۔ انتخاب دونوں بڑے بیسٹ تھے۔ غزلوں میں میثم علی آغا نمبرون رہے (میثم میں آپ کی غزلیں دوسرے میگزینز میں پڑھتا ہوں) نمبر دو قدیر رانا رہے۔ پھر مجاہد ناز عباسی پھر اسلم جاوید اور اسی طرح ریاض قمر حسین اور چوہدری اسلم کی نگارشات تھیں۔ ذوق آگہی میں فراست کی انتہا میرا انتخاب شائع کرنے پر شکریہ اور یہ چھوٹی سی آزاد نظم خوشبوئے سخن سے پھسل کر (ناز سلوش ذشے) ادھر کیسے آگئی؟ تحریریں سب ہی بہتر تھیں۔ کہانیوں میں سفر زندگی میں محمد شاہد یہ تعلقات اچھے خاصے لمبے کرتے گئے اور اتنے گہرے تعلقات جذبات اور ملنا جلنا پھر یہ بازی کیوں پلٹ دی۔ مجھے تو اچھا نہیں لگا کہ کہانی کو طویل سے طویل کرتے گئے اور پھر جان بوجھ کر غلط موڑ دے کر انجام دل دوز سے ہمکنار کردیا۔ ایسا انجام آپ نے کہیں قارئین کو یکدم چونکا دینے کے لیے تو نہیں کیا؟ ایک روایتی انجام خوش خوش رہنے والوں کا انجام بھی خوش خوش کرنا تھا۔ باقی کاوش بہت بہتر تھی۔ تحریر میں پختگی تھی۔ خورشید پیرزادہ اور دونوں سلسلے وار کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ بدیسی کہانیوں میں راحیلہ تاج کی کہانی "مزا نہ آیا اور نہ ہی زبردست تھی۔ صدیقی صاحب بڑی زبردست کہانی لائے مگر ذرا عقل انسانی سے اوپر۔ اسرار احمد صاحب کی عذاب چاہت سب سے بہترین اور اس بے لگام معاشرے کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ کر بے مثال کہانی رہی۔ مغربی معاشرے میں بھی ابھی قدریں باقی ہیں ویری گڈ۔ سچی کہانیوں میں سے گرداب نمبرون تھی۔ واقعی جیسی نیت ویسی مراد ریحانہ سعیدہ معاشرے کی ایک بے حد خوب صورت کہانی لائی ہیں۔ نصیحت آموز بھی اور بہت سوں کے لیے عبرت کا ساماں بھی ایسے نام نہاد مفاد پرست اور گندی ذہنیت کے بے ایمان جرگے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ جرگہ بھی ظلیل جباری کی بہترین کاوش تھی۔ سربند میں جو بیان کیا ہے اصغر اور کاشف ایسا کرسکتے ہیں لیکن اس طرح کا ہونا سائرہ جیسی لڑکیوں کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ ویری گڈ۔ تمام احباب کو سلام۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

توکل اور رضا بالقضا:۔

ہم انسانوں کو جو حقیقتیں حضرت انبیاء علیہم السلام کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اس کارخانہ ہستی میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس کو جو کچھ ملتا یا نہیں ملتا ہے' سب براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ سے ہوتا ہے اور ظاہری اسباب کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ چیزوں کے ہم تک پہنچنے کے لیے اللہ ہی کے مقرر کیے ہوئے صرف ذریعے اور راستے ہیں' جس طرح کہ گھروں میں پانی جن نلوں کے ذریعے پہنچتا ہے وہ پانی پہنچانے کے صرف راستے ہیں' پانی کی تقسیم میں ان کا اپنا کوئی دخل اور کوئی حصہ نہیں ہے اسی طرح اس عالم وجود میں کارفرمائی اسباب کی بالکل نہیں ہے' بلکہ کارفرما اور موثر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے۔

اس حقیقت پر دل سے یقین کر کے اپنے تمام مقاصد اور کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرنا اسی سے لو لگانا' اسی کی قدرت اور اسی کے کرم پر نظر رکھنا' اسی سے امید یا خوف ہونا' اور اسی سے دعا کرنا' بس اسی طرز عمل کا نام دین کی اصطلاح میں توکل ہے۔ توکل کی اصل حقیقت بس اتنی ہی ہے۔ ظاہری اسباب وتدابیر کا ترک کر دینا' یہ توکل کے لیے لازم نہیں ہے۔ حضرت انبیاء علیہم السلام خاص کر سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام اور ہر دور کے عارفین کاملین کا توکل یہی تھا' یہ سب حضرات اس کارخانہ ہستی کے اسبابی سلسلے کو اللہ تعالیٰ کے امر و حکم کے ماتحت اور اس کی حکمت کا تقاضا جانتے ہوئے عام حالات میں اسباب کا بھی استعمال کرتے تھے' لیکن دل کا اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ ہی کے حکم پر ہوتا تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا وہ اسباب کو پانی کے نلوں کی طرح صرف ایک راستہ اور ذریعہ ہی جانتے تھے' اور اسی واسطے وہ ان اسباب کے استعمال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے احکام کی تعمیل کا پورا پورا لحاظ رکھتے تھے' نیز یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان اسباب کی پابند نہیں ہے۔ وہ اگر چاہے تو ان کے بغیر بھی سب کچھ کر سکتا ہے' اور کبھی کبھی وہ اللہ تعالیٰ کی اس قادریت کا مشاہدہ اور تجربہ بھی کرتے تھے۔

الغرض ترک اسباب نہ توکل کی حقیقت میں داخل ہے نہ اس کے لیے شرط ہے' ہاں اگر غلبہ حال سے اللہ کا کوئی صاحب یقین بندہ ترک اسباب کر دے تو قابل اعتراض بھی نہیں بلکہ ان کے حق میں یہ کمال ہی ہوگا' اسی طرح اگر اسباب سے دل کا تعلق توڑنے کے لیے اور بجائے اسباب کے اللہ پر یقین پیدا کرنے کے لیے یا دوسروں کو اس کا مشاہدہ اور تجربہ کرانے کے لیے کوئی بندہ خدا ترک اسباب کا رویہ اختیار کر لے تو یہ بھی بالکل درست ہوگا لیکن توکل کی اصل حقیقت صرف اسی قدر ہے جو اوپر عرض کی گئی اور قرآن وحدیث میں اسی کی ترغیب ودعوت دی گئی ہے اور اسی کے حاملین کی مدح وثنا کی گئی ہے اور بلاشبہ یہ توکل' ایمان اور توحید کے کمال کا لازمی ثمرہ ہے۔ جس کو توکل نصیب نہیں' یقیناً اس کا ایمان اور اس کی توحید کامل نہیں ہے۔

پھر توکل سے بھی آگے رضا بالقضا کا مقام ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ پر جو بھی اچھے یا برے احوال آئیں وہ یہ یقین کرتے ہوئے کہ ہر حال کا بھیجنے والا میرا مالک ہی ہے اس کے حکم اور فیصلہ پر دل سے راضی اور شاد رہے اور راحت وعافیت کے دنوں کی طرح تکلیف ومصیبت کی گھڑیوں میں بھی اس کے خدا آشنا دل کی صدا یہی ہو کہ:۔

"ہرچہ زدوست میرسد نیکوست"

ان تمہیدی سطروں کے بعد توکل اور رضا بالقضاء کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں پڑھیے:۔

(۲۴۲)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔ میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ وہ' وہ بندگان خدا ہوں گے جو منتر نہیں کرتے' اور شگون بد نہیں لیتے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

(تشریح) اس حدیث کا مطلب صحیح طور پر سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مبعوث ہوئے اس وقت اہل عرب میں دوسری بہت سی چھوٹی بڑی قابل اصلاح برائیوں کے علاوہ یہ دو برائیاں بھی عام طور پر رائج تھیں...... ایک یہ کہ جب وہ خود یا ان کے بچے کسی بیماری اور دکھ درد میں مبتلا ہوتے تو اس وقت کے منتر کرنے والوں سے منتر کراتے اور سمجھتے کہ یہ جنتر منتر دکھ اور بیماری کو بھگانے کی ایک آسان تدبیر ہے (اور یہ منتر عموماً جاہلیت کے زمانہ ہی کے تھے) اور دوسرے یہ کہ جب وہ کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ کرتے جس میں نفع اور نقصان ہار اور جیت دونوں کا احتمال ہوتا تو شگون لیتے اور اگر شگون برا نکلتا تو سمجھتے کہ یہ کام ہم کو راست نہیں آئے گا اس لیے پھر اس کو نہیں کرتے تھے۔ الغرض شگون کو بھی وہ نقصان سے بچنے کی ایک آسان تدبیر جانتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں چیزوں کی مختلف موقعوں پر مذمت فرمائی اور تعلیم دی کہ بیماری دور کرنے کے لیے منتر نہ کرائے جائیں اور شگون بد لینے اور اس کا اثر قبول کرنے کا یہ طریقہ بھی چھوڑا جائے' اور یقین رکھا جائے کہ بیماری اور تندرستی اور نفع نقصان سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا اس پر بھروسہ کیا جائے اور اپنے مقاصد اور ضروریات کے لیے صرف وہی اسباب اور تدابیر استعمال کی جائیں جو اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ اصل کارفرما اور موثر اسباب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے' لہٰذا کسی مقصد کے لیے ایسے اسباب استعمال کرنا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں' سخت حماقت کی بات ہے۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

قسط نمبر 3

بلاوا

خورشید پیرزادہ

مافوق الفطرت واقعات، قصے کہانیاں اور ان پر بنائی جانے والی فلمیں تاریخ کے ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر کہانی ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر کئی نئے موڑ لے کر آپ کو حیران کرے گی۔

نئے افق کے تجسس پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک سنسنی خیز ناول

''اب کیا ارادہ ہے باس۔'' ساری کہانی دلچسپی سے سننے کے بعد امان نے روہن سے پوچھا۔

''ارادہ کیا ہونا ہے۔ اس کے سامنے بار بار جانا ہے۔ اس کے دل میں اتر کر اپنا بنانا ہے اور ساتھ چلنے کے لیے منانا ہے۔ اور کیا؟'' روہن نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔

''مطلب آج سے تم پورے ٹھرکی ہو جاؤ گے۔'' رویندر نے جملہ دیا۔

''ٹھرکی نہیں۔ نیرو کا عاشق بول۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کے بارے میں ایسا ویسا سوچا بھی نہیں ہے۔'' روہن نے رویندر کی گردن پکڑتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ یار۔ جان لے گا کیا۔'' رویندر اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولا۔ تم کون سے تیس مار خان بن گئے ہو۔ تمہارے اوپر مرنے والی لڑکیاں اب تمہیں للو سمجھنے لگی ہوں۔ ہاہاہا۔'' رویندر تالی بجا کر ہنسنے لگا۔

''میری شرافت کو کوئی للو پن سمجھے تو سمجھے۔ میں تو شروع سے ہی مانتا آیا ہوں کہ اگر آدمی اپنی بیوی سے وفا کی امید کرتا ہے تو اس کو بھی تو بیوی کا وفادار ہونا چاہیے۔'' روہن نے جواب دیا اور چارجنگ پر لگایا ہوا اپنا فون آن کر لیا۔

''ایک دم ٹھیک بولے ہو تم روہن بھائی لیکن آج کل کی لڑکیاں بھی تو بس لڑکیاں ہی ہیں۔ ویسے تم قسمت والے ہو کہ تمہیں نیرو مل گئی۔'' امان بھی بحث میں حصہ لیتا ہوا بولا۔

''ابھی کہاں مل گئی ہے یار۔ ابھی تو صرف دیکھا ہے۔ کہانی لمبی چلے گی۔ ایسا ہی لگتا ہے۔'' سمیر نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوں۔ ڈونٹ وری روہن۔ جب تک تمہیں منزل نہیں مل جاتی تم یہیں رہو گے۔ مہمان بن کر نہیں۔ اپنا گھر سمجھ کر۔ میں ذرا باہر جا کر آتا ہوں۔ انجوائے کرو۔'' کہہ کر امان کھڑا ہو گیا۔

''اور میں۔ میں کہاں رہوں گا؟'' رویندر نے مذاق کیا۔

''تم کوشل کی بانہوں میں رہو گے یار۔ میرا اس سے دل بھر گیا ہے۔ اب اس کو تم سنبھالو۔ آج بھی آنے کو بول رہی تھی۔ بلا لوں؟''

''بلا لو یار۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ ہی ہی ہی۔'' رویندر نے تال میں تال ملائی۔

امان باہر نکلا ہی تھا کہ روہن کا فون بج اٹھا۔ پرکاش کا نمبر دیکھ کر روہن نے فون اٹھایا۔

''ہاں بھائی۔ وہ نیرو مل گئی ہے۔''

''کیا۔ کیا بکواس کر رہے ہو یار۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' پرکاش کی پھٹی ہوئی سی آواز فون پر ابھری۔

''ہاں بھائی سچ میں۔ میں نے اس کو دیکھ بھی لیا

ہے۔ جیسا اس نے مجھے سپنے میں بتایا تھا۔ بالکل اسی جگہ پر۔'' روہن نے رومانٹک لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اس خواب کے چکر میں اپنی زندگی برباد کر لو گے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ سب کچھ شروتی کا کیا دھرا تھا۔ اور نیرو نام کی ہزاروں لڑکیاں دکھا سکتا ہوں میں۔ کیا نام کے چکر میں تم کسی بھی نیرو کو اپنا سب کچھ سونپ دو گے۔'' پرکاش کا اشارہ اس کی جائیداد کی طرف تھا۔

''مگر بھائی وہ بہت خوب صورت ہے۔ اتنی پیاری ہے کہ بس۔ اور بہت ہی خاص فطرت کی مالک ہے وہ۔ اور۔'' روہن کچھ بول ہی رہا تھا کہ پرکاش نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''میں وہاں آ رہا ہوں۔ شروتی بھی میرے ساتھ ہی آ رہی ہے۔'' پرکاش نے کہا۔

''کیا۔ مگر یہاں کیوں اور وہ شروتی کیسے آئے گی.....تم لوگ رہو گے کہاں۔'' ایک ہی سانس میں حیرت زدہ روہن نے سوالوں کی جھڑی لگا دی۔

''جہاں تم رہ رہے ہو۔ وہاں ہم نہیں رہ سکتے کیا؟ باقی باتیں آنے کے بعد بتاؤں گا۔ ہم کل صبح نکلیں گے۔ گھر سے کچھ لے کر آنا ہے کیا؟'' پرکاش نے جلدی میں کہا۔

''ہاں بھائی میرا والٹ لیتے آنا۔ جلدی میں گھر ہی بھول آیا ہوں۔ میرا اے ٹی ایم کارڈ وغیرہ سب کچھ اسی میں ہے اور ہاں پانچ چھ ڈریس بھی لیتے آنا۔ مگر شروتی کیسے آ سکتی ہے بھائی۔'' روہن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''بولا نا یار۔ سب کچھ آ کر بتاؤں گا۔'' پرکاش نے کہتے ہی فون کاٹ دیا۔

☆☆☆......

شروتی پرکاش کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ بابا کو اگر یہ پتا چل گیا کہ کالج سے کوئی ٹور نہیں جا رہا تو؟'' شروتی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

پرکاش نے ساتھ چلنے کی بات جب سے کہی تھی وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

''کیوں بلاوجہ اپنا دماغ خراب کر رہی ہو۔ سنبھال کے رکھو اپنا دماغ۔ عمر کوٹ میں اسے بہت استعمال کرنا ہے تمہیں۔ لو تمہارا گھر آ گیا۔ بھولنا مت۔ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے۔ یہیں۔'' کہتے ہوئے پرکاش نے اس کی ران پر چٹکی کاٹ لی۔ شروتی جیسے رو ہی پڑی۔ لیکن آنسوؤں کو اس نے سسکیاں نہ بننے دیا۔ چپ چاپ گاڑی سے اتری اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ بھاری بھاری قدموں سے۔

......☆☆☆

امان شہر کے بیچوں بیچ آہستہ رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے جا رہا تھا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر روہن کے عجیب سے خوابوں کو لے کر کئی خیال آ رہے تھے۔ اور خواب بھی ایسا جو سچ ہو گیا۔ پچھلا جنم ہوتا ہے۔ یہ اس نے ہندی دیومالا یا بالی ووڈ کی فلموں میں دیکھا تھا۔ مگر اس کو اپنے سامنے سچ ہوتا ہوا وہ پہلی بار ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کو روہن کی قسمت پر ناز تھا اور اسی لیے شاید اس سے لگاؤ سا بھی ہو گیا تھا۔ یادوں کے بھنور میں الجھے امان کو اچانک اپنے پہلے پیار کی یاد آ گئی اور اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو چھلک پڑے۔ کتنی پیاری تھی وہ۔ ایک دم پھول سی نازک۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہو گیا تھا۔ مگر اقرار کبھی نہیں کر پائے۔ وہ اس کو دیکھ کر رہ جاتا اور وہ امان کو دیکھ کر رہ جاتی۔ گھر کی منڈیر پر کھڑے ہو کر گھنٹوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کا سلسلہ ایک دم بند ہو گیا۔ اس دن امان رات ہونے تک وہیں کھڑا

رہا تھا۔ اگلے دن جب اس کو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ شہر چھوڑ کر چلی گئی ہے تو وہ تڑپ اٹھا۔ دو دن تک کھانا بھی نہیں کھایا گیا اس سے۔ کم سے کم بتا تو دیتی۔ مگر ہو بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اس کو روک تھوڑے ہی لیتا۔ آخر عمر ہی کیا تھی اس کی اس وقت۔ مگر پیار عمر دیکھ کر تو نہیں ہوتا ہے۔ وہ تو بس ہو جاتا ہے۔ کہیں بھی۔ کسی سے بھی۔ اچانک۔ اچانک امان نے گاڑی ایک طرف روکی اور ایک فوٹو کاپی نکال کر پڑھنے لگا۔

"ہائے امان۔ جس دن تم نے مجھے پہلی بار چھت پر کھڑے دیکھا تھا۔ شاید تم نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر میں نے پہلی بار نہیں۔ میں تو تمہیں کتنے ہی دنوں سے گلی میں کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھتی آ رہی تھی۔ گھر کی کھڑکی سے تمہیں چھت پر پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھتی آ رہی تھی۔ پتنگ اڑاتے ہوئے تم جب بھی پیچھے ہٹتے ہوئے بالکل کنارے کے پاس آ جاتے تو میرا ننھا سا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ کہیں تم گر نہ جاؤ۔ میرا تمہیں پکار کر وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہنے کو دل کرتا۔ مگر کبھی آواز ہی نہیں نکال پائی۔ تمہارا نام لینا شاید میرے بس میں نہیں تھا۔ اور شاید میری قسمت میں بھی نہیں۔ تمہیں یاد ہے ایک بار انکل نے تمہیں تمہاری چھت پر آ کر چانٹا مارا تھا۔ (پتا نہیں کیوں) تم تو صرف روئے تھے۔ مگر میری چیخ نکل گئی تھی۔ میری ممی دوڑی ہوئی آئی تھیں چھت پر۔ کیا بتاتی ان کو......؟ سال پورا ہونے کو ہے۔ تم روز چھت پر آتے ہو۔ مگر ہمیشہ مجھ سے لیٹ۔ ہمیشہ میں ہی تمہارا انتظار کرتی ہوئی ملتی ہوں۔ ہے نا؟ کئی بار تم آدھا آدھا گھنٹہ انتظار کروا کر آتے۔ میرا تم سے روٹھنے کو دل کرتا۔ مگر پھر مناتا کون؟ تمہیں دیکھ کر ہی اتنا سکون ملتا تھا کہ ہر روز نیچے جاتے ہی اگلے دن کی شام کا انتظار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ تم سے ملنے کو اتنی تڑپتی تھی کہ سوتے ہوئے تکیہ سر سے نکال کے سینے پر چپکا لیتی تھی۔ لیکن تمہارا سینہ کبھی اس تکیے کی جگہ نہیں لے پایا۔ کتنی ہی بار تمہارے آگے سے گزری۔ لیکن تم نے روکا ہی نہیں۔ کتنی ہی بار جان بوجھ کر تمہاری بیٹنگ یا بولنگ کے ٹائم وکٹوں کے بیچ جا کر کھڑی ہوگئی۔ مگر کبھی تم نے ٹوکا ہی نہیں۔ تمہیں یاد ہے ایک دن جب ہم دونوں ایک ہی کلر کے کپڑے پہن کر چھت پر آ گئے تو دونوں کتنا ہنسے تھے۔ کلر تو یاد ہوگا نا؟ اس کے بعد تمہاری سبھی شرٹوں کے کلر میں نے یاد کر لیے تھے۔ روز سوچ کر پہنتی اور چھت پر آتی کہ تم نے شاید یہی کلر پہن رکھا ہو۔ مگر اس کے بعد کبھی کلر نہیں ملے۔ ایک دن تمہارے اوپر آتے ہی میں بھاگ کر نیچے گئی تھی۔ پتا ہے کیوں؟ تمہاری شرٹ کے کلر کا سوٹ پہننے۔ تم آج شام آئے ہی نہیں چھت پر آج تو تمہارا آنا بہت ضروری تھا۔ آج میں تم سے کچھ بولنا چاہتی تھی۔ پہلی بار۔ اور شاید آخری بار بھی۔ لیکن میری قسمت میں شاید تھا ہی نہیں۔ ایک بار تم سے بولنا۔ تمہارا ہاتھ پکڑ کر رونا۔ اور بتانا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں تم میرے کیا بن گئے ہو۔ میں کل جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ پاپا کا ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ اب چھت پر نظر نہیں آؤں گی کبھی۔ لیکن تمہیں بھول بھی نہیں پاؤں گی۔ تم بھی نہیں بھولو گے تم صبح دیر سے اٹھتے ہو۔ اس لیے خط تمہارے دوست ببلو کو دے کر جاؤں گی۔ امید ہے وہ تمہیں دے دے گا۔ کبھی بول نہیں پائی تم سے۔ بولنے کا بڑا من کرتا تھا۔ کہنے کا بڑا من کرتا تھا۔ آئی لو یو۔ میں بالکل بھی نہیں رو رہی۔ تم بھی رونا مت۔ پلیز۔

تمہاری (نام مٹ گیا تھا۔ شاید آنسوؤں نے مٹا دیا تھا)۔"

امان کاغذ کو دوبارہ پرس میں رکھتے ہوئے مسکرا اٹھا۔ مگر اس کی آنکھیں تو چھلک آئی تھیں۔ مسکراہٹ شاید بے بس آنکھوں کو دلاسہ دینے کے لیے ہی آئی ہوگی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے جیسے ہی وہ گورنمنٹ کالج کے سامنے سے گزرا اس کی نظر ببلو پر پڑ گئی۔

"اوئے ببلو۔" امان نے چلا کر اس کو پکارا۔

ببلو بھاگا ہوا اس کے پاس آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے یار۔ آج کل گھر کے اندر ہی رہتے ہو زیادہ تر؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ یہاں لڑکیوں کے کالج کے گیٹ پر کیا کام ہے تیرا۔ نوکری مانگنے آیا ہے کیا۔" امان نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نوکری کریں ہمارے دشمن۔ میں تو لائن مار رہا ہوں۔"

"کس پر؟ کس پر لائن مار رہا ہے۔" امان ہنسا۔

"لائن مل جائے پہلے۔ میں تو بس اپنا کام کر رہا ہوں۔ آگے کیا ہو یہ تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ کیا پتا کس گھڑی کسی نازنین کو ترس آ جائے۔ میری بھری جوانی پر۔ بتا نا کہاں جا رہا ہے؟" ببلو نے آخر میں پوچھا۔

"او تیری بھری جوانی۔ کہیں جا کر آنا ہے۔ تیرے لائن مارنے کے کام تو پھر بھی ہوتے رہیں گے۔ چلیں۔" امان نے پوچھا۔

"چلو یار۔ کبھی تمہیں منع کیا ہے۔" ببلو نے باہر نکل کر وقار کو پکارا۔ "میری گاڑی لے جانا بھائی۔" پھر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور گاڑی چل پڑی۔

......☆☆☆......

"ارے آنٹی جی کوئی ہے کیا۔" امان نے ایک گھر کے باہر آواز لگائی۔

"کون ہے؟" اندر سے لگ بھگ بھاگتی ہوئی چھریرے بدن کی لمبی سی گوری لڑکی دروازے تک آتے ہوئے بولی اور امان کو دیکھتے ہی خوش ہوگئی۔

"امان۔ آج کیسے یاد آ گئی اس گھر کی۔ آج تو بارش ہونی چاہیے اس خوشی میں۔" اور کھلکھلاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ "آؤ۔"

امان اور ببلو دونوں ٹہلتے ہوئے گھر کے اندر آ گئے۔

"آنٹی جی کہاں ہیں گوری۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔ شام تک آئیں گی۔ کچھ کام تھا کیا؟" گوری نے امان کو پانی دیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں تھا۔ میں پھر آ جاؤں گا۔ اچھا۔" امان نے پانی پی کر گلاس میز پر رکھا اور کھڑا ہوگیا۔ ببلو نے بھی ویسے ہی کیا۔

"ارے یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ابھی آئے اور ابھی چل دیئے۔ بیٹھو نا۔ چائے لاتی ہوں بنا کر۔" گوری حق سا جتاتے ہوئے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔

"نہیں گوری۔ آج جلدی میں ہوں۔ وہ سمیر آیا ہے۔ زیادہ دیر تک اکیلا چھوڑا تو برا مان جائے گا۔ میں بعد میں آؤں گا۔" امان نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

سمیر کا نام امان کے منہ سے سن کر گوری کے کان کھڑے ہوگئے۔ اچانک ہی حیرت کی ایک میٹھی سی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔

"سمیر آیا ہے۔ کب؟ اس کو کیوں نہیں لے کر آئے؟ کتنے سال ہوگئے اسے شکل دکھائے ہوئے۔"

"وہ۔ دراصل کچھ اور بھی دوست ہیں وہاں۔ ان کو اکیلا چھوڑنا تو بالکل ہی اچھا نہیں لگتا۔ شام کو بھیج دوں گا۔ اگر آیا تو۔" گوری کے برابر سے باہر نکلتے ہوئے امان نے کہا۔ "دروازہ بند کر لو۔ ہم جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" گوری چہکتی ہوئی ان کے ساتھ آئی اور دروازہ بند کرتے ہی بدحواسی میں اندر کی

طرف دوڑ پڑی۔ اندر جاتے ہی اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

"گوری میں کلاس میں ہوں۔ بعد میں بات کرتی ہوں۔" سرگوشیانہ آواز فون پر سنائی دی۔

"شلپا سن تو سہی۔ فون مت رکھنا۔ بعد میں پچھتاؤ گی نہیں تو۔" گوری نے کہا۔

"کیا ہوا؟ تمہاری سانسیں اتنی تیز کیوں چل رہی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔" شلپا کی آواز اب بھی بہت دھیمی تھی۔

گوری نے آنکھیں بند کر کے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور بڑھتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہاں! بس کیا بتاؤں...... سنو...... وہ سمیر آیا ہوا ہے۔"

"کیا؟" سمیر کا نام سن کر شلپا بھول ہی گئی کہ وہ کلاس روم میں ہے۔ پھر ہڑبڑاتے ہوئے اس نے فون کو چھپانے کی کوشش کی تو پوری کلاس میں قہقہہ گونج اٹھا۔

"گیٹ آؤٹ آف دی کلاس۔" لیکچرار نے پڑھانا چھوڑ کر اس کو یک سطری حکم سنا دیا۔

پوری کلاس امید کر رہی تھی کہ شلپا اب معاف کر دینے کے لیے گڑگڑائے گی۔ سب اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مگر اس کا جواب سن کر سبھی چونک پڑیں۔

"تھینکس مادام۔ تھینک یو ویری مچ۔" شلپا نے یہ سب بھاگتے بھاگتے ہی کہا اور کلاس سے غائب ہو گئی۔ کلاس میں سناٹا سا چھا گیا۔ سب لڑکیاں آنکھیں پھاڑے لیکچرار کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور لیکچرار آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف۔

شلپا نے بھاگتے ہوئے گیٹ پر آتے ہی رکشہ پکڑا اور بنا مول تول کیے بولی۔ "جلدی چلو۔ سیدھے۔"

"کہاں ہے وہ؟" گرتے پڑتے سنبھلتے شلپا گوری کے گھر پہنچی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی اپنی سانسوں پر قابو پاتی وہ اندر پہنچی اور گوری کے علاوہ کسی کو بھی وہاں نہ پا کر جھلا گئی۔

گوری مسلسل اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ شلپا کے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہی بولی۔

"پوری بات تو سن لیتی۔ مجھے پتا تھا۔ تم اب سیدھی یہیں آؤ گی۔"

"نہیں۔ وہ تو لیکچرار نے نکال دیا۔ لیکن ہے کہاں سمیر۔" شلپا میز پر رکھے جگ کو اٹھا کر غٹاغٹ پانی پیتے ہوئے بولی۔

"امان آیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ سمیر آیا ہوا ہے۔ ابھی وہ اسی کے پاس ہے۔ شام کو آئے گا شاید۔" گوری اٹھ کر جگ کو فرج کے اوپر رکھتے ہوئے بولی۔

"کون امان؟" شلپا نے پوچھا۔

"ارے وہی یار۔ جو پہلے ہمارے گھر کے پاس رہتے تھے۔ یاد نہیں۔"

"اوہ ہاں۔ مگر سمیر اس کا دوست ہے کیا؟" شلپا نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ وہ تو بچپن سے ہی اچھے دوست ہیں۔ تمہیں امان کا نام یاد نہیں ہے۔ شکل سے ضرور پہچان لوگی۔" گوری نے بتایا۔

"ابھی تو سمیر یہیں رہے گا نا۔" شلپا اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"مجھے کیا پتا۔ اسی سے پوچھ لینا۔" گوری شرارت سے مسکرانے لگی۔

شلپا نے اپنے چہرے پر آئی شرم کی لالی چھپانے کے لیے تکیہ اٹھا کر گوری کو دے مارا۔

"کیا اب بھی وہ اتنا ہی شرمیلا ہوگا' چار سال ہو گئے اس کو دیکھے ہوئے۔ تمہیں یاد ہے جب ایک بار

ہم چھپن چھپائی کھیل رہے تھے تو غلطی سے وہ اسی رضائی میں گھس گیا تھا جس میں' میں چھپی ہوئی تھی۔ پتا ہے کیسے اچھل پڑا تھا۔ جیسے اس کو کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے بعد وہ کبھی ہمارے ساتھ نہیں کھیلا۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی گوری۔ پوری زندگی نہیں بھول سکتی۔" کہتے ہوئے شلپا نے پیچھے سر ٹکایا اور مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں تم نے بتایا تھا۔ وہ پورے کا پورا تیرے اوپر لیٹ گیا تھا۔" گوری نے کچھ اور بھی یاد دلانے کی کوشش کی۔ مگر شاید شلپا تو پہلے ہی اسی پل میں کھوئی ہوئی تھی۔ سمیر کے ہاتھ کا لمس آج تک اس کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ وہ لمس وہ تڑپ آج تک شلپا کے سینے میں آگ لگائے ہوئے تھی۔ اور اس آگ کو بجھانے کے لیے بیس برس کی ہونے پر بھی کوئی اور ہاتھ اس کو گوارا نہیں تھا۔ وہ سمیر سے تب بھی پیار کرتی تھی اور آج بھی' وہ اسے کبھی بھول ہی نہیں پائی تھی۔

"چار سال بعد۔" آنکھیں بند کیے ہوئے ہی شلپا کے منہ سے نکلا۔

"کیا؟" گوری نے پوچھا۔

"آج چار سال بعد وہ مجھے دکھائی دے گا۔ بھول تو نہیں گیا ہوگا نا۔" شلپا نے دوہرایا اور آنکھیں کھول دیں۔

"تمہیں کیسے بھول سکتا ہے وہ۔ تم ہی تو اس سے سب سے زیادہ لڑا کرتی تھیں۔ اور پھر مناتی بھی تم ہی تھیں۔ اور اگر بھول بھی گیا ہو تو تم یاد دلا دینا۔ چھپن چھپائی والی بات بتا کر۔" گوری ہنسنے لگی۔

"وہ پھر بھاگ جائے گا۔ اگر چھپن چھپائی والی بات یاد دلا دی تو۔ جھینپو کہیں کا۔ کتنا پیارا تھا نا وہ۔" شلپا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تھا۔ کیوں بول رہی ہے پاگل۔ وہ تو ابھی بھی ہے۔" گوری نے اس کو ٹوکا۔

"مگر کیا وہ اب بھی اتنا ہی کیوٹ ہوگا۔" خود ہی کہہ کر شلپا شرما گئی۔ کشن اٹھا کر اپنے چہرے کو چھپا لیا۔

......☆☆☆......

"یار میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پرکاش آخر یہاں آ کیوں رہا ہے' اور وہ بھی شروتی کو لے کر؟" روہن حیرت زدہ سا بیٹھا کچھ سوچتے سوچتے اچانک بول پڑا۔

"ارے بھائی اس میں اتنا دماغ کھپانے والی کون سی بات ہے۔ آ رہا ہے تو آنے دے۔ اس کی بھی سن لینا۔ وقت کیا ہے؟" سمیر نے روہن کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بات نہیں ہے یار۔ مگر وہ رہیں گے کہاں؟ پرکاش کو بھی ایڈجسٹ کر لیتے مگر شروتی۔" بولتے بولتے وہ اچانک رک گیا۔

پاس بیٹھا ہوا رویندر بھلا موقع کا فائدہ اٹھانے سے کیسے چوک سکتا تھا۔ "یار تمہیں لڑکی کی اتنی پریشانی ہے تو چلو اسے میں رکھ لوں گا نا اپنے کمرے میں۔"

"تمہیں اس کے علاوہ بھی کوئی کام ہے کہ نہیں۔ جب دیکھو۔" روہن نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"یار اس بات کو تو بھول ہی جاؤ۔ اتنی بڑی کوٹھی میں کیا چھ لوگ بھی نہیں رہ سکتے۔" سمیر نے اس کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ "اور اگر ضرورت پڑی بھی تو ہم اپنے کمرے شیئر بھی تو کر سکتے ہیں۔ لڑکی اکیلی رہ لے گی۔ کیا مشکل ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے یار۔ پہلے ہی آپ نے اور امان بھائی نے ہم پر احسان کر رکھا ہے۔" روہن بول ہی رہا تھا کہ سمیر نے پیار سے اس کو لتاڑ دیا۔

"تم نے خوب دوست مانا بھائی۔ احسان کی بات کر کے تو تم نے شرمندہ ہی کر دیا ہے ہمیں۔ امان کو تم

ٹھیک سے جانتے نہیں ہو۔ یاروں کا یار ہے وہ۔ اگر تم پوری زندگی بھی یہاں رہنا چاہو تو اس کے چہرے پر شکن تک نہیں آئے گی۔ بلکہ وہ تو اور بھی خوش ہوگا۔ اکیلا رہ رہ کر ہی تو وہ شراب کا سہارا لینے لگا ہے۔ اس جیسا دوست نہ میں نے کبھی دیکھا ہے اور نہ شاید تم کبھی دیکھ پاؤ گے۔ جسٹ ریلیکس اور اپنی تمام توجہ نیرو پر رکھو۔ او کے۔"

"ٹھیک ہے یار اور میں کوشش کروں گا انہیں جلد واپس بھیجنے کی۔" روہن نے کہا ہی تھا کہ امان کمرے میں آ گیا۔

"کس کو جلدی بھیج رہے ہو بھائی۔"

"وہ یار۔ میرا ایک دوست اور آ رہا ہے کل۔ ایک لڑکی بھی ہے ساتھ میں۔" روہن نے جواب دیا۔

"ارے واہ۔ پھر تو پارٹی ہونی چاہئے یار۔ وہ لڑکی پرسنل ہے کیا؟" امان نے کچھ رک کر پوچھا۔

"نہیں یار۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ بہت ہی شریف اور بھولی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات مت کرنا پلیز، مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ پرکاش اس کو لائے گا کیسے؟ مطلب اس کے گھر پر کیا کہے گا؟" روہن نے امان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شریف لڑکیوں سے تو مجھے ویسے ہی ڈر لگتا ہے بھائی۔ میں تو ایسی ویسی لڑکیوں سے ہی کام چلا لیتا ہوں۔ چلو آنے دو۔ دیکھتے ہیں تمہاری اس شریف اور شرمیلی لڑکی کو بھی، آج کا کیا پروگرام ہے۔" کہہ کر امان ہنسنے لگا۔ "اور تمہارا کیا خیال ہے۔ کوشل کو بلاؤں یا نہیں۔ رات کو آنے کو بول رہی ہے؟" اس نے روبندر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

"کتنے بجے تک آئے گی۔" روبندر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ امان کو گوری کی بات یاد آ گئی۔ اس نے سمیر کی طرف دیکھا اور بولا۔

"گوری یاد ہے تمہیں؟"

"گوری...... اچھا گوری...... ہاں...... نا۔ یاد ہے کیا ہوا؟" سمیر کو اچانک یاد آ گیا۔

"تمہیں بلا رہی ہے گھر پر، شام کو چلے جانا ایک بار۔" امان بولا۔

"مجھے......! مگر مجھے کیوں؟" سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ لے یہ بھی میں ہی بتاؤں۔ تمہارا ہی کوئی چکر ہوگا اس کے ساتھ، یہاں سے جانے سے پہلے۔" امان نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ایسی تو کوئی بات تھی ہی نہیں۔ ایک اور بھی تو لڑکی رہتی تھی ان کے ساتھ والے گھر میں۔ آں...... ہاں...... شلپا۔" سمیر کو نام اچھی طرح سے یاد تھا۔ مگر جان بوجھ کر اس نے یاد کرنے کا ناٹک کیا تھا۔ نہیں تو امان ابھی اس کے لتے لینا شروع کر دیتا۔ چھپن چھپائی اور رضائی والی بات وہ بھی آج تک نہیں بھولا تھا۔ آخر پہلی بار اس نے کسی لڑکی کے نرم اور گرم جسم کو چھوا تھا اور پہلے لمس کا نشہ کون بھول سکتا ہے بھلا۔

"وہ بھی وہیں رہتی ہوگی۔ اب بھی۔ اس کی ممی کو دیکھا ہے میں نے۔ گاڑی سے اترتے ہوئے۔ اس کے ساتھ کوئی چکر تھا کیا؟" امان نے پوچھا۔

"سب کو اپنے جیسا کیوں سمجھتے ہو تم، لڑکی کا نام آتے ہی تمہیں چکر نظر آنے لگتا ہے۔" سمیر کہتے ہی ہنسنے لگا۔

"ٹھیک ہے، چلا جائے گا نا...... چلے جانا یار ایک بار، نہیں تو وہ سمجھے گی میں نے بولا ہی نہیں ہوگا تمہیں۔" امان نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ چلا جاؤں گا۔" سمیر کی آنکھوں میں شلپا کو دیکھنے کی تڑپ ابھر آئی تھی۔

......☆☆☆......

تقریباً پانچ بجے ایک کار گوری کے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ سمیر کا پلکیں بچھائے انتظار کر رہی شلپا کے دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔

"گوری۔ دیکھ تو آ گیا کیا۔"

"آ گیا ہوگا تو اندر ہی آئے گا۔ وہ کیا گھر بھول گیا ہوگا؟" گوری نے مذاق میں کہا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگی۔

سمیر نے کار سے اترتے ہی شلپا کے گھر پر نگاہ ڈالی۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ بے تاب نگاہوں سے بار بار ادھر ہی دیکھتے ہوئے وہ گوری کے گھر کے دروازے تک آ گیا۔ اپنے کپڑے درست کیے اور ہلکے سے دستک دی۔

"آ گیا۔ جاؤ تم ہی اس کا استقبال کرو۔" گوری ہنسنے لگی۔

"نہیں یار۔ مجھے شرم آ رہی ہے...... جا نا...... جلدی جا۔" شلپا بوکھلا سی گئی۔ "اوہ...... میں کیا کروں؟"

خود سے سوال کرتی ہوئی شلپا، سمیر کو گوری کے ساتھ آتا دیکھ کر ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں چھپ گئی۔ سمیر کو نظر بھر کر دیکھنے سے ہی شلپا کے دل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ کل تک جس کو وہ للو اور جھینپو کہہ کر پکارتی تھی آج وہ ایک بھرپور مرد اور شاندار فلمی ہیرو کے روپ میں اس کے سامنے موجود تھا۔ شلپا دروازے کے پیچھے چھپ کر اپنی سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔

گوری سمیر کو شلپا کے روپ میں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ مگر اندر آتے ہی جب اس نے شلپا کو غائب پایا تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیا ہوا۔" سمیر نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "چاچا اور چاچی نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔" گوری نے یونہی مسکراتے ہوئے کہا۔ "امی باہر گئی ہیں اور ابو تو ہفتے ہفتے ہی آتے ہیں، یہ لو۔" گوری نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔" سمیر، شلپا کے بارے میں پوچھنے کے لیے بہانے بنا رہا تھا۔

"لیکن تم تو بہت بدل گئے ہو سمیر۔ ماڈلنگ کی تیاری کر رہے ہو کیا۔" گوری نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سمیر کے ڈیل ڈول اور خوب صورتی کو سراہتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ کہاں ماڈلنگ! انسان تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ۔" سمیر نے کہا۔

"سچ، لیکن اگر کوئی اب تک بھی نہیں بدلا ہو تو؟" گوری کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ تیر گئی۔

"کیا مطلب؟" سمیر سچ مچ کچھ نہیں سمجھا تھا۔

"ایک منٹ۔" کہہ کر ہنستے ہوئے گوری اندر گئی اور دروازے کے پیچھے کھڑی شلپا کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچنے لگی۔ شلپا شرم سے مری جا رہی تھی۔

"ارے چھوڑو۔ پلیز چھوڑ دو نا۔" مگر گوری پر شلپا کی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ زبردستی کھینچ تان کر وہ شلپا کو ڈرائنگ روم میں سمیر کے سامنے لے آئی۔ شلپا کی تو جیسے دل کی دھڑکن ہی تھم گئی۔ پہلی ہی نظر میں سمیر نے شلپا کو پہچان لیا۔ سیاہ لانبے کھلے ہوئے بالوں میں اس کا چہرہ بادلوں کی آڑ میں چھپے ہوئے چاند کی خوب صورتی کو مات دے رہا تھا۔

جیسے تیسے خود کو چھڑا کر شلپا واپس اندر بھاگ گئی۔

"پہچانا اس کو؟" گوری نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ شلپا تھی نا۔'' سمیر نے جواب دینے کے ساتھ ہی اس سے تصدیق بھی کروانی چاہی۔

''ہاں! باہر آؤ نا شلپا۔ یہ کیا بچپنا ہے۔'' گوری نے اس کو بلاتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ۔ ذرا یہاں آنا گوری۔''

شلپا کے پاس جاتے ہی گوری نے اس کو ہلکے سے ڈانٹا۔ ''کیا ہے یہ، کیا سمجھے گا وہ۔ اب تم کوئی بچی نہیں ہو۔ چلو۔''

''بچی نہیں ہوں تبھی تو۔'' شلپا بڑبڑائی۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا۔ آؤ۔''

گوری نے شلپا کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ شلپا کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ وہ آ کر بیٹھ تو گئی تھی لیکن سمیر سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

''نمستے۔'' سمیر نے ہی اس کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا۔

''نمستے۔'' بولتے ہوئے شلپا نے اپنی پلکوں کو اٹھانے کی کوشش کی مگر سمیر سے نظریں ملتے ہی حیا کے بوجھ سے واپس جھک گئیں۔ ''کیسے ہو سمیر؟''

''نظریں اٹھا کر خود ہی دیکھ لو نا کہ میں کیسا ہوں۔ ہاہاہا۔'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں ایک منٹ میں آئی۔'' یہ کہہ کر گوری کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم تو ایک دم بدل گئی ہو شلپا۔ یہ سب کیسے ہوا؟'' سمیر نے گوری کے جاتے ہی اسے چھیڑا۔

شلپا کو محسوس ہوا کہ سمیر اس کے جسمانی نشیب و فراز کی بات کر رہا ہے شاید۔ وہ یہ بات سن کر مزید سکڑ گئی۔

''اور سناؤ کیا کرتے ہو آج کل۔ کافی اسمارٹ ہو گئے ہو۔ پہلے جیسے نہیں رہے۔ جھینپو۔'' کہتے ہی شلپا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کی جھجک ختم ہو رہی تھی۔

''تم بھی تو شادی کے لائق ہو گئی ہو۔ کوئی لڑکا دیکھا ہے کیا؟'' سمیر کی اس بات نے اس کے جذبات کو جھنجھنا دیا۔ وہ بھڑکنا چاہتی تھی مگر بھڑک نہیں پائی۔ پہلے بھی سمیر اکثر یہی مذاق اس کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ مگر ان دنوں تو وہ یہ بات کہتے ہی رفو چکر ہو جاتا تھا۔ ورنہ اسے پتا تھا کہ شلپا رو رو کر سارے محلے کو اکٹھا کر لے گی۔

''تم بالکل ویسے ہی ہو۔'' شلپا نے روٹھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنے رسیلے ہونٹوں کو باہر نکال لیا۔ مگر مسکراہٹ کو اپنے چہرے سے نہیں ہٹا پائی۔ اور نہ ہی نظریں اٹھا پائی۔

''مگر تم اب ویسی نہیں رہیں شلپا۔ تم تو اب شرمانے لگی ہو۔ اب تو جھگڑا کرنا بھی بند کر دیا ہے شاید۔ ورنہ اس بات پر تو میرے اوپر چڑھ کر بالوں کو نوچنے لگتی تھیں تم۔'' سمیر نے ہلکی مسکان کے ساتھ کہا۔

اب شلپا کیا کہتی۔ اوپر تو وہ اب بھی چڑھنا چاہتی تھی مگر بدن پر جوانی کا چڑھتا ہوا وزن اس کو آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

''کتنے دن ہو ابھی یہاں پر؟''

''پتا نہیں۔ سوچ کر تو ہفتے بھر کا آیا تھا۔ دیکھتے ہیں۔'' سمیر نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ گوری اپنی امی کے ساتھ اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ جبکہ یہ دونوں پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے نزدیک ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور انہیں اپنی اس کوشش پر یکدم روک لگانی پڑی۔

''جیتے رہو بیٹا!'' سمیر نے کھڑے ہو کر ادب و احترام سے کہا۔

''نمستے بیٹا۔ بڑے دنوں بعد یاد آیا اپنا شہر۔ ارے کچھ کھانے پینے کو بھی دیا ہے کہ نہیں تم لوگوں نے۔'' چاچی نے پوچھا۔

''وہ۔ میں۔ ٹھنڈا لینے ہی گئی تھی امی! ابھی دیتی ہوں۔''

☆☆☆

امان کی کوٹھی پر اوپر بیڈروم میں بیٹھی نندنی امان کو اندر آتے دیکھ کر چونک گئی اور کھڑی ہو کر ایک کونے میں جا سمٹی۔

''کیا ہوا نندنی۔ میری جان۔ تمہیں مجھ سے کیا ناراضگی ہے؟'' امان کی آواز میں ہلکا سا نشہ چھلک رہا تھا۔ بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے انگلی کے اشارے سے نندنی کو اپنے پاس بلایا۔

''لیکن...... لیکن تم نے کہا تھا کہ تم میرے پاس نہیں آؤ گے۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔'' نندنی نظریں جھکائے کونے میں ہی کھڑی رہی۔

''چھوڑو نا یہ وعدے قسمیں۔ آؤ نا۔ پیار کرتے ہیں۔'' امان اب بستر پر پھیل چکا تھا۔

''نہیں۔ مجھے نہیں کرنا پیار۔ تم پلیز جاؤ یہاں سے۔'' نندنی نے ہاتھ جوڑ لیے۔

''کمال ہے یار۔ پیار نہیں کرنا ہے تو رات کو چھپ کر گھر سے آنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔ وہیں سو جاتیں آرام سے۔ بولو۔''

اس بات کا نندنی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ کوشل کہاں ہے۔ اس کو بلا دو پلیز ایک بار۔'' نندنی لاچار سی وہاں کھڑی تھی۔

''کوشل رویندر کے ساتھ عیش کر رہی ہے۔ اس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ وہ تم کو لانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے بھی تمہیں نہیں بلایا تھا مگر تم خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہو۔''

نندنی کونے میں اور زیادہ دبک گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امان اسے ہاتھ بھی لگائے۔

''ہاں۔ مگر میں نے بول دیا تھا کہ تم میرے پاس

نہیں آؤ گے۔ پوچھ لو اس سے۔"

"اب یہ تو حد ہوئی یار۔ میں تمہارے پاس آتا بھی نہیں۔ مگر وہ کوشل نے بولا تھا کہ تم مجھ سے سمجھ رہی ہو نا' ایک بات بتاؤ۔ آج تک میں نے تمہیں ہاتھ لگایا ہے۔"

نندنی نے اپنا سر انکار میں ہلا دیا۔

"میں نے آج تک کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔ حالانکہ مجھے تم پہلے دن سے ہی پیاری لگتی ہو۔ مگر تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف کبھی چھوا بھی نہیں میں نے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کوشل سے دوستی بھی تمہاری ہی وجہ سے کی تھی۔ تاکہ تمہیں حاصل کر سکوں۔ مگر دیکھ لو۔ آج چھ مہینے ہونے کو آرہے ہیں۔ تم یہاں تین چار بار آچکی ہو۔ تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی اور میں نے تمہاری اس مرضی کا احترام کیا۔ ہے کہ نہیں۔" امان اب اس کے ٹھیک سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آں...... ہاں۔" نندنی سٹپٹا کر بولی۔

"پتا ہے کیوں؟" امان نے پھر سوال کیا۔

نندنی نے نظریں اٹھا کر جھکا لیں اور امان سے پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی' مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیونکہ تمہارا نام مجھے کسی کی یاد دلاتا ہے۔ جو میرے دل میں اتر گئی تھی۔ ہم جدا ہو گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے۔ میں ایک بار نندنی کو پانا چاہتا ہوں۔ مگر زبردستی نہیں۔" امان نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وضاحت کی۔

"مگر...... مگر میں تمہاری نندنی نہیں ہوں۔ صرف نام ایک ہونے سے کیا ہوتا ہے؟" نندنی بولی۔

نندنی گھومی تو اس کو امان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے نظر آئے۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ صرف نام ایک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مگر کچھ نہ ملنے سے' کچھ مل ہی جائے تو بہتر ہے' اور تمہارا نام ہی نہیں ملتا اس سے' تمہاری آنکھیں بھی ملتی ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں جو کشش ہے وہ بہت پہلے میں نے نندنی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ تمہاری آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسے کبھی اس کی آنکھیں کھینچتی تھیں' میں آج بھی اس پل کے لیے خود کو کوستا ہوں جب وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی اور اس نے مجھے اشارے بھی کیے۔ لیکن میں ان اشاروں کو سمجھ نہیں پایا' اس کو کبھی چھو نہیں پایا مگر ایک بار مجھے نندنی کو چھو کر دیکھ لینے دو پلیز۔ دوبارہ کبھی نہیں بلاؤں گا۔"

امان نے نندنی کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا اور نندنی کے بدن میں عجیب سی کھلبلی مچ گئی۔ مگر وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

"اب تو چھو لیا نا۔ اب تو چھوڑ دو مجھے۔ میں اور آگے نہیں بڑھنا چاہتی۔ چھوڑ دو مجھے۔" وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے کوشش کرنے لگی۔ اور اپنے ہاتھوں سے امان کو پیچھے دھکیلنے لگی۔

نشے کا سرور تو تھا ہی' نندنی کی اس حرکت نے امان کو بھڑکا دیا۔

"تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے لڑکی۔ میں چھ مہینے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم نخرے کرتی جا رہی ہو۔ رویندر کے ساتھ تو تم پہلی ہی ملاقات میں ساری حدیں پار کر گئی تھیں۔ کوشل سب بتا چکی ہے مجھے۔ میرے ساتھ کیا دشمنی ہے تمہیں۔" امان نے اس کی کمر پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"مم مجھے نہیں پتا۔ مگر میں تم سے پیار نہیں کر سکتی۔ امان تم بہت اچھے ہو۔ لیکن سمجھنے کی کوشش کرو۔" نندنی نے اس کو پیار سے منانے کی کوشش کی۔

لیکن نشہ امان کے دماغ پر پوری طرح حاوی

ہو چکا تھا اور کمرے میں طوفان بکھرتا چلا گیا۔

......☆☆☆......

جب امان کمرے سے باہر نکلا تو رویندر اور کوشل بالکنی میں کھڑے ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ امان کو دیکھتے ہی کوشل اس کی طرف لپکی لیکن امان کے چہرے پر شکن دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا؟ بات آج بھی نہیں بنی کیا۔"

امان نے اسے خود سے دور کرتے ہوئے کہا "جاؤ سنبھال لو اس کو۔ اور آئندہ میرا نام اور نمبر دونوں بھول جانا۔"

کوشل اس کی بات سن کر چونک پڑی۔

"مگر ہوا کیا...... میں تو کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ ایک بار زبردستی کر لو۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ میں بتاتی ہوں اس کو۔" کوشل نے امان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"سب ہو گیا ہے۔ اب وہ بیٹھی رو رہی ہے۔ جاؤ اس کو سنبھال لو اور لے آؤ اپنے ساتھ۔ میں تم لوگوں کو چھوڑ آتا ہوں۔ پھر سونا بھی ہے۔" امان نے کہتے ہوئے کوشل سے منہ پھیر لیا۔

کوشل امان کے پاس ہی کھڑی رہی۔ مگر نندنی کے رونے کا سن کر رویندر بنا کچھ کہے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ نندنی بستر پر گھٹنوں میں سر دیئے سبک رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" رویندر بس یونہی اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

نندنی نے اس کی آواز سنتے ہی اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس نے رویندر کی آنکھوں میں دیکھا اور اچانک اس کا سبکنا بلکنے میں بدل گیا۔ چھوٹے بچے کی طرح رویندر کے سینے سے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔

رویندر کا دل تڑپ اٹھا۔ "اگر تمہیں یہ سب پسند نہیں تھا تو تمہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

اس بات کا نندنی پر الٹا اثر ہوا۔ کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ یہاں آئی کیوں تھی۔ نندنی نے اپنے دونوں ہاتھ رویندر کے کندھے پر ٹکا دیئے۔ وہ اب بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ تبھی کوشل کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ڈرامے بازی ہے نندنی۔ یہ سب کیا ہے۔ چلو اٹھو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

نندنی نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ رویندر اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"چلو بھی اب۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں' کل تو اپنے آپ ہی بیچ میں کود پڑی تھیں اور آج ایسے رو رہی ہو۔ امان نے کہہ دیا ہے کہ وہ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔ سوری بھی بول رہا ہے۔"

کوشل نے باتوں کے دوران اس کو اٹھایا اور نیچے گاڑی میں انتظار کرتے ہوئے امان کے پاس لے گئی۔ رویندر شاید اپنے کمرے میں جا کر لیٹ چکا تھا۔

......☆☆☆......

اگلی دوپہر ساڑھے بارہ بجے کے قریب عمر کوٹ سے گزرتی ہائی وے پر روہن اور سمیر دونوں پرکاش کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ پرکاش کی کار کو روہن نے دور سے ہی پہچان لیا اور سمیر کی کار سے اتر کر اس کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پرکاش نے کار روک دی۔ روہن نے پرکاش سے ہاتھ ملایا اور ساتھ بیٹھی شروتی کو بے دلی سے وش کرتا ہوا پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔

"اگلی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنا بھائی۔" روہن نے پرکاش کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

"تو...... آپ کا کہنا یہ ہے کہ میرے خواب کی وجہ آپ ہی ہیں۔" روہن نے شروتی سے پوچھا۔ وہ

اور شروتی امان کے ڈرائنگ روم میں اکیلے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پرکاش رویندر کو لے کر جان بوجھ کے باہر نکل گیا تھا تاکہ شروتی بھولے بھالے روہن کو آسانی سے اس کی جانب سے رٹائی ہوئی باتیں بول سکے۔ رویندر' پرکاش کے پلان میں اڑنگا ڈال سکتا تھا۔ لیکن وہ کچھ سوچ کر خاموش رہا۔

شروتی روہن کے سوال پر کچھ دیر چپ سادھے رہی۔ پھر پہلے ہاں میں سر ہلایا اور نظریں اٹھا کر بولی۔ "ہاں۔"

شروتی کی شکل وصورت اتنی پیاری اور معصوم تھی کہ اگر روہن نے نیرو کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید وہ اس کے اسی جواب کو آخری جواب مان لیتا۔ مگر اب اس کے پاس پوچھنے کے لیے اور بھی بہت ساری باتیں تھیں۔

"مگر کیوں؟ میرا مطلب ہے کہ میں نے تمہیں پہلی بار تمہارے گھر ہی دیکھا تھا۔ اور شاید تم نے بھی۔ پھر ایسا کیوں کر رہی ہو۔ اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی زندہ لڑکی کسی کے خواب میں آ کر جو کہنا چاہتی ہے وہ کہہ سکے۔ اس کو اپنے پاس بلانے کے لیے بہانے کر سکے۔ پلیز مجھے ساری بات تفصیل سے سمجھاؤ۔ میں بہت کنفیوز ہوں۔"

بولنے کے لیے منہ کھولتے ہوئے شروتی کے چہرے پر شکن ابھر آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب جو کچھ بھی وہ بولے گی' جھوٹ بولے گی۔ پرکاش کے کہنے کے مطابق کہے گی۔ جو کچھ اس نے یاد کر رکھا تھا ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ بنا رکے۔

"دراصل جو کچھ بھی ہوا ہے۔ وہ آدھا میں نے کیا ہے اور آدھا قدرت کی طرف سے ہوا۔ پہلے میرے خوابوں میں تم دکھائی دینے لگے تھے۔ میں بے چین رہنے لگی۔ تم بھی اکثر وہی باتیں کہا کرتے تھے جو میں نے تمہارے سپنے میں کہی۔ یہ سلسلہ جب مہینوں تک چلتا رہا تو ہار کر میں اپنے گاؤں کے قریب ایک عامل کے پاس گئی' ان خوابوں کی وجہ جاننے کے لیے' اس نے مجھے بتایا کہ ہمارا پچھلے جنموں کا کوئی تعلق ہے۔ اور اسی لیے مجھے ایسے خواب آتے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ وہ اکیس دن کا چلہ کاٹ کر ہماری روحوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں تاکہ پھر کبھی مجھے ایسے خواب نہ آئیں۔" کہتے ہوئے شروتی اچانک چپ ہوگئی۔ پرکاش نے اس کو ایسا ہی کہنے کو بولا تھا۔

"پھر۔" روہن بڑی دلچسپی سے اس کے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین کرتا ہوا سن رہا تھا۔ شروتی کے رکتے ہی وہ بے چین ہوگیا۔ "آگے بتاؤ نا۔"

"انہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے دور کرنے کا اطمینان دلایا تھا' لیکن۔" شروتی پھر چپ ہوگئی۔ لیکن اس بار پرکاش کی مرضی کے مطابق نہیں۔ مگر جو اس کو بولنے کے لیے کہا گیا تھا۔ شروتی اس کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

"لیکن کیا؟" روہن جلدی سے بول پڑا۔

"لیکن۔ تب تک مجھے تم سے پیار ہوگیا تھا۔ رات کو ہی نہیں۔ میں دن میں بھی تمہارے سپنے دیکھنے لگی تھی۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب ایسا ہوا۔ پھر جب عامل نے تمہیں میری زندگی سے نکال دینے کی بات کہی تو میں نے منع کر دیا۔" شروتی بولتے بولتے پھر رک گئی۔

"تم بیچ بیچ میں رک کیوں رہی ہو۔ ساری بات بتاؤ نا۔ آگے کیا ہوا۔" روہن خود ایسے سپنے دیکھ چکا تھا اس لیے شروتی کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔

"میں نے عامل کو بتایا کہ میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ اور اگر ہمارا پچھلے جنموں کا کوئی تعلق

ہے تو ہم اس جنم میں کیوں نہیں مل سکتے؟ انہوں نے کہا مل سکتے ہو۔ میں نے ذریعہ پوچھا تو انہوں نے ایک ہی راستہ بتایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے خواب میں آپ کے پاس بھیج سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں جو چاہوں سپنے میں کہہ سکتی ہوں۔ باقی آپ پر منحصر تھا کہ آپ ان خوابوں کو کیا سمجھتے ہیں۔ پھر میرے کہنے پر انہوں نے عمل شروع کر دیا اور میں آپ کے خوابوں میں آنے لگی۔" شروتی کی آنکھوں سے آنسو لڑھک گئے۔ روہن کے پیار میں نہیں۔ ایک نہایت ہی شریف لڑکے کے سامنے جھوٹ پر جھوٹ بولنے پر۔

"اوہ۔ آپ ایسے کیوں رو رہی ہیں؟" روہن نے اس کے رونے کو اس کے بے انتہا پیار کا جذبہ سمجھا۔ سچ میں۔ روہن کا دل پگھل رہا تھا اس کی باتیں سن کر۔ شروتی نے رومال نکالا اور اپنے آنسوؤں کو پونچھ لیا۔ مگر پہلے بہے ہوئے آنسو ابھی خشک بھی نہیں ہوئے تھے کہ شروتی اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

روہن اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا سمجھانے لگا۔

"پلیز آپ روئیے مت۔ میں آپ کی حالت سمجھ سکتا ہوں۔ دراصل میں بھی پیار کا مطلب کچھ دن پہلے ہی سمجھا ہوں۔ نیرو۔ سوری...... تمہارے سپنے میں آنے کے بعد۔ آپ روئیے مت۔ پلیز۔ میرا دل بھی دکھ رہا ہے آپ کو روتے دیکھ کر۔"

کتنا فرق تھا روہن اور پرکاش میں۔ ایک وہ تھا انسان کی کھال میں چھپا ہوا بھیڑیا' جس کے لیے نہ تو دوستی کچھ معنی رکھتی تھی اور نہ جذبات کی کوئی قدر تھی۔ دوسری طرف روہن' انسان کے روپ میں فرشتہ۔ کتنی شرافت اور انسانیت بھری ہوئی تھی اس کے دل میں۔ یہ سب سوچتے ہوئے شروتی نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر سر روہن کے کندھے سے ٹکا دیا۔ آنکھیں یونہی رس رہی تھیں۔ روہن نے اس کے ہاتھ سے رومال لیا اور اس کے گالوں پر آنسوؤں سے بنی لکیروں کو صاف کرنے لگا۔ شروتی کو اس کی نظروں میں ہوس کا ایک قطرہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس کے دل میں تو صرف پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ شروتی کا رونا بند ہوتا گیا اور وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شروتی کو سنبھلتے دیکھ کر روہن کچھ الجھے ہوئے سوالوں کے جواب جاننے کے لیے بے تاب ہوا۔

"اگر آپ کچھ بہتر محسوس کر رہی ہیں تو ایک بات پوچھوں۔"

شروتی اس کو سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی تھی۔ مگر اس کا مطلب صرف اور صرف اس کی اپنی زندگی کی بربادی ہی ہوتا۔ اس نے پوچھے جانے والے سوالوں کے لیے خود کو تیار کیا اور روہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"آپ نے مجھے ٹیلے پر کیوں بلایا؟ گھر کیوں نہیں؟" روہن اٹھ کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"وہ مجھے اس عامل نے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ دراصل عمل وہیں ہو رہا تھا اور عمل کامیاب کرنے کے لیے ایک بار آپ کا آنا ضروری تھا۔ اس لیے انہوں نے آپ کو وہاں بلایا تھا۔" اس سوال کا جواب شروتی پہلے ہی یاد کیے ہوئے تھی۔ اس لیے بولتے ہوئے وہ کہیں نہیں جھجکی۔

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے جب ہم وہاں گئے تھے تو اور کوئی بھی وہاں تھا۔ گاڑی کی ہوا بھی اسی نے نکالی ہوگی۔ کیا نام ہے اس عامل کا۔" روہن نے

یونہی پوچھ لیا۔

"پتا نہیں۔ لوگ ان کو ملنگ بابا کہتے ہیں۔" شروتی نے پہلے سے ہی یاد کیا ہوا نام بھی بتا دیا۔

"ایک بات میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی۔ جب آپ ہی میرے خوابوں میں آتی تھیں اور آپ ہی مجھے بلانا چاہتی تھیں تو یہ نیرو نام کا کیا چکر ہے؟" روہن کو یہ سوال سب سے اہم محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ بابا نے ہی مجھے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ دراصل انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرا نام پچھلے جنم میں نیرو تھا۔ اس نام کی وجہ سے آپ نہ چاہتے ہوئے بھی کھچے چلے آئیں گے۔ اس لیے۔"

"پھر اپنے سپنے میں یہ کیوں کہا کہ میں نیرو نہیں ہوں۔ نیرو تو عمر کوٹ میں رہتی ہے۔"

ایک اور سوال شروتی کے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ کمال کی تیاری کر رکھی تھی پرکاش نے اپنے شیطانی تیز دماغ کا استعمال کرتے ہوئے اس نے چھوٹی سے چھوٹی بات پر غور کیا تھا۔

شروتی کے پاس ہر سوال کا جواب پہلے ہی سے تیار رکھا ہوا تھا۔ "ایسا بھی میں نے ملنگ بابا کے کہنے پر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ عمل کے دوران مجھے آپ کے پاس نہیں جانا ہے۔ آپ کو چھونا نہیں ہے۔ اس لیے۔ اس لیے اس دن میں نے آپ کو دیکھا تک نہیں۔ سر جھکائے رہی ہر وقت۔ اور رات کو سپنے میں کہیں آپ مجھے چھو نہ لیں۔ اس لیے ایسا کیا۔"

"اوہ۔ مگر یہاں بھی مجھے نیرو مل گئی ہے۔ بالکل جیسا تم نے سپنے میں بتایا تھا۔ اور سپنے میں جس گھر کے باہر آپ مجھے کھڑی دکھائی دیتی تھیں بالکل ویسا ہی گھر ہے ان کا۔ میں تو حیران ہو گیا تھا دیکھ کر۔ آپ کی بات پر مجھے پورا یقین ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ یہ اتفاق کیسا ہے۔ یا اس کے پیچھے بھی ملنگ بابا کا ہی ہاتھ ہے؟" روہن کے دماغ میں اب بھی سوالوں کا ایک بھنور اتھل پتھل مچائے ہوئے تھا۔

روہن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شروتی بولنا شروع ہو گئی تھی۔ پرکاش کو یقین تھا کہ یہ سوال بھی ضرور پوچھا جائے گا۔

"ہاں۔ انہوں نے ہی اپنے عمل کی طاقت سے کسی نیرو کا پتا لگایا تھا۔ عمل کی کامیابی کے لیے مجھے پچھلے جنم کے نام کا استعمال کرنا ضروری تھا اور میری کی ہوئی بات عمل کی کارروائی کے مطابق سچ ہونا بھی لازمی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی طاقت سے یہاں والی نیرو کا پتا لگایا اور مجھے سپنے میں اسی جگہ کے بارے میں بتانے کا کہا۔"

"ہوں۔" شروتی کے آخری جواب کا مطلب روہن سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر کیونکہ وہ اس کی کسی بات پر شک نہیں کر رہا تھا اس لیے اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ عمر کوٹ کی نیرو اس کے دماغ سے پوری طرح نکل چکی تھی۔

"اب تو خوابوں میں آ کر مجھے نہیں ڈراؤ گی نا۔" روہن اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بیچاری شروتی روہن کی مسکراہٹ کا جواب بھی اپنی مرضی سے نہیں دے پائی۔

"بابا نے کہا ہے کہ جب تک ہم شادی نہیں کر لیتے آپ کو ایسے ہی سپنے آتے رہیں گے۔ میں یونہی آپ کو ٹیلے پر بلاتی رہوں گی۔ اور یونہی کہتی رہوں گی کہ میں عمر کوٹ میں ہوں۔ میں شروتی نہیں ہوں۔ نیرو ہوں۔"

"لیکن ایسا کیوں؟" روہن نے حیرت سے پوچھا۔

یہاں شروتی ہڑبڑا گئی۔ یہ پہلا ایسا سوال تھا جو کہ اس کے سامنے پہلے نہیں آیا تھا۔ مگر جلد ہی وہ سنبھلتے

ہوئے بولی۔

"ہوں...... پتا نہیں۔ شاید عمل کا اثر تبھی تک رہے گا جب تک ہم مل نہیں جاتے۔ وہ۔ میں تھوڑی دیر آرام کر لوں کیا؟ مجھے تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔" شروتی نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔

"اوہ ہاں۔ کیوں نہیں۔ مجھے آپ سے ایک دم اتنے سوال نہیں کرنے چاہئے تھے۔ نیچے تین بیڈ روم ہیں۔ پہلے والے کو چھوڑ کر آپ کہیں بھی جا کر آرام کر لیں۔ تب تک میں کھانے کا بندوبست کرواتا ہوں۔"

"تھینکس۔" شروتی تھکے ہوئے قدموں سے اٹھی اور گیلری کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک پیچھے سے اس کو روہن کی آواز سنائی دی۔

"شروتی۔"

"ہاں؟" شروتی ایک دم پلٹ گئی۔

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔ ایک بار اور تمہارا چہرہ دیکھنے کا دل کر رہا تھا۔" روہن کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

شروتی نے اپنی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا اور مڑ کر اندر چلی گئی۔

......☆☆☆......

رات کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ سبھی کو اپنے اپنے کمروں میں گئے آدھے گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا۔ بستر پر لیٹی ہوئی شروتی کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ روہن کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ دوپہر میں بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے روہن کا اس کو روکنا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنا کہ ایک بار اور تمہارا چہرہ دیکھنے کو دل کر رہا تھا۔ یہ سب باتیں اس کے دل کو چھو رہی تھیں۔ یقیناً ایک بات تو طے ہو ہی چکی تھی۔ روہن ایک سچا پیار کرنے والا تھا۔ پرکاش کی طرح اس میں چھل کپٹ یا کسی طرح کا لالچ نہیں تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ روہن اس کے دل میں اتر چکا ہے۔ نہ اترنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔ روہن جیسا شوہر تو قسمت والیوں کو ہی ملتا ہے۔ کروٹ لیتے ہوئے شروتی تڑپ اٹھی۔ جب اس کو خیال آیا کہ روہن کے لیے اس کا پیار صرف ایک فریب ہے، دھوکہ ہے۔ وہ تو پرکاش کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن چکی ہے اور شاید زندگی بھر اس سے نجات نہیں پا سکے گی۔ روہن کے ساتھ شادی تو اس کی خوش قسمتی ہی ہوگی۔ لیکن آگے کیا ہوگا؟

شروتی نے گہری سانس لی۔ اچانک ہی اس کا فون بج اٹھا جو آج ہی پرکاش نے اس کو خرید کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کی کال ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے پرس میں سے فون نکال کر کان سے لگایا۔ "ہیلو۔"

"سو تو نہیں گئی ہو نا جان من۔" فون پر پرکاش کی آواز ابھری۔

"ہاں۔ سو ہی رہی تھی۔ فون کی بیل پر اٹھی ہوں۔" شروتی نے جان بوجھ کر نیند میں ہونے کا ناٹک کیا۔

"یہ سونے کے دن نہیں ہیں ایڈیٹ۔ کچھ کرنے کے دن ہیں۔ پھر تو ساری عمر ہی چین سے سونا ہے۔ جلدی میرے کمرے میں آؤ۔" پرکاش نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"مگر اس وقت۔ یہاں۔" شروتی بوکھلا گئی۔

"تم اگر مگر بہت کرتی ہو۔ چپ چاپ باہر نکل کر بیچ والے کمرے میں آ جاؤ۔ سب سو چکے ہیں۔" کہتے ہی پرکاش نے فون کاٹ دیا۔

اپنے غصے کو فون پٹک کر اتارنے کی کوشش کرتی ہوئی شروتی اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے کپڑوں اور بالوں کو درست کرنے کے بعد باہر نکل آئی۔

......☆☆☆......

”آؤ میری جان۔ دروازہ بند کرلو۔“ پرکاش بستر پر نیم دراز تھا۔

”مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”یہ بتاؤ تم نے سب باتیں ٹھیک سے بتادیں نا روہن کو۔“ پرکاش نے پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ تم یہ کوشش چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے۔“ شروتی نے جھوٹے کے سامنے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

”مگر میرے سامنے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی اس نے۔ اس بارے میں کوئی ذکر تک نہیں کیا۔ نا ہی کوئی اور سوال پوچھا۔ تم یہ کیسے کہہ رہی ہو کہ اس کو یقین نہیں ہوا۔“ پرکاش نے حیرت سے کہا۔

”ہوسکتا ہے اسے تم پر بھی شک ہو گیا ہو۔ اس لیے تم سے نہ کہا ہو لیکن اس نے بہت سے ایسے سوال کیے تھے جن کا جواب میں دے نہیں پائی اور تم بھی نہیں دے سکو گے۔ آخر میں دیکھ لینا۔ نہ تم کہیں کے رہو گے اور نہ ہی میں...... پلیز...... یہ ناٹک بند کردو۔ ابھی تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم مذاق کر رہے تھے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی جھوٹ کی دلدل میں مت گھسیٹو۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ میری عزت سے تم کھیل ہی چکے ہو۔ کیوں مجھے جان دینے پر مجبور کر رہے ہو۔“ شروتی ایک سانس میں بولتی ہی چلی گئی۔

”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ وہ باتوں کو پرکھ کر دیکھنے کے نظریئے سے نہیں سنتا' وہ سب کو اپنے جیسا ہی شریف سمجھتا ہے۔ ویسے ایسا کون سا سوال کیا تھا اس نے جس کا جواب تم نہیں دے پائیں۔“ پرکاش اسے گھورتا ہوا بولا۔

”مجھے یاد نہیں ہے۔ پلیز مجھے واپس جانے دو۔ اپنے گھر۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ شروتی گڑگڑاتی ہوئی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور سسکنے لگی۔

”تم ایسے ہار مان گئیں تو میرا کیا ہوگا؟ بولو۔“ پرکاش نے اٹھ کر شروتی کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ شروتی پوری طرح ٹوٹ چکی تھی۔

”میں اپنی جان دے دوں گی۔“

”تمہارے اکیلے کے جان دینے سے میرا کام چل جاتا تو میں تمہیں پہلے ہی آتما ہتیا کا مشورہ دے دیتا' لیکن اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری مووی سب سے پہلے میں تمہارے ہی علاقے میں بھیجوں گا۔ سوچو تمہارے بابا پر کیا گزرے گی۔ وہ نہ جی پائیں گے نہ مر پائیں گے۔ ان کے بارے میں بھی تو کچھ سوچو۔“ پرکاش کے چہرے پر گھناؤنی مسکراہٹ ابھر آئی۔

شروتی بلبلا اٹھی۔ ”بابا کے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ میں کرتو رہی ہوں سب کچھ۔“

”شاباش...... اسی حوصلے سے کام کرو گی۔ تبھی بات بنے گی۔“ پرکاش الماری کے پاس گیا اور واپس مڑتے ہوئے بولا۔ ”لو۔ یہ پہن لو۔“ کہتے ہوئے اس نے گہرے نیلے رنگ کی ایک جھلنگا سی نائٹی شروتی کی طرف اچھال دی۔ نائٹی کا کپڑا بہت ہی ہلکا اور باریک تھا۔ اس کو دیکھتے ہی شروتی بلکتی ہوئی بولی۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم دوبارہ میرے ساتھ یہ سب نہیں کرو گے۔ کیوں مجھے زندہ لاش بنانے پر تلے ہوئے ہو۔“

”جب تک تم میرا کہا مانتی رہو گی میں اپنا وعدہ نہیں توڑوں گا۔ ہاں۔ تمہارے سوال اور شکایتیں اگر یونہی بڑھتی رہیں تو ایک بات بتا دیتا ہوں کہ وعدے میرے لیے کوئی خاص معنی نہیں رکھتے۔ میں کسی بھی وعدے کو توڑنے سے نہیں ہچکچاؤں گا۔ اگر تم نے میری ایک بات بھی ماننے سے انکار کیا تو...... جاؤ باتھ روم میں جا کر اسے پہن لو۔“ پرکاش نے کہا۔

آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر سمیٹے شروتی باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ باہر آئی تو اس کے حسن کا جلوہ بھرپور انداز سے باریک نائٹی سے جھلک رہا تھا۔

شرمندگی اور ذلت سے تار تار ہو چکی شروتی سر جھکائے بار بار نائٹی کو نیچے کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہائے اس جوانی پر کون نہ مر مٹے گا۔ میں تو پھانسی پر بھی چڑھنے کو تیار ہوں۔“ پرکاش نے وارفتگی سے کہا۔

”مجھے ہاتھ مت لگانا پلیز۔ میں پہلے ہی ٹوٹ چکی ہوں۔ مجھے مرنے پر مجبور مت کرو۔“ شروتی نے سسکتے ہوئے کہا۔

”میں تو مذاق میں کہہ رہا تھا۔ اب یہ رونا دھونا چھوڑو اور روہن کے کمرے میں جاؤ۔“ پرکاش نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا......! ایسے؟“ شروتی چونک پڑی اور حیرت سے پرکاش کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”ہاں...... ایسے ہی...... آؤ بیٹھو میرے پاس میں سمجھاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ آج میں نے تمہیں روہن کے لیے ہی تیار کیا ہے اب یہ مت کہنا کہ تم اس کے ساتھ بھی کچھ نہیں کرو گی۔ میں پہلے ہی بہت صبر کر چکا ہوں۔ اب زیادہ برداشت نہیں ہوگا مجھ سے اور دھیان رکھنا یہ ہمارے پلان کا سب سے ضروری حصہ ہے۔“ پرکاش اس کو ساری بات سمجھانے لگا۔ شروتی خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتی رہی اور کانپتے ہوئے قدموں سے باہر نکل کر روہن کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پرکاش دروازے پر کھڑا اس کی طرف ہی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ نظریں گھما کر وہ سیدھی چلتی ہوئی روہن کے بیڈروم کے دروازے پر پہنچی اور ہلکے سے دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے روہن کی آواز سنائی دی۔

”میں ہوں شروتی۔ پلیز دروازہ کھولو۔“ شروتی کے بولتے ہی پرکاش نے جھٹ سے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ روہن دروازہ کھولتے ہی شروتی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور وہ کسی نادیدہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

”کیا ہوا شروتی! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

بنا اجازت لیے ہی شروتی اندر گھسنے لگی تو روہن نے ایک طرف ہو کر اسے راستہ دے دیا۔ مگر جیسے ہی روہن نے لائٹ جلائی تو وہ دوسری بار چونکا۔

”یہ......؟“ روہن نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

شروتی کا پہناوا اور اس پہناوے میں اس کو اپنے پاس دیکھ کر روہن کا حیرت زدہ ہونا لازمی تھا۔ شروتی کا لباس پہننا اور نہ پہننا ایک برابر تھا۔

روہن نے کبھی شروتی کو اس طرح کی لڑکی نہیں سمجھا تھا۔ جبکہ شروتی اس کے سامنے پہلے ہی سر جھکائے کھڑی تھی۔ شرمندہ سا ہو کر روہن بھی زیادہ دیر تک اس کو نہیں دیکھ پایا۔

”کیا ہوا شروتی؟“ روہن اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتا ہوا بولا تم اس وقت یہاں؟“

”مجھے برے برے سپنے آ رہے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ شروتی نے جواب دیا۔

”اوہ۔ سپنوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑا پانی پی لو اور سو جاؤ۔“ میز پر رکھے جگ سے روہن نے گلاس میں پانی نکالا اور شروتی کی طرف بڑھا دیا۔

”مجھے سچ میں بہت ڈر لگ رہا ہے روہن میں...... کیا میں یہیں سو جاؤں؟“ شروتی نے تھرتھراتے لبوں سے بات پوری کی۔

"یہاں؟ کیا تمہیں ٹھیک لگتا ہے۔" روہن الماری میں کچھ ڈھونڈتا ہوا بولا۔

"مم...... مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے میں اکیلی نہیں سو سکتی۔" شروتی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ کیونکہ پرکاش نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ روہن کے کمرے میں نہ سوئی تو پھر اس کے ساتھ سونا پڑے گا۔

روہن نے الماری سے چادر نکالی اور شروتی کے پاس آ کر شروتی کے بدن کو چاروں طرف سے لپیٹ دیا۔

"آؤ۔ بیٹھو۔" روہن کے چادر لپیٹنے کی وجہ سوچ کر شروتی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ صاف ظاہر تھا کہ روہن کو اس کا یہ پہناوا ہرگز پسند نہیں آیا تھا۔ ٹیس بھری ایک سانس شروتی کے اندر سے باہر نکلی۔ کہاں روہن اور کہاں پرکاش۔ روہن کی اس ایک ادا نے شروتی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا دیوانہ بنا دیا۔ ہزاروں دعائیں دیتا ہوا شروتی کا دل اس پر نچھاور ہوا جا رہا تھا۔

پیر نیچے لٹکائے ہوئے ہی وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک کمرے میں چپ چھائی رہی۔ شروتی نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور اس کو فینسی لائٹ کے ساتھ جڑا کیمرہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کیمرہ بیڈ پر ہی فوکس کیا ہوا لگ رہا تھا۔ پرکاش نے اس کے بارے میں پہلے ہی بتاتے ہوئے روہن کے ساتھ سیکس نہ کرنے پر جو ہوتا اسے بھگتنے کی دھمکی دی تھی۔ شروتی کو اب روہن سے پیار کرنے میں کسی طرح کی کوئی دقت نہیں تھی۔

بلکہ اب تو وہ اس کا سپنا سا بن گیا تھا۔ اب روہن ہی اس کا پہلا اور آخری پیار تھا۔ مگر روہن کا رویہ ایسا تھا کہ شروتی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ شروعات کیسے کرے۔

"سو جاؤ۔" روہن نے کہا اور دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

"ایک منٹ۔" شروتی نے دیوار کے ساتھ لگتے ہوئے اپنی ٹانگیں سیدھی پھیلا لیں۔

"ہاں بولو۔" روہن دوسری طرف منہ کیے ہوئے ہی بولا۔

"میری طرف گھوم کر سو جاؤ نا پلیز۔" شروتی کے لہجے میں کھلی دعوت تھی۔

روہن نے جیسے ہی کروٹ بدلی شروتی کو عجیب سے انداز میں پایا۔

"شروتی۔ مجھے تمہاری یہ حرکت قطعی پسند نہیں ہے۔ میں نے تمہیں اچھی لڑکی سمجھا تھا۔ یہ سب بکواس بند کرو اب۔" روہن نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے پیار کر لو نا پلیز۔ میں تمہارے لیے تڑپ رہی ہوں۔ جانے کتنے دنوں سے۔" اپنے دل کو پتھر سا بناتے ہوئے شروتی نے یہ سب کہا اور روہن سے لپٹنے کے لیے اس کی طرف لپکی۔ روہن اس کی اس حرکت پر ہڑبڑا اٹھا۔ ہلکا دھکا دیتے ہوئے اس نے شروتی کو واپس پٹخ دیا۔

"پیار! تم جیسی لڑکیاں سمجھتی بھی ہیں کہ پیار آخر ہوتا کیا ہے۔ ہوس کے چند لمحوں کو تم پیار سمجھتی ہو اور دعویٰ کرتی ہو کہ ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ شرم آنی چاہیے تمہیں، پرکاش بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ تم باپ بیٹی کی سازش تھی۔ اپنے بدن کو مجھے سونپ کر تم یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ تم مجھے پیار کرتی ہو۔ ابھی کے ابھی نکل جاؤ یہاں سے۔" روہن کا چہرہ غصے سے تپ رہا تھا اور آنکھیں جیسے انگارے اگل رہی تھیں۔

شروتی کے پاس بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ جو تھا وہ بول نہیں سکتی تھی۔ شرم سے گردن جھک جانے پر بھی وہ ہاتھ جوڑ کر آنسو بہاتی ہوئی یہی بولے جا رہی تھی۔

"پلیز روہن۔ مجھ سے پیار کرو۔ یہاں سے مت نکالو مجھ سے پیار کرو۔"

روہن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا اور شروتی کا ہاتھ پکڑ کر لگ بھگ کھینچتے ہوئے وہ باہر لے گیا اور دھکا سا دیتے ہوئے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ ایک دو بار شروتی نے ہلکی سی دستک دی اور کراہتے ہوئے وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

روہن کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ اچانک اٹھا اور باہر نکل کر زبردستی شروتی کو اٹھا کر اس کے کمرے میں چھوڑ آیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ شروتی بیچاری بلکتی رہ گئی۔

کافی دیر تک شروتی یونہی آنسو بہاتی دیواروں کو گھورتی رہی۔ اس کے پاس اب اس کا کچھ نہیں بچا تھا۔ پیار ملا بھی تو آدھا ادھورا۔ اچانک وہ اپنے پرس میں سے کورا کاغذ اور ایک پین نکالنے لگی اور آنسوؤں سے کاغذ کو گیلا کرتے ہوئے اس پر کچھ لکھنے لگی۔

......☆☆☆......

اگلی صبح روہن ایک چیخ سن کر بستر سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا وہ چونک کر باہر نکلا۔ نوکر شروتی کے کمرے کے باہر کھڑا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔

"صاحب! میم صاحب۔" روہن بھاگتا ہوا اس طرف گیا۔

"کیا ہوا؟" اور اندر جھانکنے کے بعد اس کو دوبارہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شروتی کی لاش اندر پنکھے سے جھول رہی تھی۔ اگلے ہی پل روہن کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی ایک پل میں پچھلی رات اس کے اور شروتی کے بیچ میں جو کچھ بھی ہوا سب اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

شاید اس کے لیے روہن خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ جیسے تیسے اس نے دیوار پکڑی اور اپنے سر کو ہاتھوں میں دبوچ کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

پاس کھڑا نوکر حیرت سے کبھی شروتی اور کبھی روہن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ رویندر، امان اور سمیر نیچے سوئے ہوئے تھے۔ نوکر نے نیچے جا کر امان کو بتانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ پرکاش اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ روہن کو اس حالت میں بیٹھے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف آیا اور شروتی کے بیڈروم میں جھانکتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" پرکاش تقریباً بھاگتا ہوا بیڈ پر چڑھا اور شروتی کے بدن کو کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

"ادھر آؤ۔ میری مدد کرو۔ جلدی۔" اس نے نوکر کو آواز دی۔ دونوں نے مل کر شروتی کو نیچے اتارا۔

"شٹ۔ شی از نو مور۔" پرکاش نے شروتی کی سانسیں محسوس نہ ہونے پر کہا اور گھٹنا ٹیک کر لاش کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔

تب تک روہن بھی کمرے میں آ چکا تھا۔ اس نے پرکاش کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے ہی پرکاش اس کی طرف گھوما روہن اس سے لپٹ گیا۔

"بھائی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔" روہن کی بات سنتے ہی نوکر چونکا اور بنا دیر کیے وہ نیچے کی طرف کھسک لیا۔

"کیا مطلب؟ مطلب تم نے یہ سب...... مگر کیوں یار؟" پرکاش نے روہن کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

"ہاں بھائی۔ میں نے ہی اس کو مرنے کے لیے مجبور کر دیا۔" روہن آنسو بہاتے ہوئے بولے چلا جا رہا تھا۔

"رات کو یہ میرے کمرے میں آئی تھی۔ میں اس کی ملن کی بے قراری کو واسنا کی آگ سمجھ بیٹھا۔ یہ بچاری تو اپنے برسوں پرانے ادھورے پیار کو پورا کرنے آئی تھی اور میں نے اس کو جانے کیا کیا کہہ دیا' اس کو بے عزت کرکے اپنے کمرے سے نکال دیا۔" کہتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکی شروتی سے لپٹ گیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اپنے آپ کو سنبھالو یار۔ تم خود کو اس کے لیے الزام کیوں دے رہے ہو؟ تم نے اسے صرف کمرے سے ہی نکالا تھا۔ مرنے کے لیے تو نہیں بولا تھا نا۔" پرکاش نے روہن کو شروتی کے مردہ جسم سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر بھائی۔ یہ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہوگی۔ یہ کیا کرلیا اس نے۔ دیکھو تو آہ ہ ہ ہ۔" روہن کے بین کرنے کی آواز پوری کوٹھی میں گونجنے لگی۔ تبھی کمرے میں امان' سمیر اور رویندر داخل ہوئے۔ سب کو اس حادثے کی خبر ہوچکی تھی۔ سبھی آکر بستر کے پاس کھڑے ہوگئے۔

"یہ کیا ہوگیا یار۔ کیسے ہوا یہ سب؟" امان نے جھلاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مجھ سے پیار کرتی تھی بھائی۔" روہن نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ پرکاش اس کی آواز کو دبا کر خود سب کچھ بتانے لگا۔ رویندر غور سے پرکاش کے چہرے کی طرف دیکھتا جارہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" پوری بات سن کر امان اور سمیر کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ تو بہت برا ہوا' اب کیا کریں۔" امان شروتی کے بارے میں بات کررہا تھا۔

"اب کیا کرسکتے ہیں۔"

"اب تو اس کو گھر پہنچانے کی تیاری کرو۔" رویندر کے منہ سے نکلا۔

"نہیں' اسے گھر نہیں بھیج سکتے۔ یہ اپنے باپ سے جھوٹ بول کر آئی تھی کہ کالج کے ٹور پر جارہی ہے۔ اس کا کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔" پرکاش نے اپنی رائے دی۔

"نہیں' میں اسے اس کے گھر ضرور لے کر جاؤں گا۔ اسے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی چتا کو آگ لگاؤں گا۔ اب بھی کیا میں اس کے پیار کو نظر انداز کردوں۔" روہن نے روتے ہوئے کہا۔

"اب فلمی باتیں چھوڑو یار۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ پرکاش صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں اسے ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ ورنہ ہم سب پر مصیبت آسکتی ہے۔" رویندر نے روہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

روہن بلکتا ہوا دوبارہ شروتی سے لپٹ گیا۔

"نہیں' جو کچھ ہوگا میں بھگت لوں گا لیکن اسے اس کے گھر تک میں لے کر ہی جاؤں گا۔ میں اس کی روح کو دوبارہ سے نہیں بھٹکنے دوں گا۔"

"بہت خوب۔" دروازے پر سخت اور کھردری آواز سن کر سب ہی چونک کر پلٹے۔ پولیس انسپکٹر ایک سپاہی کے ساتھ دروازے پر کھڑا تھا۔ سب کے متوجہ ہونے پر وہ ٹہلتا ہوا اندر آیا اور کچھ دیر غور سے شروتی کی لاش کو دیکھتا رہا۔

"تو لڑکیوں کی روحوں سے کھیلتے ہیں آپ لوگ۔" انسپکٹر نے باری باری چاروں کو سرخ نظروں سے گھورا۔

"ایک منٹ سر۔ آپ میری بات سنیں۔" پرکاش نے کہا تو انسپکٹر نے اس کو اپنی انگلی سیدھی کرکے رکنے کا اشارہ کیا۔

"کافی دیر سے تم سب کی ہی سن رہا ہوں۔ نوکر کہاں ہے۔"

"ابھی بلاتا ہوں سر۔" امان یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور بالکنی میں کھڑے ہوکر آواز لگائی۔ اگلے ہی پل نوکر انسپکٹر کے سامنے تھا۔

"جی صاحب۔" نوکر کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ڈرومت راجو۔ سب کھل کر بتاؤ کہ یہاں پر کیا ہوا ہے۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا صاحب۔ میں رات سے نیچے تھا۔ سچ میں۔" نوکر نے بیچ بیچ میں گلا صاف کرکے بات پوری کی۔

"تو فون کیوں کیا تھا الو کی دم۔ میں کہہ رہا ہوں نا کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہاتھ سے اندر ہونے والے اپنی سزا پوری ہونے سے پہلے جیل سے باہر نہیں آتے اور اس وقت تک تو یہ چہرہ بھی بھول چکے ہوں گے تمہارا۔ رہی نوکری کی بات۔ تو تمہاری چوری کی عادت کے باوجود میں تمہیں پھر سے اپنے گھر رکھنے کے لیے تیار ہوں۔ اب سیدھے سیدھے ساری بات سمجھاؤ مجھے۔ ورنہ سب سے پہلے تمہاری ٹھکائی ہوگی۔" انسپکٹر نے دوٹوک بات کہی اور نوکر راجو کی گردن جھک گئی۔ اس نے تو انسپکٹر سے درخواست بھی کی تھی کہ میرا نام سامنے نہیں آنا چاہئے۔ لیکن انسپکٹر نے پولیس اور مخبر کے رشتے کو نہیں نبھایا۔

"آپ ہماری بات بھی سن لیں ایک بار۔ اس کو پوری بات کا پتا نہیں ہے۔" پرکاش نے پھر سے انسپکٹر کو ٹوکا۔ باقی چپ چاپ کھڑے نوکر اور انسپکٹر کو دیکھ رہے تھے۔

"سب کی سنی جائے گی۔ بولو راجو۔" انسپکٹر نے پرکاش کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے زیادہ نہیں پتا صاحب۔ صبح میں میم صاحب کو چائے دینے آیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو پتا لگا کہ وہ تو کھلا ہوا ہے۔ پھر بھی میں نے دو تین بار آواز دی۔ لیکن میم صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔" یہ کہہ کر راجو رک گیا۔

"پھر؟" انسپکٹر نے راجو کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

حرام مال کا اثر اولاد پر پڑتا ہے

ایک بہت بڑے عالم دین تھے۔ وہ نماز پڑھانے مسجد جاتے تو ساتھ اپنے چھ سالہ بیٹے کو بھی لے لیتے۔ ایک روز جماعت کھڑی ہوئی تو ایک ماشکی اپنی مشک برآمدے میں رکھ کر نماز میں شامل ہوگیا۔ نماز کے بعد عالم دین درس دینے لگے۔ ماشکی باہر گیا اور فوراً ہی اندر آگیا۔ اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ جناب آپ کے بیٹے نے میری مشک میں ببول کا کانٹا چبھو دیا۔ پانی بھی ضائع ہوا اور میری مشک بھی بے کار ہوگئی۔ عالم دین کو اس کی بات سن کر رونا آگیا۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے گھر آئے اور بیوی سے بولے۔ نیک بخت مجھ سے آج تک ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا۔ جس کا اثر بُرا ہو نہ حرام کھایا اور نہ حرام پہنا۔ چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے بھی اجتناب کیا۔ پھر میرے بیٹے کی فطرت میں نقصان پہنچانے کا خیال کیسے در آیا۔ ساری رات میاں بیوی سوچتے رہے۔ کافی غور وفکر کے بعد بیوی نے کہا۔ مجھے اپنا ایک گناہ یاد آرہا ہے جب یہ میرے شکم میں تھا۔ میں دھاگا مانگنے پڑوسی کے ہاں گئی۔ مجھے متلی سی آرہی تھی۔ میرے ہاتھ میں سوئی تھی۔ میں نے وہ سوئی پڑوسی کے آنگن میں لگے انار میں چبھودی اور اسے چاٹ لیا تاکہ منہ کا ذائقہ بدل جائے۔ شاید یہ اسی کا اثر ہے۔ بالکل درست' بغیر اجازت تم نے انار کا ذائقہ چکھا گویا چوری کی۔ چوری گناہ ہے اور گناہ کی سزا ملتی ہے۔ مال حرام کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ کیونکہ اولاد صرف جائیداد کی وارث نہیں بلکہ گناہوں کے بوجھ کی بھی وارث ہے۔ یہ کہہ کر عالم دین اپنے ربّ کے حضور گریہ وزاری کرنے لگے۔ دعا ہے اللہ پاک ہم سب کو رزق حلال عطا فرمائے (آمین)۔

(محمد ارشاد قریشی......اسلام آباد)

"پھر صاحب۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا تو۔" راجو نے یہ کہتے ہی اپنی انگلی شروتی کی لاش کی طرف اٹھادی۔

"مطلب یہ کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟" انسپکٹر نے راجو کو ریلیکس کرنے کے لیے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"جی صاحب۔" راجو نے نظریں اٹھا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ قتل بھی ہوسکتا ہے۔ ہوں۔" انسپکٹر نے شروتی کی لاش کے پاس بیٹھے روہن کو دیکھا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

"ایک منٹ سر! راجو تم نے دروازے کی کنڈی باہر سے کھولی تھی یا نہیں۔"

"نہیں صاحب! دروازہ تو پہلے ہی اندر اور باہر دونوں طرف سے کھلا ہوا تھا میرے کھٹکھٹاتے ہی کھل گیا تھا اپنے آپ۔" راجو نے بات انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہی۔

"یہ باہر سے کنڈی لگانے کا کیا معاملہ ہے۔ اسے زبردستی روک رکھا تھا کیا؟" انسپکٹر نے روہن کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری پوری بات تو سن لیں انسپکٹر صاحب۔ میں رات کو تقریباً ایک بجے کے قریب شروتی کو اس کمرے میں چھوڑ کر باہر سے کنڈی لگا کر آیا تھا۔ پھر کنڈی کس نے کھولی؟" روہن نے حیرت سے وہاں موجود بھی لوگوں کو دیکھا۔

"ہوں' اگر تمہاری بات سچ ہے تو یہ ایک بہت بڑا پوائنٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اس کو قید کرنے اور نوکر کے آنے کے بیچ کوئی اور لاش کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ یا ہوسکتا ہے کہ اسی نے اس کا خون بھی کیا ہو۔ تم سب کے علاوہ اگر گھر میں کوئی اور بھی ہے تو اس کو بھی بلا لو۔" انسپکٹر نے امان کو اشارہ کیا۔

"نہیں۔ بس ہم سات ہی تھے گھر میں۔ راجو سمیت۔" امان نے جواب دیا۔

"یعنی خونی تمہی ہو؟"

"کیا؟" امان اچھل پڑا۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم میں سے ہی کوئی ہے۔ ایک منٹ۔" انسپکٹر نے موبائل نکالا اور تھانے میں فون کیا۔ انسپکٹر آنند بول رہا ہوں۔ ۲۱۵ سیکٹر ۵ میں لڑکی کی لاش موجود ہے۔ جلدی سے اسے ہسپتال لے جا کر پوسٹ مارٹم کرواؤ اور ابتدائی کارروائی کرو۔" انسپکٹر نے فون کاٹا اور روہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آ جاؤ میرے ساتھ۔ باقی سب یہیں رکیں۔" انسپکٹر کو روہن ہی شروتی کے سب سے نزدیک محسوس ہوا تھا۔ پھر اپنے ماتحت کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ "باہر سے دو سپاہیوں کو بلا کر یہاں کھڑا کرو اور باقی کو پورے مکان کی تلاشی لینے کا بولو۔"

......☆☆☆......

"ہوں۔ اب بتاؤ۔ کون سی پوری بات بتا رہے تھے؟" انسپکٹر آنند نے روہن کے بیڈ روم میں جا کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

روہن نے بے خود سا ہو کر اپنے خوابوں سے لے کر ٹیلے پر جانے کی' شروتی کے گھر پہنچنے کی' عمر کوٹ آنے تک کی اور بعد میں پرکاش کا شروتی کو ساتھ لے کر وہیں پہنچنے کی' اور شروتی کی جانب سے سنائی گئی ساری داستان بتا دی۔ مگر اس موقع پر اس نے عمر کوٹ میں نیرو کے ملنے کی بات کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ شروتی کے عامل بابا والی بات پر اس کو پورا یقین ہو گیا تھا۔ اور ماننے لگا تھا کہ اس کے خوابوں کی وجہ شروتی ہی تھی۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ کوئی تمہاری من گھڑت کہانی پر فلم بنا کر اچھا پیسہ کما سکتا ہے' ہر کسی کو یہ اسکرپٹ

مت سنایا کرو۔ سمجھے۔ اب مجھے بے وقوف سمجھنا چھوڑ دو اور کام کی بات بتاؤ۔" انسپکٹر کی بات پوری ہوتے ہی شروع ہو گیا۔

"مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ آپ یقین نہیں کریں گے۔ مگر یہی سچ ہے۔ کل رات اس کی حرکت سے میرے اس کے بارے میں خیالات ہی بدل گئے تھے اور میں اسے زبردستی اس کے کمرے میں چھوڑ کر باہر سے کنڈی لگا کر آ گیا۔" روہن اپنی بات پر اڑا رہا۔

"تمہارا کہنا ہے کہ کل رات وہ خود چل کر تمہارے کمرے میں آئی تھی۔ تم سے جسمانی ملاپ کے لیے بے قرار ہو کر۔" انسپکٹر نے اس کی بات کا نچوڑ نکالتے ہوئے کہا۔

"جی۔"

"اس سے اس کو کیا ملتا۔ اگر وہ سیکس کی بھوکی ہی ہوتی تو وہ تو کہیں بھی مل سکتا تھا۔ کافی خوب صورت تھی وہ۔" انسپکٹر نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"جی۔ مگر جانے کیوں اس وقت میں یہ سوچ نہیں پایا۔" روہن نے کہا۔

"وہ عامل ملنگ بابا کون ہے۔ کبھی ملے ہو؟"

"جی نہیں۔ مگر پرکاش ملا ہے۔ اس نے رویندر کو بھی بتایا تھا کل۔" روہن نے فوراً جواب دیا۔

"ہوں۔ دیکھتے ہیں۔ ویسے تمہیں کیا لگتا ہے۔ اگر تم نے اس کو نہیں مارا تو پھر کس نے مارا ہوگا۔" انسپکٹر نے روہن کے دل کو کریدنے کی کوشش کی۔

"میں ہی اس کی موت کی وجہ ہوں سر۔" روہن نے پھر سے جذبات میں بہتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس کے پیار اور جذبات کو سمجھنے میں بھول کی۔"

"مگر وہ کنڈی کس نے کھولی۔ کسی نے کچھ بتایا ہے؟"

"جی نہیں نوکر کے چلانے کے بعد میں ہی سب سے پہلے وہاں پہنچا تھا۔ بعد میں پرکاش بھائی آئے اور پھر نیچے سوئے باقی تینوں۔"

"پرکاش پر کتنا بھروسہ ہے تمہیں؟"

"جب بھائی ہی کہہ رہا ہوں سر تو بھروسہ نہ کرنے والی بات تو بے ایمانی ہی ہوگی نا۔ وہ سچ میں ہی میرے لیے بھائی جیسا ہے۔ اور یقین مانیں۔ شروتی نے خودکشی ہی کی ہے کسی کے بارے میں ایسی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی۔"

"ہوں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد سب صاف ہو ہی جائے گا۔ چلو تھانے چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کو بھی ساتھ لے لو۔" انسپکٹر' روہن کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک سپاہی کچھ کپڑے اٹھائے ان کی جانب آتا دکھائی دیا۔ انسپکٹر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"سر! صرف یہ لیڈیز کپڑے ملے ہیں ایک کمرے سے۔ باقی کچھ خاص نہیں تھا۔" سپاہی نے آتے ہی کپڑے انسپکٹر کو دکھائے۔

کپڑے دیکھتے ہی روہن فوراً بولا۔ "یہ شروتی کے ہی کپڑے ہیں۔ کل اس نے دن میں یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"ہوں۔ کہاں سے ملے یہ۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"سر۔ یہ وہ آخری والے کمرے کے باتھ روم سے۔"

"کیا...... مگر؟" روہن حیرت سے بولا۔ سپاہی پرکاش کے کمرے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"مگر...... کیا؟" انسپکٹر نے جلدی سے روہن کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ کچھ خاص نہیں سر۔" روہن اپنے دل کی بات چھپا گیا۔

"دیکھو۔ بات خاص ہے یا عام۔ یہ میں سوچوں

گا۔ دل میں کوئی بات مت رکھو۔ جو کچھ بھی ہے دل میں۔ سب بول دو۔“

”سر! ریئلی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شروتی کے کپڑے پرکاش کے باتھ روم میں کیسے آئے۔“ روہن نے جواب دیا۔

”یہی تو وہ سوالات ہیں بیٹا۔ جن کا جواب مجھے ڈھونڈنا ہے۔ پرکاش نے تمہاری پریم کہانی میں اتنی دلچسپی کیوں لی؟ وہ وہیں رہ کر تمہیں بلانے کی بجائے شروتی کو یہاں کیوں لے کر آیا؟ پرکاش عامل سے کیوں ملا؟ کنڈی کس نے کھولی اور اب یہ اس کے کپڑے پرکاش کے باتھ روم میں کیسے پہنچے۔ خیر۔ رات کو جب شروتی تمہارے پاس آئی تو کیا یہی کپڑے پہن رکھے تھے اس نے؟“ انسپکٹر نے سوچ سمجھ کے سوالات دوہراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں، وہ دوسرا لباس تھا۔“ روہن نے کہا۔

”مطلب؟ کیا وہ لباس بھی نہیں تھا جو اس کے مردہ بدن پر موجود ہے۔“ انسپکٹر اپنا سر کھجاتا ہوا بولا۔

”جی نہیں، دراصل لباس کی وجہ سے ہی مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ نائٹی پہن رکھی تھی اس نے۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ کہہ کر انسپکٹر نے سپاہی کو لباس ساتھ رکھنے کا کہا اور روہن کو پھر سے ساتھ لے کر شروتی والے کمرے میں آیا۔

شروتی کی لاش ہسپتال بھجوائی جا چکی تھی۔ وہاں کھڑے سبھی لوگوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ سب کے چہروں پر پیلا پن ابھر آیا تھا۔

”ذرا ڈھونڈو۔ وہ کپڑے کون سے ہیں؟“ انسپکٹر نے روہن کو اشارہ کیا۔ روہن کو الماری میں زیادہ تانک جھانک نہیں کرنا پڑی۔ وہ باریک نائٹی یونہی الماری کے بیچ والے خانے میں پھینکی گئی تھی۔ روہن اس کو اٹھانے کو جھکا تو انسپکٹر نے منع کر دیا۔

”ہاتھ مت لگاؤ تم اس کو۔“ اور ایک سپاہی کو احتیاط سے وہ نائٹی اٹھانے کو کہا۔ ”اب اس کا بیگ کھول کر اس کے سارے کپڑے نکالو۔“ انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔

سپاہی نے بیگ پلٹ کے سارے کپڑے بستر پر الٹ دیئے۔ اس ایک نائٹی کے علاوہ شروتی کے پاس اس طرح کا کوئی اور سیکسی لباس نہیں تھا۔ بلکہ سارے کپڑے پورے بدن کو ڈھکنے والے تھے۔ انسپکٹر نے اس بات پر غور کیا اور سپاہیوں سے سب کو ساتھ لے کر چلنے کا اشارہ کیا۔

......☆☆☆......

آدھے گھنٹے بعد پانچوں انسپکٹر آنند کے سامنے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر نے پرکاش کو کرسی بدل کر بیچ میں اس کے سامنے آنے کو کہا۔ پرکاش نے ویسا ہی کیا اور روہن قطار میں رکھی سب سے آخری والی کرسی پر چلا گیا۔

”تم اتنے تھکے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟ رات بھر جاگے ہو کیا؟“ انسپکٹر نے پرکاش سے پوچھا۔

”جی...... نہیں تو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور جو تھوڑا بہت تناؤ آپ میرے چہرے پر دیکھ رہے ہیں وہ بیچاری شروتی کی لاش دیکھنے کی وجہ سے ہے۔ اس کے ساتھ سچ میں بہت برا ہوا ہے۔“ پرکاش نے صفائی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

”تمہی شروتی کے قاتل ہو۔“ انسپکٹر نے سخت لہجے میں کہا۔

”کک کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ اس نے خودکشی کی ہے۔ سبھی جانتے ہیں۔ روہن نے اس کے ساتھ تعلق بنانے سے انکار کر دیا اس وجہ سے وہ جینے کی تمنا چھوڑ چکی تھی۔“ پرکاش ایک لمحے کے لیے تو سٹپٹا سا گیا تھا۔

لگ بھگ یہی تاثرات روہن کے چہرے پر بھی آئے تھے۔ ”سر آپ بلاوجہ پرکاش پر شک کر رہے ہیں۔“

”مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں بلاوجہ اس پر شک کر رہا ہوں میں نے تم پر شک نہیں کیا۔ حالانکہ تم اس کے ساتھ سب سے زیادہ دیر تک ساتھ رہے تھے۔ میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ تم نے ہی زبردستی کرنے کی کوشش کی اور جب وہ نہیں مانی تو تم نے اس کو مار کر پھانسی پر ٹانگ دیا لیکن میں نے نہیں کہا۔ ہمارا تو یہ روز کا کام ہے بچو۔ ہم قاتل کو نظروں سے پہچان لیتے ہیں۔“

انسپکٹر بولتے بولتے سخت طیش میں آ گیا۔ میز پر رکھا پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے وہ پھر بولنا شروع ہو گیا۔ ”دیکھو پرکاش۔ میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اگر تم اس کو یہاں لے کر نہیں آتے تو اس کے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا۔ ہیں نا؟“

”جی یہ تو ہے۔“ پرکاش نے نظریں جھکا لیں۔

”تو کیوں لے کر آئے اس کو؟ تمہارا کیا فائدہ تھا اس میں؟“ انسپکٹر نے زور دے کر پوچھا۔

”میرا کیا فائدہ ہوتا بھلا میں نے تو جو کیا، روہن کے لیے کیا۔“ پرکاش نے صفائی دی۔

”ایسا کیا کر دیا تم نے روہن کے لیے۔“ انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

”جی وہ روہن یہاں کسی لڑکی کے چکر میں ہی آیا تھا۔ شروتی نے جب مجھے یہ بتایا کہ دراصل روہن کو پچھلے کئی مہینوں سے سپنے آ رہے تھے۔ تو اس نے مجھے ساتھ لے کر اس لڑکی کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ لڑکی نے ہمیں ٹیلے۔“ پرکاش ابھی بتا ہی رہا تھا کہ انسپکٹر نے بیچ میں ٹوک دیا۔

”یہ سب بکواس میں سن چکا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ شروتی نے تمہیں کیا بتایا۔“

”جی یہی کہ سب اس نے ہی کیا تھا۔ ایک عامل کے ساتھ مل کر۔ اس نے مجھے بتایا کہ۔“ پرکاش نے وہی باتیں دوہرا دیں جو پہلے دن شروتی نے روہن کو اور آج روہن نے انسپکٹر کو بتائی تھیں۔

”تمہیں یہ سب شروتی نے کیسے بتا دیا۔ بتانا ہوتا

دیوالی کی صفائی

ابا (سجاد ظہیر) دستاویز سنبھالنے میں ماہر تھے اور چھوٹی سی لال ڈائری میں اس سے چھوٹی گھومنے والی سنہری پنسل سے اس سے بھی چھوٹی لکھائی میں کاغذوں کا اتا پتا درج کرتے رہتے تھے۔ ہزاروں کاغذوں کے ڈھیر میں سے وہ کھوئے ہوئے دستاویز کا یوں پتا لگا لیتے جیسے دور تک پھیلے کیچڑ میں کوئی بنگالی مچھورا دبے ہوئے کچھوے کو تلاش کر لیتا ہے۔

امی کا یہ عالم تھا کہ تین مہینے میں ایک بار انہیں اپنی میز اور درازیں صاف کرنے کا خیال آتا ہے۔ صفائی کا ان کا عجیب طریقہ تھا۔ کاغذ پھینکتی نہیں تھیں انہیں پھاڑ دیتی تھیں اور صاحب کیا تیزی دکھاتی تھیں پھاڑنے میں۔ یہ اٹھایا وہ پھاڑا، وہ اٹھایا یہ پھاڑا۔ اکثر بے کار کے کاغذ کم اور کام کے زیادہ پھاڑتیں۔ ایک بار تو لفافے کے تین سو سو کے نوٹ بھی پرزہ پرزہ ہوئے ابا ان کے صفائی کے دورے کی بھنک ملتے ہی وہ اپنے سارے اپائنٹ منٹ کینسل کر کے اپنے پڑھنے لکھنے کے کونے میں جم جاتے۔ امی آتیں، فائلیں کھسکاتیں، ایک آدھ کاغذ اٹھاتیں، یہاں بھی صفائی ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ یا۔ سنتے ہو؟ یہ سب کاغذ کام کے ہیں کیا۔ جیسے ٹوہ لینے والے فقرے ابا کی طرف اچھالتیں۔ بس، ہوں میں جواب دیتے، کہنے کو وہ کچھ پڑھ رہے ہوتے پر ان کی نظریں امی پر ہوتیں اور جہاں ان کی انگلیاں فائل کھولنے کو ہوتیں کہ وہ ٹوکتے، ارے ارے یہ سب اگلے سیمینار کے کاغذات ہیں، یا، ارے نہیں ابھی نہ چھونا، ایک آرٹیکل میں ان کی ضرورت ہے، آخر میں امی بڑبڑائی ہوتیں۔

اس گھر میں تو دیوالی کی سالانہ صفائی بھی نہیں ہوتی، ہتھیار ڈال دیتیں۔

(انتخاب ہے جناب انور سجاد ظہیر صاحب کی کتاب میرے حصے کی روشنائی سے)

(صابرہ کلثوم......خانیوال)

تو اسی دن بتا دیتی جس دن تم نے اس کو کالج چھوڑا تھا۔ یا تم نے بعد میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی تھی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

اس سوال پر ایک بار تو پرکاش بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "اب یہ تو وہی بتا سکتی تھی کہ اس نے مجھے کیوں بتایا۔ میں نے صرف اس کو یہ بتایا تھا کہ روہن کسی نیرو کے چکر میں عمر کوٹ گیا ہے۔"

"کک کیا...... کیا نام بتایا تم نے؟" انسپکٹر اچانک چونک پڑا۔

"جی نیرو۔" پرکاش نے جواب دیا۔

"اوہ اچھا۔" انسپکٹر نے گھور کر روہن کی طرف دیکھا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پھر۔"

"یہ سن کر وہ بے چین سی ہو گئی اور اس نے روہن سے بات کروانے کو کہا۔ مگر جب روہن کا فون نہیں ملا تو اس نے مجھے ہی سب کچھ بتا دیا۔" پرکاش نے اتنی دیر میں بات بنالی تھی۔

"مگر تم اس کے پاس دوبارہ کیا کرنے گئے تھے۔" انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

"جی! وہ میں سچائی کا پتا لگانا چاہتا تھا۔ اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا مجھے کسی سازش کی بو آ رہی تھی۔" پرکاش نے لمبی سانس لے کر اپنے آپ کو اگلے سوال کے لیے تیار کیا۔

"اس عامل سے ملے ہو تم۔" انسپکٹر کا اگلا سوال۔

"جی نہیں۔" پرکاش کے ایسا کہتے ہی اس کے ساتھ بیٹھے رویندر نے اس کو حیرت سے دیکھا۔ پرکاش نے اس کا ہاتھ دبا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا تو وہ بپھر گیا۔

"میرا ہاتھ کیوں دبا رہے ہو بھائی۔ جو سچ ہے۔ وہ بتاؤ نا۔ کل تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ۔"

پرکاش نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا یار۔ تاکہ تمہیں اس کی بات پر یقین ہو جائے۔"

"کمال ہے۔ تم سچائی کا پتا لگانا چاہتے تھے۔ مگر عامل سے ملے بنا ہی تمہیں اس پر یقین آ گیا۔ تم ہر حالت میں یہ چاہتے تھے کہ روہن کو شروتی کی بات پر یا میں اس کو چیک کر کے کہوں تو تمہاری بنائی ہوئی بات پر یقین ہو جائے۔ اس لیے تم نے اس کو جھوٹ بول دیا کہ میں عامل سے مل چکا ہوں۔ جب تم کسی عامل سے ملے ہی نہیں تو چھان بین کیا کی تم نے۔" انسپکٹر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

پرکاش کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ بیٹھا سامنے دیکھتا رہا۔

"بولتے کیوں نہیں؟" انسپکٹر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ سمیر اور امان جو اب تک پریشان سے بیٹھے تھے وہ بھی معاملے میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

"اب میں کیا کہوں سر۔ آپ خوامخواہ بات کو گھما پھرا کر دیکھ رہے ہیں۔" پرکاش بے چین سا ہو رہا تھا۔

"ایک بات بولوں۔ تم پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہو اس لیے اپنا سر کھپا رہا ہوں۔ ورنہ یہاں باتوں کو گھمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاتھ گھمانے سے کام جلدی بن جاتا ہے۔ وہ چیخیں سن رہے ہو نا تم۔" انسپکٹر نے طیش میں آ کر کہا۔

"جی۔" پرکاش اور کچھ نہیں بولا۔

"اب دھیان سے سنو۔ جتنی کہانی میری سمجھ میں آئی ہے۔ وہ مجھ سے سنتے جاؤ اور بیچ بیچ میں میرے سوالوں کو نوٹ کرتے جانا اور آخر میں سب کا جواب ایک ساتھ دینا۔ ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم بھی میری طرح انسان ہو۔" انسپکٹر نہایت تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "مجھے نہیں پتا کہ

سپنے والا کیا ڈراما تھا اور نہ ہی میں اس کا ذکر کروں گا۔ مگر جب روہن عمر کوٹ آ گیا تو جانے تمہیں کیا کھجلی مچی کہ تم شروتی سے ملے۔ پتا نہیں کیسے اور کیوں۔ مگر تم نے روہن کے سپنے والی بات کا فائدہ اٹھانے کے لیے شروتی کو زبردستی اپنے ساتھ ملایا کہ کہیں روہن تمہارے ہاتھ سے نہ نکل جائے اس لیے تم شروتی کو یہاں لے آئے۔ تم نے اس کو وہ باریک سی نائٹی پہنائی اور روہن کے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے پاس اس طرح کا کوئی اور لباس کیوں نہیں ملا۔ ثبوت ہیں اس کے وہ کپڑے جو اس نے کل دن میں پہن رکھے تھے اور رات کو تمہارے باتھ روم میں ملے۔ کچھ کہنا چاہتے ہو اس بارے میں؟"

"مجھے نہیں پتا کہ اس کے کپڑے میرے باتھ روم میں کیسے آئے۔ ہو سکتا ہے جب میں باہر تھا تو وہ باتھ روم میں لباس بدلنے گئی ہو۔ سر آپ۔" پرکاش کے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔ اس کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ گھرتا جا رہا ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ ایک چھوٹے سے شہر کا عام سا دکھائی دینے والا یہ پولیس آفیسر اپنی ذہانت سے شہری پولیس کو بھی مات کر دے گا۔

"میں بھلا اس کو کوئی بھی نائٹی پہننے کے لیے کیوں دوں گا' میرا کیا فائدہ ہوتا اس میں۔"

"یہی تو مجھے پتا کرنا ہے کہ تمہارا کیا فائدہ ہوتا۔ خیر۔ شروتی کوئی بچی نہیں تھی۔ اگر وہ یونہی تمہارے کمرے میں کپڑے بدلنے گئی ہوتی تو اپنے کپڑے کبھی وہاں نہ چھوڑتی۔ خاص طور پر زیر جامے تو ہرگز وہاں سے نہ ملتے۔ شروتی ایک غیرت مند لڑکی تھی جس کو تم نے طوائف کے طور پر روہن کے سامنے پیش کر دیا۔" انسپکٹر کی اس بات پر سامنے بیٹھے سبھی لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

"مم۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا سر کہ آپ کہہ کیا رہے ہیں۔"

"ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔" انسپکٹر کسی کو آواز دیتا ہوا بولا۔ "وہ شروتی کا خط لے کر آنا۔"

پرکاش کا چہرہ حیرت اور خوف سے سفید پڑنے لگا۔

"جی صاحب لایا۔"

اور ایک سپاہی آ کر انسپکٹر کے ہاتھ میں خط دے گیا۔

"سنو۔ شروتی نے کیا لکھا ہے مرنے سے پہلے۔ روہن مجھے معاف کر دینا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ تمہارے ہی دوست کے دباؤ میں آ کر کیا تھا۔"

انسپکٹر خط پڑھ ہی رہا تھا کہ پرکاش نے جھپٹا مارا اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ پاتا وہ خط کو نگل چکا تھا۔ یہ خط ہی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔

"ہاں میں نے ہی کیا اس کا خون۔" پرکاش کرسی سے اٹھ کر اپنا سر پکڑ زمین پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

انسپکٹر زور کا قہقہہ لگا کر ہنسا۔

روہن کرسی سے اٹھا اور ایک زور کی لات پرکاش کی پیٹھ پر رسید کی۔ "کمینے۔" اور روہن بھی اپنا سر پکڑ کر دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

"ذرا آرام سے۔ ابھی تو اس کو بہت کچھ بتانا باقی ہے۔" انسپکٹر نے پرکاش کو گریبان سے پکڑا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ "اب تم آرام سے سب بتا رہے ہو یا۔"

کرسی پر بیٹھا ہوا پرکاش ایک گہری سانس لے کر کسی مشین کی طرح شروع ہو گیا۔

"مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ دوست کی دولت ہڑپنے کے چکر میں' میں کس حد تک گر گیا ہوں۔ اس کے خواب پر مجھے تب بھی یقین نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔ مگر میرے دماغ کو اس بات سے فائدہ اٹھانے کی ہوس نے اس قدر جکڑا کہ میں گرتا چلا گیا۔ میں شروتی کو زبردستی اپنی بند ہو چکی فیکٹری میں لے

گیا۔ وہاں اس کو ڈرایا اور اپنے ساتھ تعلق قائم کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے اس کی سی ڈی بنالی تھی۔ اس کو بلیک میل کر کے میں نے اس کو اپنے ساتھ سازش میں شامل کر لیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ روہن کے ساتھ شادی کر کے طلاق لے لے اور قانوناً اس کی آدھی جائیداد کی حقدار بن جائے۔ پھر اس سی ڈی کے دم پر سب کچھ میرا ہی ہونا تھا۔ پلان یہ تھا کہ میں شروتی سے کہلوا کر روہن کو یقین دلواؤں کہ شروتی ہی وہ ہیرو ہے جو اس کے خوابوں میں آتی ہے۔ اس کے بعد یہ اس سے آرام سے شادی کر لیتا۔ مگر جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کو یہاں بھی کوئی نیرو مل گئی ہے تو مجھے سب کچھ مٹی میں ملتا نظر آنے لگا۔ اس لیے میں نے اس کو زبردستی یہاں آنے کے لیے تیار کیا۔ سب ٹھیک چل رہا تھا لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ روہن کو اس کی کہانی پر یقین نہیں ہوا تو میں دوسرا طریقہ اپنانے پر مجبور ہو گیا جو پہلے ہی میرے دماغ میں تھا۔ میں نے شام کو ہی روہن کے کمرے میں کیمرہ فٹ کر دیا تھا۔ شروتی کو میں نے بول دیا تھا کہ میں نے روہن کے کمرے میں کیمرہ فٹ کر دیا ہے اور میں اس کی ہر حرکت پر نظر رکھوں گا۔ اور یہ بھی کہ اگر اس کو اپنے ساتھ تعلق قائم کرنے پر مجبور نہیں کر پائی تو اس کو میرے پاس سونا پڑے گا۔ میں نے اس کو وہ نائٹی پہنائی اور روہن کے پاس بھیج دیا۔ یہاں پر میرا داؤ الٹا ہو گیا۔ روہن شاید ان کپڑوں کی وجہ سے ہی چڑ گیا اور اس کو کمرے سے باہر نکال کر اس کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ بعد میں میں نے اس کو کئی فون کیے مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ پنکھے سے جھول رہی تھی۔ نیچے خط رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس اب کچھ بچا نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ خط اور اس کا فون اپنی جیب میں رکھا اور باہر نکل آیا۔ پھر بھی میں مانتا ہوں کہ اس کا قاتل میں ہی ہوں۔" پرکاش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور ساتھ ہی روہن بھی بری طرح سے رو رہا تھا۔

کمرے میں کافی دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ انسپکٹر نے ہی کچھ دیر بعد یہ خاموشی توڑی۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوگا روہن۔ مگر شروتی جاتے جاتے تمہاری آستین میں پل رہے ایک زہریلے ناگ سے چھٹکارا دلا گئی اس نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ راجو مجھے فون کر دے گا اور یہ اس طرح پھنس جائے گا۔ اس نے تو چپ چاپ لاش ٹھکانے لگوا دینی تھی اور تمہارا دوست ہونے کا ڈھونگ بھی کرتا رہتا۔ پھر کبھی ڈستا۔ اگر یہ باہر آتے ہوئے کنڈی بند کرنی نہ بھولتا تو شاید میں تمہاری بات پر یقین کر کے معاملے کو پوسٹ مارٹم ہونے تک یونہی چھوڑ دیتا اور پوسٹ مارٹم میں تو شاید ثابت ہو ہی جائے گا کہ اس نے خودکشی ہی کی ہے اور وجہ بھی میں یہی مانتا کہ تمہارے کمرے سے ذلیل ہو کر نکلنے کے بعد اس کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں بچا ہوگا۔ مگر تمہارے کنڈی بند کرنے اور صبح راجو کو دروازہ کھلا ملنے پر ہی مجھے پہلی بار یہ شک ہوا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کا خون کر دیا ہو۔ ایک بات اور۔ عام طور پر خودکشی کرنے والے بھی لوگ کوئی نہ کوئی خط چھوڑ کر ضرور جاتے ہیں۔ وہ بھی ہمیں وہاں نہیں ملا۔ اس سے بھی میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ ہو نہ ہو اس کا خون کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس کے کمرے میں شروتی کے کپڑوں کا ملنا' نہایت ہی باریک نائٹی کا پہننا' جو کہ اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتی تھی' اس کا اسے عمر کوٹ لے کر آنا۔ اور پھر تمہارے کمرے میں بیٹھے ہوئے مجھے فینسی لائٹ کے ساتھ کیمرہ لگا دکھائی دینا۔ ان سب باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ شروتی کو بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ اور بہت پہلے شک ہو گیا تھا کہ اسی بندے میں گڑبڑ ہے۔ مگر جب تک کہ اس نے کورا کاغذ میرے ہاتھ سے نہیں چھینا تھا مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ گتھی اتنی آسانی سے سلجھ جائے گی۔"

"خیر روہن۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اگر انسانیت کے ناتے تم اس کی ضمانت کروانا چاہتے ہو تو کورٹ میں درخواست لگوا دینا۔ نا چاہو تو بھی کم سے کم اس کے گھر والوں کو تو اطلاع کر ہی دینا۔" انسپکٹر آنند نے کہا اور پرکاش کو اٹھا کر لے گیا۔

......☆☆☆......

"اب یوں منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہو یار' جو کچھ ہوا اس کا ہم سب کو افسوس ہے۔ مگر ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ غنیمت ہے کہ اس پرکاش کی اصلیت بے پردہ ہو گئی۔ دوستی کے نام پر کلنک تھا وہ۔" امان نے روہن کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سوری یار۔ میری وجہ سے تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا ۔تھانے تک آنا پڑا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔" روہن نے کندھے پر رکھا امان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ابے یار! دیکھا سمیر۔ اب یہ ہمیں بھی پرکاش جیسا سمجھ رہا ہے۔ یہ بات کہہ کر تو تم نے ہمیں گالی سی دے دی ہے۔ ہمارا کیا گھس گیا۔ سچائی ہی سامنے آئی نا۔ چل چھوڑ۔ تمہیں اسپیشل چائے پلواتا ہوں اصلی دودھ والی۔ ساری ٹینشن دور ہو جائے گی۔ ابے راجو۔ سالے چغل خور۔" امان نے راجو کو آواز لگائی۔ مگر راجو وہاں ہوتا تو ملتا۔

"لگتا ہے ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ ویسے کام بندے نے ایک نمبر کا کر دیا۔ اگر وہ پولیس کو نہ بلاتا تو ہم تو یہی سمجھتے رہتے کہ شروتی۔" بات کو پوری کیے بنا ہی امان آگے بولا۔ "اور پرکاش صاف صاف بچ جاتا پھر جانے کیا تگڈم کھیلتا تمہارے ساتھ۔ خیر تم بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔" امان اٹھنے لگا تو سمیر کھڑا ہو گیا۔

"تم لوگ باتیں کرو۔ آج میں اپنے ہاتھ کا کمال دکھاتا ہوں۔" اور سمیر کچن کی طرف چلا گیا۔

"اب کیا سوچا ہے۔" امان واپس اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

رویندر کا دماغ بہت زیادہ خراب تھا۔ پاس ہی صوفے پر لیٹا ہوا وہ اپنے چہرے کو رومال سے ڈھکے

فریاد دل

تیرے آنے سے پہلے
میرے دل کے سبھی در
کھلے ہوئے تھے
ٹھنڈی ہوائیں
سانسوں کے رستے
اس کے در و دیوار سے
ٹکرا کے گزرتی تھیں
اس کے ساتھ ہی نجانے
کتنی آرزومند صدائیں
دب کے مرتی تھیں
تب بھی روتا تھا یہ دل
اور اب بھی روتا ہے یہ دل
کیوں کہ اے بے وفا!
تیرے آنے کے بعد
اس کے سبھی در بند ہو چکے
اب یہ خودغرض دل
فریاد کرتا ہے
کہ مجھ میں قید یہ قیدی
زبردستی گھسیڑا گیا ہے
یہ میرے در و دیوار کو
ہر پل ہی کوستا ہے
خدارا کیانی!
اس کو نکال پھینکو
اس کو نکال پھینکو

ایم عثمانی کیانی......راولپنڈی

ہوئے تھا۔
"اب کرنے کو بچا ہی کیا ہے۔ شروتی کے بابا کو تو بتانا ہی پڑے گا۔" روہن کی آنکھیں بھر آئیں۔ "پھر وہی زندگی کاٹنی ہے یار۔ صبح کالج۔ شام کو گھر۔"
"کیوں۔ اپنی نیرو کو بھول جائے گا کیا۔ اس کو ایسے ہی تڑپتے رہنے دے گا اب؟" امان کو لگا جیسے وہ نیرو کو بھول ہی چکا ہے۔
"اب کیا رہ گیا ہے یار۔ اب تو سب صاف ہو ہی گیا ہے کہ یہ پرکاش کی سازش تھی۔ خواب بھی اسی کی وجہ سے آتے ہوں گے۔" روہن نے یونہی منہ لٹکائے ہوئے کہا۔
رویندر اس کی بات سنتے ہی اچھل پڑا۔
"ابے یار مجھے گدھا کہتا ہے۔ خود تم نے کبھی دماغ کا استعمال کیا ہے کہ نہیں۔ یا وہ ہے ہی نہیں تیرے اندر۔ پرکاش نے سازش تمہارے خواب کے بارے میں بتانے کے بعد شروع کی تھی۔ شروتی کی بات سازش ہو سکتی ہے۔ اس کے سپنوں کی بات جھوٹی ہو سکتی ہے۔ ہو کیا سکتی ہے۔ جھوٹی ہی تھی۔ مگر تمہارے خواب تو کسی کی سازش نہیں تھے نا۔ وہ تو سچ ہی ہیں۔ اور جو گھر تم نے سپنے میں دیکھا تھا۔ ویسا ہی گھر تم نیرو کا بتا رہے ہو۔ اب تو یہ صاف ہو گیا نا کہ یہی وہ لڑکی ہے۔ جس کا تمہارے ساتھ جنم جنم کا تعلق ہے۔ کہاں سے سوچ رہے ہو تم؟"
"ہاں یار میرا تو کل سے دماغ ہی خراب ہے۔ دراصل صبح یہ سب دیکھنے کے بعد کچھ اور سوچ ہی نہیں پایا۔ جو کل رات کو سوچ رہا تھا وہی اب تک سوچ رہا ہوں۔ اس کا مطلب کہ نیرو واقعی ہے۔" روہن کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔
"نہیں نہیں۔ نیرو کہاں ہے۔" رویندر منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں کل ہی کہا تھا کہ مجھے پرکاش کے دل میں کھوٹ لگ رہا ہے۔ مگر تم نے میری بات سنی ہی نہیں۔ پرکاش کی کہانی میں اتنی دلچسپی لینے کی جو بات انسپکٹر کہہ رہا تھا وہی بات تم سے میں کرنا چاہتا تھا۔ انفیکٹ وہ مجھے مارکیٹ میں جب کہانی بتا رہا تھا تبھی مجھے شک ہو گیا تھا کہ پرکاش جھوٹ بول رہا ہے۔ اور جھوٹ بھی اپنی مرضی سے۔ مگر یہاں سنتا کون ہے میری۔ چلی گئی نا بیچاری شروتی۔" رویندر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
"چھوڑو یار۔ جو ہوا۔ سو ہوا۔" امان نے رویندر کو چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں امان صاحب۔" کمرے میں انسپکٹر آنند داخل ہوا تو تینوں چونک کر کھڑے ہو گئے۔
"آیئے انسپکٹر صاحب۔" امان اس کا استقبال کرتا ہوا بولا۔
"خط پڑھ کر میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ارے جب چاہیں آ جائیں۔ آپ کا ہی گھر ہے۔ مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ خط نہیں ملا تھا۔ صرف ایک کورا کاغذ ہی تھا جو آپ ہمارے سامنے پڑھ رہے تھے اور پرکاش نے چھین کر نگل لیا تھا۔" امان نے متجسس ہو کر پوچھا۔
تبھی کمرے میں ٹرے اٹھائے ہوئے سمیر اندر آیا۔ انسپکٹر کو بیٹھے دیکھ کر ایک بار اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ پھر چپ چاپ آ کر میز پر ٹرے رکھ دی۔
"شکریہ۔ بڑی دیر سے خواہش ہو رہی تھی۔ راجو بھاگ گیا کیا؟" انسپکٹر نے ایک کپ اٹھاتے ہوئے سمیر کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔
"جی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ۔" اس سے پہلے کہ امان اپنی بات پوری کرتا۔ انسپکٹر بول پڑا۔

"فکر مت کرو۔ شام تک واپس آ جائے گا۔ ویسے تم سب کو تو خوشی ہو رہی ہوگی کہ پرکاش کی اصلیت کا پتا لگ گیا۔"
"جی بالکل۔" اس بار روہن بولا۔ "مگر وہ خط کے بارے میں آپ کیا کہہ رہے تھے۔"
"ہوں۔ دراصل جو خط شروتی نے لکھا تھا وہ ہمیں پرکاش کی تلاشی لیتے ہوئے اس کی جیب سے ملا۔ یہ لو۔ پڑھو ذرا خط کو۔ اس کی کاپی ہے۔" انسپکٹر نے خط روہن کو پکڑا دیا۔ چھوٹے چھوٹے حروف لکھے ہوئے تھے۔ شاید کاغذ شروتی کے پاس کم تھا۔ روہن خط کو بلند آواز سے پڑھنے لگا۔
"روہن۔ صبح جب آپ سو کر اٹھیں گے تو میں آپ کو اس دنیا میں نہیں ملوں گی۔ نہایت ہی شرمناک حرکت کی ہے میں نے آپ کے ساتھ۔ اس وقت میرا دل بھی رو رہا تھا۔ پلیز مجھے معاف کر دینا۔ سب میری مجبوری تھی۔ مجبوری بھی ایسی کہ بتا نہیں سکتی۔ ورنہ میرے بابا جیتے جی مر جائیں گے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ سے بے انتہا پیار کرتی ہوں۔ اور اب آپ کی نظروں کا سامنا نہیں کر سکتی۔ اس لیے دنیا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ہو سکے تو میرے بابا کے پاس چلے جانا۔ جیتے جی میں نے کوئی ایسا کام اپنی مرضی سے نہیں کیا جو ان کی آن کو ٹھیس پہنچائے۔ مرنے کے بعد کوئی مجھے بدنام کر سکتا ہے۔ ہو سکے تو ان کو سنبھال لینا۔ کہتے ہیں کہ بھگوان کی مرضی کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا۔ تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا اس میں بھگوان کی مرضی شامل تھی۔ مگر ایسا سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ پتا نہیں کن گناہوں کی سزا ملی ہے مجھے۔ میں نے تو کبھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں، سوائے آپ کے۔ پھر مجھے آپ کے سامنے ہی

غزل

خدا کی مرضی وہ میرے ہاتھوں پر ہجر لکھے وصال لکھے
رضا جو اس کی ہے میں بھی خوش ہوں عروج بخشے زوال لکھے
سنو میرے دل کہ آج سے بس جدا جدا ہیں ہمارے رستے
تمہارے رستوں پر چل کے ہم نے دکھ پڑھے ہیں ملال لکھے
جو ممتحن تھا بنایا اس نے ہے اتنا مشکل حیات پرچہ
کہ ہم سے ممبر تو فیل ہوں گے ہیں ایسے اس نے سوال لکھے
یہ میرے اشعار درحقیقت ہیں سب قصیدے تری ادا کے
جو غزل لکھی جو نظم لکھی بس اس میں تیرے جمال لکھے
میری انا ہے نہیں جھکوں گا کبھی بھی حاکم کے سامنے
ڈال دے مجھ کو خواہ قفس میں یا میرا منصب بحال لکھے
نہ تمازت میری ضرورت نہ چاہ مجھ کو سائے کی ہے
انا پرستوں کا ذکر جب ہو تاریخ میری مثال لکھے
آزاد محسن کی بات کیا ہے غزل کا جیسے کہ شہنشاہ ہے
موتی جیسے ہوں اک لڑی میں وہ لفظ ایسے کمال لکھے
آزاد حسین آزاد...... رکن سٹی

ذلیل کیوں ہونا پڑا۔ سوچتی ہوں بھگوان نے پیار بنایا ہی کیوں۔ اور بنایا تو ہر بار ادھورا کیوں چھوڑ دیا۔ پیار کرنے والے ہمیشہ جدائی کی آگ میں کیوں جھلتے رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اس جنم میں نیرو کا پیار آپ کو مل جائے۔ اور اگلے جنم میں مجھے میرا ادھورا پیار۔ اگر واقعی کوئی دوسرا جنم ہوتا ہے تو۔ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ اب اگلا جنم ہو یا نہ ہو۔ میری روح تمہاری منتظر رہے گی۔ شروتی۔"
سب کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں سوائے انسپکٹر کے۔
"تم شروتی سے کتنی بار ملے تھے روہن؟"
"جی بس دو بار۔ ایک بار اس کے گھر پر اور ایک بار رات کو۔" روہن نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔
"تمہارے بیچ کچھ باتیں بھی ہوئی تھیں کیا، میرا مطلب ہے کوئی رومانی۔ پیار بھری باتیں؟" انسپکٹر

نے پوچھا۔

”نہیں۔ جو بھی ہوئی تھیں یا تو کل دن میں ہوئی تھیں۔“ روہن کچھ دیر رک کر بولا۔ ”یا پھر رات میں۔“ رات کو اس نے شروتی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اسے یاد کر کے روہن سسک پڑا۔

”کول ڈاؤن یار۔ زندگی میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی شریف انسان ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ تمہیں کیا پتا تھا کہ وہ مجبوری میں یہ سب کر رہی ہے۔ مگر یہ ایک ہی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ابھی تک۔ میں وہی جاننے آیا ہوں۔“ انسپکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”کیا؟“ روہن بولا۔

میں نے کبھی پیار کیا نہیں ہے۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے پیار تو دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ خاص طور پر اتنا پیار کہ کوئی کسی کی نظروں سے گر جانے پر خودکشی ہی کر لے۔ اس کے پاس اور بھی راستے تھے۔ پرکاش کیمرے میں دیکھ ہی لیتا کہ شروتی نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ پھر وہ جیسے چل رہا تھا ویسے ہی چلنے دے سکتی تھی۔ جان دینا تو آخری ہتھیار ہوتا اور وہ تو کبھی بھی کر سکتی تھی۔ اگر کوئی راستہ نہ بچا ہوتا تو؟“ انسپکٹر نے کہا۔ ”اور سب سے خاص بات شروتی کو پیار کب ہو گیا روہن سے۔ اگر وہ اس سے کبھی کھلی ملی ہی نہیں۔ وقت نہیں گزارا اس کے ساتھ۔“

اس بار امان خود کو بولنے سے نہیں روک پایا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔ پیار کیسے بنا پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ اتنا چھوٹا سا نام ہے پیار۔ مگر اس میں رنگ اتنے بھرے ہوئے ہیں کہ آدمی صرف اپنے پیار کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے کے پیار کو نہیں، کبھی کبھی ہم سالوں ساتھ رہتے ہیں اور پتا ہی نہیں چلتا کہ ہمیں پیار ہو گیا ہے۔ جدا ہونے کے بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس کے بنا جینا کتنا مشکل ہے، تب ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمیں تو پیار ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی پہلی نظر میں ہی ہمیں پیار ہو جاتا ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہی پیار ہے۔ بولنا چاہتے ہیں۔ مگر کبھی بول ہی نہیں پاتے جانے کیوں اس کے سامنے کبھی زبان ہی نہیں کھلتی۔ اور جب کھلتی ہے تو الگ ہونا ہماری مجبوری بن جاتا ہے، یک طرفہ پیار بھی ہوتا ہے۔ ہم پاگل ہو کر کسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور لاکھ جتن کر کے بھی اس کو احساس ہی نہیں کرا پاتے کہ وہ ہمارے لیے کیا ہے۔ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں اپنی منزل، ماں باپ کے سپنے۔ سب کچھ بھول کر صرف ایک ہی چیز یاد رہتی ہے۔ اس کا نام۔ اپنا سب کچھ برباد کرنے کے بعد بھی ہمیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوتا کہ اس نے ہمارے پیار کو توجہ نہیں دی اور چھوڑ کر چلی گئی، کبھی کبھی اس کی نفرت سے بھی ہمیں پیار ہو جاتا ہے اور ہم سامنے والے پر اس کی نفرت کے باوجود اس پر جان لٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ پتنگا کیا شمع سے نکلنے والی آنچ کو محسوس کر کے جھلستا نہیں ہوگا۔ مگر پھر بھی وہ اس میں جان دیئے بغیر مانتا نہیں۔ یہ بھی پیار ہی ہے۔ شروتی کا پیار روہن کی نفرت سے ہی پیدا ہوا ہوگا۔ اس کی ایسی نفرت جس نے روہن کی ہستی کو اس کی نظروں میں کہیں اونچا کر دیا۔ اس نے خود کو سونپنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی لیکن اس نے شروتی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ وہ یہاں آئی مجبوری میں تھی مگر روہن کی انسانیت دیکھ کر وہ اس پر مر مٹی۔ اس نے دونوں طرح کے لوگ دیکھ لیے۔ پرکاش جیسے بھی اور پھر روہن جیسے بھی۔ تو اسے روہن سے پیار کیوں نہ ہوتا۔ پیار۔“ امان بنا رکے بولے ہی چلے جا رہا تھا کہ انسپکٹر نے اسے روک دیا۔

”تم نے پیار میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے کیا۔ یا تم کوئی لو پروفیسر ہو۔“

”نہیں انسپکٹر صاحب پیار کا کوئی پروفیسر یا استاد کیسے ہو سکتا ہے۔ پیار ہی پیدا کرتا ہے اور پیار ہی جان لے لیتا ہے۔ پیار ہی سب کچھ سکھاتا ہے اور پیار ہی سب کچھ بھلانے پر مجبور کرتا ہے۔ پیار ہی آدمی کو کھڑا کرتا ہے اور پیار ہی گرا دیتا ہے۔ ساری دنیا اس کی غلام ہے۔ ساری دنیا اسی کی وجہ سے چل رہی ہے۔ پیار ہی سب کا استاد ہے۔“ امان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اف، میں تو تمہیں ایویں ہی سمجھ رہا تھا یار۔ تم تو کمال ہو۔ میرا نام انسپکٹر آنند ہے۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ انسپکٹر نے اپنا ہاتھ امان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور امان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اب میں چلتا ہوں۔ جلد ہی پھر ملوں گا تم سے۔ مجھے بھی پیار کر کے دیکھنا ہے یار۔“ انسپکٹر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

......☆☆☆......

”ارے شینو۔ آج کالج نہیں جانا کیا؟“ امی نے نیچے سے آواز لگائی۔

”جا رہی ہوں امی۔ بس ریتو آ جائے ایک بار۔“ نیرو نے اوپر سے ہی آواز لگا کر جواب دیا اور پردہ ہٹا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ ریتو کا گھر سامنے والی گلی میں کچھ گھر چھوڑ کر ہی تھا۔ اسے جب ریتو آتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو سیڑھیوں سے تیزی سے اترتی ہوئی نیچے آئی اور ریتو کے گھر فون ملایا۔ ”نمستے چاچی۔“

”نمستے بیٹا۔“ دوسری طرف سے ریتو کی امی نے جواب دیا۔

”ریتو ابھی تک نہیں آئی۔ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔“ نیرو بولی۔

”بس ابھی نکلی ہے بیٹی۔ دیکھو پہنچ گئی ہوگی۔“ ادھر سے جواب ملا ہی تھا کہ دروازے کی بیل بج اٹھی۔

”لگتا ہے آ گئی۔ اچھا چاچی۔“ نیرو نے فون رکھا اور اپنی کتابیں اٹھا کر باہر کی طرف نکل گئی۔

ریتو دروازے پر ہی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”کر دیا نا آج بھی لیٹ۔ کیا کر رہی تھیں اب تک تم۔“ نیرو نے باہر نکلتے ہی ریتو سے شکایتی لہجے میں کہا۔

”ارے میں آئی تھی یار۔ تمہیں پتا ہے وہ دونوں آج پھر چوراہے پر کھڑے تھے۔ میں واپس چلی گئی۔ خواہ مخواہ آج پھر بحث کھڑی کر دیتے۔ کوئی بھروسہ نہیں اس بندر کا۔“ ریتو نے نیرو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔

”کون دونوں؟ کس کی بات کر رہی ہو تم۔“ نیرو نے حیرت سے پوچھا۔

”ارے وہی یار۔ جن کا فون گم ہو گیا تھا بس میں۔ آج پھر یہاں آئے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے ان کے ساتھ؟“ ریتو نے جواب دیتے ہوئے کالج کے سامنے والی سڑک پار کرنے کے لیے دونوں طرف نظر دوڑائی۔ ”اوہ۔ وہ کھڑے ہیں دونوں۔ چل سیدھی چل۔“

دونوں نے تیزی سے سڑک پار کی اور کالج میں گھس گئیں۔

(باقی آئندہ)

منصوبہ
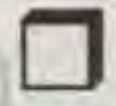
راحیلہ تاج

ماں اک ایسی ہستی ہے جو اولاد خصوصاً بیٹیوں کے لیے کسی چھتنار درخت کے مانند ہوتی ہے اولاد اس کی آغوش اور سائے میں خود کو زندگی کے ہر لمحے میں محفوظ اور پرسکون محسوس کرتی ہے مگر بد قسمتی سے وہ دو بہنیں ماں کی ممتا سے محروم ہوگئی تھیں اور وہ اپنے لیے ماں اور باپ کے لیے زندگی کا ساتھی تلاش کرنا چاہتی تھیں۔

اداس لمحوں کے لیے ایک شگفتہ سی کہانی

"ہاں بھئی تم دونوں کا کیا خیال ہے؟" اس کے ڈیڈی نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے لیے موٹر بوٹ کرائے پر لے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی دونوں بیٹیاں بھی ان کے ساتھ ہوں، کوئی بھی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک کالج میں لیکچرر ہیں۔

"کیا میں اسے چلا سکتی ہوں ڈیڈی؟" کیری نے ان سے پوچھا۔

"ہاں کیری! کیوں نہیں اور ڈیبی تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ چھوٹی بیٹی کی طرف مڑے جو صرف نو سال کی تھی اس نے اپنی رضامندی کا اظہار سر ہلا کر کر دیا تھا۔ وہ تو دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی شے پر بیٹھ کر اپنے ڈیڈی کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر طے ہو گیا۔" ڈیڈی نے اطمینان کا سانس لیا۔

جب سے ان کی ممی کا انتقال ہوا تھا ڈیڈی تمام باتوں میں ان دونوں ہی سے مشورہ لیا کرتے تھے بلکہ خاص طور سے کیری سے ضرور مشورہ کرتے تھے جو چودہ برس کی تھی اور اس موقع پر بھی انہوں نے اس کی رضامندی معلوم کی تھی۔

یہ ہی ایک واحد خاندان نہیں تھا جو اپنی چھٹیاں کسی موٹر بوٹ پر سمندر میں گزار رہا تھا کیونکہ جیسے ہی پہلا دن گزرا ان کی موٹ بوٹ کے علاوہ بھی مختلف سائزوں اور شکلوں میں موٹر بوٹس ان کے اطراف میں نظر آنے لگیں۔ خاص طور سے ایک موٹر بوٹ تو ہر وقت تقریباً ان کے ساتھ ہی ساتھ رہتی۔ یہ بات کیری نے بہت اچھی طرح محسوس کی اس موٹر بوٹ میں دو عورتیں تھیں جو موقع ملتے ہی کیری اور ڈیبی سے بچوں کی طرح باتیں کرنے لگتی تھیں اور یہ بات کیری کو پسند نہیں تھی۔

"یہ عورتیں ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔" کیری نے ایک روز شکایت آمیز لہجے میں اپنے ڈیڈی سے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ رہنے میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔" ڈیڈی نے جواب دیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی طرح بڑے اور مضبوط انسان کی موجودگی میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں گی؟" کیری نے پوچھا اور اس کے ڈیڈی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر رفتہ رفتہ کیری اور ڈیبی کی دوستی ان عورتوں سے ہو گئی جو ان کے قریب رہنے والی موٹر بوٹ میں

تھیں۔ ڈورس اور ہلری کیری کی نظر میں، بہنوں سے بھی بڑھ کر محبت کرتی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ وہ ماں بیٹیاں ہیں۔ وہ ایک جیسے کپڑے پہنتی تھیں اور ان کے چہروں کو دیکھ کر ان کی عمروں میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

ایک روز چائے کے وقت انہوں نے ڈیبی کو اپنی موٹر بوٹ پر بلا لیا اور وہ آئس کریم کے لالچ میں ادھر جانے پر رضامند ہو گئی پھر جب وہ واپس آئی تو خوش ہو ہو کر اس نے کیری اور ڈیڈی کو بتایا کہ ان کی آئس کریم کتنی مزے دار تھی وہ اپنی آئس کریم سے ان کی آئس کریم کا مقابلہ کر رہی تھی جو ہلری اور ڈورس کے ساتھ کھا کر آئی تھی۔

"ڈیبی! اگر ہمارے پاس اپنی موٹر بوٹ ہوتی تو کتنا لطف آتا۔" ڈیڈی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید۔" کیری نے بے پروائی سے کہا اور ڈیبی کو دیکھنے لگی

"اگر ہمارے پاس اپنی موٹر بوٹ ہوتی تب نا۔"

"چلو کوئی بات نہیں اس کا بھی انتظام کر دیں گے۔ اب تم دونوں کے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔" ڈیڈی نے ہنستے ہوئے کہا اور کیری اٹھ گئی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اس کی وجہ ایک تو تھکا دینے والا دن تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ڈیبی سے ہلری اور ڈورس کے بارے میں مزید باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ڈیبی کو ساتھ لے کر اپنے کیبن میں چلی گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" کیری نے اطمینان سے بستر پر بیٹھتے ہوئے ڈیبی سے پوچھا۔

"ہوں۔"

"ہمارے پڑوسیوں کے بارے میں۔" کیری کا اشارہ ہلری اور ڈورس کی طرف تھا لیکن ڈیبی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ تو سو چکی تھی اور کیری بڑی دیر تک اکیلی لیٹی سوچتی رہی تھی کہ اسے آج کے دن خاص طور سے ہلری اور ڈورس کی توجہ اپنی طرف زیادہ نظر آئی۔ اسے آج ڈورس نے بتایا تھا کہ ہلری کے شوہر کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی بوٹ میں ہلری کے ساتھ گھومنے دور تک جائے گا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا تھا کیونکہ اسے ایک موذی مرض نے آ گھیرا تھا اور وہ اپنی یہ خواہش دل میں لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

"لیکن اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔" اپنی ماں کے خاموش ہونے کے بعد ہلری نے اداسی سے کہا تھا اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی اس کے چہرے پر ہر وقت اداسی رہتی تھی اور وہ بہت دھیمی اور صاف آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی لیکن زیادہ تر وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ اس نے اپنی انگلی میں سونے کا ایک چھلا پہنا ہوا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے شوہر کا تذکرہ نہیں کیا شاید اس کی خاموشی کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کرتی تھی۔ کیری کا خیال تھا کہ وہ ڈیبی کو بہت چاہتی ہے اور اس کے لیے گھر کا سا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

❁......☆......❁

کیری کو یاد تھا کہ موٹر بوٹ کرائے پر لینے کی خواہش اس کی تھی اور یہ خیال اسے اپنے اسکول میں ایک سبق پڑھتے ہوئے آیا تھا اور جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے ڈیڈی سے کیا تھا تو انہوں نے اس کی بات مان لی تھی۔

"ہوں! سیر کے لیے تو بہت اچھی اچھی جگہیں ہیں۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ہم چلیں گے۔" انہوں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا پھر انہوں نے اپنے کالج کی لائبریری سے کیری

کو بہت سی کتابیں لا کر دی تھیں۔
"پھر تم نے کیا سوچا؟" انہوں نے چند روز بعد کیری سے پوچھا۔
"کیوں نہ ہم پہلے کوئی اچھی سی موٹر بوٹ دیکھ لیں؟" کیری نے جواب دیا۔
جب سارا پروگرام ترتیب پا گیا تو کیری اپنے ڈیڈی کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔
"آپ چاہتے ہیں کہ ہم ہاں کر دیں؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری خواہش تھی کیری!" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور کیری کو ان کی اس بات سے اتفاق تھا۔ کیری بڑی دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی پھر اسے نیند آ گئی تھی۔
صبح جب اس کی آنکھ کھلی اور وہ ڈیک پر آئی تو اسے خیال آیا کہ اس کے ڈیڈی ناشتے کے لیے کچھ تیار کر رہے ہوں گے لیکن وہ وہاں نہیں تھے۔ اس نے اورنج جوس کا ڈبا الماری سے نکالا تو اس کے ڈیڈی کی آنکھ کھل گئی جو قریب ہی بستر پر سو رہے تھے۔
"ہیلو کیری! تم جلدی نہیں اٹھ گئیں؟ کیا رات تمہیں نیند اچھی طرح نہیں آئی تھی؟" انہوں نے کہا اور اسی وقت ڈیبی ان کے پاس آ کر لیٹ گئی اور کیری ان دونوں کو لڑتا چھوڑ کر اپنے کیبن کی طرف چلی آئی۔ جہاں اس نے کیتلی میں چائے کا پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیا تھا۔
"آپ دونوں اٹھ جائیں آدھا دن گزر گیا ہے اور آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔" کیری نے آواز لگائی۔
پھر ناشتا کرنے کے کافی دیر بعد تک بھی کیری نے محسوس کیا تھا کہ ڈیڈی موٹر بوٹ اسٹارٹ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور ان کی توجہ پڑوس میں کھڑی موٹر بوٹ کی طرف تھی۔
"اگر وہ چاہیں گی تو ہمارے پیچھے آ جائیں گی۔" کیری نے کہا اور ڈیڈی اس کی طرف دیکھنے لگے اور پھر مسکرا کر کھڑے ہو گئے۔
"او کے! موٹر بوٹ تم اسٹارٹ کرو۔" انہوں نے کہا۔ "لیکن ذرا احتیاط سے کہیں موٹر بوٹ کو دوسرے چھوٹے جہازوں اور موٹر بوٹس کے درمیان پھنسا مت دینا۔"
پھر کیری نے بڑی احتیاط سے موٹر بوٹ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تھی اور ابھی زیادہ دور نہیں لے گئی تھی کہ ڈیڈی نے پھر رکوا دیا۔
"کیوں نہ کافی پی لی جائے۔" انہوں نے کہا۔
"کیا آپ واقعی کافی پینا چاہتے ہیں؟" کیری نے پوچھا۔
"میرے خیال میں ہمیں کوئی ٹرین تو پکڑنی ہے نہیں جو دیر ہو جائے گی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور کیری نے نہ چاہتے ہوئے بھی موٹر بوٹ روک دی اور کافی بنانے لگی۔ اس نے کئی بار اپنے ڈیڈی کو دور سمندر میں پیچھے کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ وہ ڈورس اور ہلری کی موٹر بوٹ کا انتظار کر رہے تھے لیکن کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

۞......☆......۞
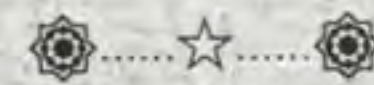
وہ ایک لائبریرین ہے۔ ڈورس نے بڑے فخر سے کیری کو یہ بات بتائی تھی اور خود بھی پڑھی لکھی ہے۔ انہوں نے ہلری کو دیکھتے ہوئے کہا اور اب کیری کو خیال آیا کہ کہیں اس کے ڈیڈی ہلری میں دلچسپی تو نہیں لے رہے ہیں۔
"ارے کیری! تم نے میری کافی میں چینی بہت ڈال دی ہے۔" اس کے ڈیڈی نے کہا تو وہ خیالات کی دنیا سے نکل آئی۔

"معافی چاہتی ہوں ڈیڈی! میں کچھ سوچ رہی تھی، میں آپ کو دوسری کافی بنا دیتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"رہنے دو یہ ٹھیک ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
"کیری کو خیال آیا کہ اس نے اپنے ڈیڈی کو بھی بہت عرصے بعد اتنا خوش دیکھا ہے۔ جب سے اس کی ممی کا انتقال ہوا تھا اس کے ڈیڈی بجھے بجھے رہنے لگے تھے۔
"کیا دوبارہ آگے چلنے کا ارادہ ہے؟" ڈیڈی نے کیری سے پوچھا۔
"کوئی جلدی نہیں ہے۔" کیری نے جواب دیا۔ "میں تھوڑی دیر اور یہاں رکوں گی۔"
"ٹھیک ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔
اور وہ دونوں کافی دیر تک بڑے غور سے پیچھے سمندر میں دیکھتے رہے تھے پھر انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیری کو دور ہی سے ہلری کی موٹر بوٹ کا رنگ سورج کی روشنی میں چمکتا ہوا نظر آ گیا تھا۔
"کیا انہیں بھی کافی دیں گے ڈیڈی؟" کیری نے پوچھا اور پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کافی نکالنے لگی تھی پھر جب وہ لوگ کیری کی موٹر بوٹ کے قریب آئے تھے تو ڈورس نے ڈیبی کو اپنی موٹر بوٹ میں بلا لیا اور کیری نے انہیں کافی پیش کی تھی۔
"ہمیں کسی دکان کی تلاش ہے ہم کچھ شاپنگ کرنا چاہتے تھے۔" ڈورس نے کہا۔
"قریب ہی ایک قصبہ ہے جہاں دکانیں ہیں ہمیں بھی کچھ شاپنگ کرنا تھی۔" کیری کے ڈیڈی نے کہا۔
"ڈیڈی! میں دوپہر کا کھانا تیار کر لوں گی۔" کیری نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور پھر ڈورس کی طرف مڑ گئی۔
"میں آپ کی موٹر بوٹ پر بھی نظر رکھوں گی۔" اس نے مزید کہا پھر ڈیڈی ہلری اور ڈورس کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تھے اور موٹر بوٹ میں کیری اور ڈیبی تنہا رہ گئی تھیں۔
انہیں خدا حافظ کہنے کے بعد کیری کافی دیر تک بے مقصد کھڑی رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ ہلری اب خوش ہو گی پھر وہ دوپہر کے کھانے میں مصروف ہو گئی تھی جلد ہی وہ لوگ بھی واپس آ گئے اور دونوں موٹر بوٹس ایک ساتھ ہی اسٹارٹ کر دی گئی تھیں۔ اس رات ڈورس نے کیری، ڈیبی اور اس کے ساتھ ڈیڈی کو اپنی موٹر بوٹ پر رات کے کھانے کی دعوت دی اور کیری نے اپنے ڈیڈی کے خیال سے اس دعوت کو قبول کر لیا پھر جانے سے پہلے اس کے ڈیڈی نے ان دونوں بہنوں کو بہت سی ہدایات دی تھیں جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ دونوں بہت اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں گی۔ کھانے کے دوران کیری نے جو بات شدت سے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے ڈیڈی کھانے میں کم اور ہلری میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔
آدھی رات ہو چکی تھی جب کیری اور ڈیبی اپنی موٹر بوٹ میں پہنچیں۔ ڈیبی اتنی تھک گئی تھی کہ اس نے بستر پر لیٹنے کے بعد کیری کو شب بخیر بھی نہیں کہا اور لیٹتے ہی سو گئی۔

۞......☆☆☆......۞
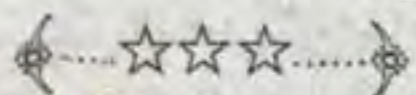
"ایک بات بڑی عجیب ہے۔" کیری نے کہا۔
"کیا بات ہے؟" ڈیبی نے پوچھا۔
"ہلری کے شوہر کا کسی نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔"

اس کی انگلی میں تو شادی کی ایک انگوٹھی موجود ہے۔" کیری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہوسکتا ہے وہ انگوٹھی اس کی عادت بن گئی ہو۔"

اس کے بعد کیری نے اپنے ڈیڈی پر نظر رکھنا شروع کردی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اس کے ڈیڈی ضرورت سے زیادہ ہی ہلری میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہلری دوبارہ دکھی ہو۔ اسی وقت ڈیبی نے کروٹ لی۔

"کیا تم جاگ رہی ہو ڈیبی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" ڈیبی نے جواب دیا۔

"سنو!" کیری نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا اور پھر اسے ساری بات سمجھادی۔ ڈیبی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

"ڈیبی! تم سن رہی ہو نا؟"

"ہاں!" اس نے پھر جواب دیا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" ڈیبی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ڈیڈی تمہاری مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اچھا ایسا کرو۔" کیری نے کہا اور اپنا بنایا ہوا منصوبہ ڈیبی کو بتادیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"شش......" کیری نے اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ منصوبہ کام نہیں کرے گا۔" ڈیبی نے کہا۔

وہ تفریحی چھٹیوں کا آخر دن تھا۔ ڈیبی منصوبے کے مطابق ہلری اور ڈیڈی کے درمیان چہکتی پھر رہی تھی اور کیری اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہورہی تھی۔ اس روز بھی ڈروس نے کھانے پر ان کو بلایا ہوا تھا۔

"اگر تم ڈورس کے ساتھ اس کی موٹر بوٹ پر رہو اور کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہو تو اپنے منصوبے پر آسانی سے عمل ہوسکتا ہے۔" کیری نے ڈیبی کو سمجھایا۔

"پھر جب تم پانی میں چھلانگ لگاؤ گی تو ہلری تمہیں بچانے کے لیے تمہارے پیچھے ہی پانی میں کود جائے گی وہ نہیں جانتی کہ تم مچھلی کی طرح تیر سکتی ہو۔ وہ تمہاری زندگی بچانے کی کوشش میں ڈیڈی سے قریب آسکتی ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں نہیں ملاسکتی۔" کیری کے سمجھانے پر ڈیبی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"احتیاط سے کام کرنا کسی کو شبہ نہ ہوجائے۔" کیری نے پھر تاکید کی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کیری اور اس کے ڈیڈی اپنی موٹر بوٹ میں واپس جانے کے لیے کھڑے ہوگئے اور ڈیبی قریب کی کرسی پر بیٹھی سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

"اسے ہمارے پاس ہی چھوڑ جاؤ۔" ڈورس نے کہا اور ڈیبی کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ "میں اس کا خیال رکھوں گی۔" کیری جانتی تھی کہ ڈیبی اداکاری کررہی ہے وہ حقیقت میں نہ تو اتنی تھکی ہوئی ہے اور نہ ہی اسے نیند آرہی تھی۔

دونوں موٹر بوٹس ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ کیری کے ڈیڈی اپنی موٹر بوٹ کے انجن روم میں موجود تھے کیری نے نیچے جھانک کر دیکھا سمندر کا مٹیالا پانی موٹر بوٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا پھر اس نے برابر کی موٹر بوٹ میں لیٹی ڈیبی کی طرف دیکھا جو نیند میں جھوم رہی تھی اور وہ سوچنے لگی کہ اس نے یہ منصوبہ بناکر کوئی غلطی تو نہیں کی ہے۔

اسی وقت ڈیبی نے پانی میں چھلانگ لگادی اور ڈورس زور سے چیخی۔

"موٹر بوٹ روکو۔" اس کے ساتھ ہی ہلری نے ڈیڈی کو آواز دی تھی اور وہ پانی میں کود گئے تھے پھر ڈیبی کو اوپر لایا گیا تھا۔ اس کے پیٹ میں پانی بھر گیا اور وہ خوف زدہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی تبھی ڈیڈی نے اسے سینے سے لگالیا تھا کیری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی پھر وہ دوڑ کر ڈورس سے یوں لپٹ گئی جیسے اس سے کبھی جدا نہیں ہوگی۔

ہلری نے صورت حال کو سنبھال لیا۔ اس نے ایک نرم تولیہ میں ڈیبی کو لپیٹ کر گود میں بٹھایا ہوا تھا پھر اس نے ڈیبی کو گرم گرم چائے پلائی تھی اور اس کے کپڑے بدلے تھے اس وقت کیری کو ہلری بہت اچھی لگی تھی۔ وہ دونوں اب محفوظ تھیں کچھ دیر بعد ڈیبی سوگئی تھی اور ڈورس اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

اس واقعے کے بعد کیری کو ہلری اور زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

"چائے کی پتی ختم ہوگئی ہے ڈیڈی! آپ قصبے کی دکان سے اور لے آئیں۔" کیری نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ڈیڈی ہلری کو ساتھ لے کر قصبے کی دکان پر چلے گئے پھر چند گھنٹوں بعد وہ واپس آگئے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں کیری! ہمیں دیر ہوگئی۔" اس کے ڈیڈی نے موٹر بوٹ پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں چائے کی پتی لے آیا ہوں۔" اس کے ڈیڈی نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہلری اور ڈورس ڈیبی کے پاس گئی ہیں۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اور کیری سوچنے لگی کہیں انہیں اس کے منصوبے کے بارے میں تو علم نہیں ہوگیا؟ لیکن یہ ممکن نہیں تھا پھر اس کے ڈیڈی اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"کیری؟"

"جی ڈیڈی!" اس نے کہا۔

"تم ہلری اور میرے بارے میں حیران تو ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ شاید مجھے تمہارے سامنے کسی قسم کی وضاحت کرنا پڑے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے ڈیڈی!" کیری نے کہا اور اس کے ڈیڈی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"ہلری میرے کالج کی لائبریری میں کام کرتی ہے میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں میرا مطلب تم سمجھ رہی ہوگی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں ہماری چھٹیاں یہاں گزارنے کا بھی یہی مقصد تھا نا؟" کیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تمہاری خواہش کے مطابق......"

"میں جانتی ہوں۔" کیری نے کہا۔

"ہلری تم دونوں سے ملنا چاہتی تھی تاکہ آئندہ زندگی میں اسے تمہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔" ڈیڈی نے کہا اور کیری سوچنے لگی کہ اگر اس کے ڈیڈی اس کے منصوبے کے متعلق نہیں جان سکے ہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا وہ ہلری کو آئندہ کسی بھی موقع پر یہ بات بتاسکتی ہے ہلری تو اب اس کے قریب ہی رہے گی اس کی ممی کی جگہ پر۔

❖

انتخاب

انجم فاروق ساحلی

فن کار سچے اور باکردار ہوتے ہیں۔ ان کا اندر اور باہر یکساں ہوتا ہے مگر اس کا واسطہ ایک ایسے انسان سے پڑ گیا تھا جو فنکاروں کو نکما اور چالباز تصور کرتا تھا۔
ایک ایسے شخص کا قضیہ وہ اپنے تجزیہ کو حرف آخر قرار دیتا تھا۔

محبت کرنے والوں کے لیے بطور خاص ایک ہلکی پھلکی دلچسپ کہانی

"وہ خوب صورت ہے لیکن؟ نہ سلیقے سے لباس پہنتا ہے نہ ڈھنگ سے بال سنوارتا ہے۔ بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ اکثر سوچوں میں گم رہتا ہے۔ ایسے آدمی کو میں اپنے داماد کے طور پر کیسے قبول کرسکتا ہوں۔ اسے سوسائٹی میں کیسے متعارف کرواسکتا ہوں۔ عالیہ بیٹی! تم میری اکلوتی اولاد ہو۔ میرا گارمنٹس ایکسپورٹ کا کاروبار سنبھالنے کے لیے حاضر دماغ، ہوشیار اور تیز طرار نوجوان کی ضرورت ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری پسند میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔ شہزاد محض ایک معمولی مصور ہے ہوسکتا ہے وہ مصور لوگوں کے لیے پسندیدہ ہو اور اپنے فن کی وجہ سے تھوڑا بہت مقبول بھی ہو لیکن محض مقبولیت سے کہیں پیٹ بھرتا ہے اور پسندیدگی سے کہیں اخراجات چلتے ہیں۔ تمہارے چاہنے والے کا کھنڈر نما مکان بہت بے ڈھنگا اور بدصورت ہے۔"

"لیکن ڈیڈی! اس کا دل بہت خوب صورت ہے اور انسان کی پہچان مکان سے نہیں باطن سے ہوتی ہے۔" اب تو عالیہ جیسے پھٹ پڑی۔ ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ "وہ اپنے اس آبائی مکان کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بارشوں سے رنگ و روغن تو اتر ہی جاتا ہے اور آتش زدگی سے مکان کا کچھ حصہ اگر جھلس گیا تو کون سی قیامت آگئی۔" عالیہ سانس لینے کے لیے رک گئی۔

"عالیہ بیٹی! مجھے تسلیم ہے وہ تینوں ذمہ دار ثابت نہیں ہوتے لیکن دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں۔ تمہارے لیے کوئی اور اچھا رشتہ ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں۔ صرف میرے ایک اشارے کی دیر ہے لیکن تم اس الجھے بالوں والے کے ڈربے میں کیوں بند ہونا چاہتی ہو۔ وہ کسی لحاظ سے بھی تمہارے لائق نہیں۔ وہ تمہیں زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتا۔ سوسائٹی میں میری عزت ہے، وقار ہے، میری ناک کٹ جائے گی۔ اگر مرزا صاحب کا بیٹا تمہیں پسند نہیں آیا تو کوئی بات نہیں۔ میرے بچپن کے دوست شفقت علی کا بیٹا سلیمان جو حال ہی میں لندن سے آیا ہے۔ وہ گریجویٹ ہے اور لندن میں ایک بڑی ڈیکوریشن پیس میکر کمپنی میں سیلز منیجر تھا۔ وہ کاروباری اور عملی آدمی ہے اس کا مستقبل روشن ہے۔ آخر میرے کاروبار کو ایک ذہین نوجوان کی ضرورت ہے۔" شوکت مرزا نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ وہ بحث سے جھنجلا گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان کے چہرے پر اشتعال کی سرخی چھانے لگی تھی۔

"ڈیڈی! میں اپنا انتخاب کرچکی ہوں اور مجھے اب کسی اور کی طرف دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" عالیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" شوکت مرزا نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں ابا حضور! بالکل آخری اور حتمی۔" عالیہ نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور ایک جھٹکے کے ساتھ ناشتے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ جذبات کے اتار چڑھاؤ سے اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ شوکت مرزا نے

بھی اسے نہیں روکا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کالج جانے کے لیے گیراج کی طرف نکل گئی۔

☆

"آج کل کی لڑکیوں سے خدا بچائے۔ ایک جوان بیٹی کا باپ ہونا بڑی مصیبت ہے۔ ہر بات میں ضد، ہر کام میں من مانی، ہر لمحے خود پسندی اور دھونس جمانے کی عادت اور اگر انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی جائے تو پسماندہ، دقیانوسی اور رجعت پسندی جیسے الفاظ سننے کو ملتے ہیں۔ عالیہ کو تعلیم اور آزادی نے خودسر بنادیا ہے۔ وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ ماں باپ کی پسند کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔" سیٹھ شوکت نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"میں اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" بیگم شوکت نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بے کار ہے بیگم!" سیٹھ شوکت نے جھلاہٹ کے انگارے چباتے ہوئے کہا۔ "اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔" سیٹھ شوکت مرزا سسک کر بولے اور پھر بیگم کے اصرار کے باوجود ناشتا چھوڑ کر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ بیگم شوکت سامنے دیوار پر آویزاں عالیہ کی تصویر کو گھورنے لگیں۔

☆

فن کدے میں داخل ہوتے ہی عالیہ مسرت سے کھل اٹھی۔ جیسے کسی سرسبز شاخ پر اچانک ایک گلاب کھل اٹھے۔ یونیورسٹی سے واپسی پر وہ سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر ادھر چلی آئی تھی۔ گھر اس نے فون کردیا تھا کہ وہ رات کو دیر سے لوٹے گی۔ سامنے ایزل پر اس کا تصویری خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک خوب صورت باغ میں کھڑی تھی۔ شہزاد خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ پس منظر میں آبشار، گھنے درخت اور پھول دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی انگلیاں ماہرانہ انداز میں رنگوں سے کھیل رہی تھیں۔ عالیہ بھی کچھ دور پڑی کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھ گئی۔ شہزاد اس وقت تصویر کے رخساروں پر گلابی رنگ مکس کررہا تھا۔ عالیہ شرم سے دہری ہوگئی اور اسے اپنے رخساروں میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔ شہزاد کی نگاہ کام کرتے کرتے بار بار عالیہ کے چہرے کی طرف اٹھنے لگی تو اس نے مسکرا کر برش رکھ دیا۔ چند منٹ تک ان کے درمیان رسمی باتیں حال احوال کا تذکرہ ہوتا رہا پھر یکا یک گہری سنجیدگی نے شہزاد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"یہ اچانک تمہارا رنگ کیوں اڑ گیا ہے؟" عالیہ نے شہزاد کے بکھرے ہوئے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں رات میں نے خواب میں دیکھا۔ میرے گھر کو آگ کے مہیب شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میرے کمرے کے چاروں طرف آگ لگی ہے۔ تپش اور آنچ بڑھتی جارہی ہے۔ میرا برا حال ہوگیا ہے، بچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔" شہزاد نے مضطرب لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر اضمحلال چھا گیا۔

"خوابوں کی باتوں کا اتنا گہرا اثر نہیں لیتے ڈیئر!" عالیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خوابوں میں حقیقت نہیں ہوتی۔"

"لیکن یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک آگ ہر وقت تمہارے اردگرد موجود رہتی ہے اور اس کے شعلے کسی وقت بھی مجھے اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔"

"کیسی آگ......؟" حیرت سے عالیہ کا منہ کھل گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔

"معلوم ہوتا ہے جناب کی ذہنی رو آج کل بہک گئی ہے جو الٹی سیدھی باتیں اور ڈراؤنے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔" عالیہ نے ترش روی سے کہا۔ شہزاد نے سکوت توڑا۔

"دولت کی آگ عالیہ! یہ ہر وقت ہمارے درمیان حائل ہے، میں اس دیوار کو پھلانگنے سے قاصر ہوں۔"

"لیکن دریا تو مشترک ہی ہوتا ہے۔" عالیہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"عالیہ! گزشتہ ملاقات میں تمہارے ڈیڈی نے بظاہر بااخلاق ہونے کا اچھا مظاہرہ کیا تھا لیکن باتوں ہی باتوں میں انہوں نے مجھے میری حیثیت کے ترازو میں بھی کھڑا کرکے اپنی جاہ و حشمت کی طرف واضح اشارہ کردیا تھا۔ وہ تمہیں شہزادی کی مانند کسی شہزادے کے ساتھ رخصت کرنا چاہتا ہے، جس کی زندگی دولت سے جگ مگ جگ مگ کررہی ہو۔ میں تمہاری زندگی میں سیاہ رات کی مانند ہوں۔" شہزاد سانس لینے کے لیے رکا تو عالیہ فوراً بول اٹھی۔

"یہ فرسودہ اور جذباتی باتیں چھوڑو۔ ہمیں نئے زمانے میں ان پرانی باتوں، روایتوں اور زنجیروں کو ہی توتوڑنا ہے، جس میں انسان بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ آج کل بہت اچھی رومینٹک فلم لگی ہوئی ہے، چلو وہ چل کر دیکھیں فلم لمبی ہے، آٹھ بجے شروع ہوجائے گی، میں نے دو ٹکٹ منگوا لیے تھے۔" عالیہ نے دونوں ٹکٹ نکال کر لہرائے۔

"تم لیٹ ہوجاؤ گی اور تمہارے پاپا اور ممی خفا ہوں گے۔" شہزاد نے متردّد ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری! تم بالکل نہ گھبراؤ۔" عالیہ جلدی سے بولی۔

"آج سر میں درد ہے پھر کبھی چلیں گے۔" شہزاد نے دوسرا عذر پیش کیا۔

"اب چھوڑو یہ نخرے بازی۔" عالیہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

❁......☆......❁

فلم ختم ہوئی دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے خوش گوار موڈ میں کار میں آکر بیٹھ گئے۔ عالیہ نے کسی فلمی ہیروئن کی مانند چابی اگنیشن میں داخل کرکے گھمائی، گھرگھراہٹ کی آواز ابھری لیکن گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ عالیہ کے چہرے پر شکنیں پڑگئیں، عالیہ نے پارکنگ کے ٹھیکیدار سے اپنی مشکل بیان کی، ٹھیکیدار نے دو تین نوکروں کو آواز دے کر بلایا اور دھکا لگانے کا اشارہ کیا۔ گاڑی دھکے سے چلتی مین روڈ پر آگئی لیکن اس نے اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیا۔ اب تنگ آکر عالیہ نے ایک نزدیکی ورکشاپ کی طرف پیغام بھیجا اور خود گاڑی سے باہر نکل کر بونٹ اٹھا کر اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت شوکت مرزا کی کار کے بریک چرچرائے اور گاڑی قریب آکر رک گئی۔ شہزاد پہلے تو حواس باختہ ہوگیا پھر اخلاقی طور پر ہکلاتا ہوا آگے بڑھا۔

"جج...... جناب...... شوکت مرزا صاحب...... آیئے...... آیئے۔" شوکت مرزا نے ایک جلتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر چونک کر بونٹ سے ہٹتی ہوئی عالیہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے، وہ منہ سے کچھ نہ بولے ان کی آنکھوں میں سوال تھا۔ ان کی نگاہ گھڑی پر جم گئی، رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے چند لمحے خاموش نگاہیں ٹوٹتی رہیں پھر عالیہ نے جرأت کرتے ہوئے سچ بول دیا۔

"ڈیڈی! ہم دونوں "ٹائی ٹینک" دیکھ کر گھر جانا چاہتے تھے کہ گاڑی نے آج پہلی مرتبہ دھوکا دے دیا۔ اسے صبح شوروم پر بھیج کر نئی گاڑی منگوا دیجیے۔"

"ہاں...... ہاں...... ضرور کیوں نہیں، ہمیں اپنی بیٹی کی تکلیف ایک پل کے لیے بھی گوارہ نہیں۔" شوکت مرزا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اس وقت مستری بھی آپہنچا اس نے معائنہ کیا اور کہا کہ نقص گہرا ہے مکمل معائنے کے لیے ورکشاپ لے جانا ہوگا۔ چنانچہ عالیہ اور سیٹھ شوکت نے اسے گاڑی لے جانے کا اشارہ۔ وہ اب وہ سیٹھ شوکت کی گاڑی میں سوار ہوئے۔ شہزاد نے پچھلی نشست پر بیٹھنا پسند کیا۔ عالیہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ اگلی سیٹ پر چلی گئی۔ ورکشاپ میں گاڑی کھڑی کرکے سیٹھ شوکت نے گاڑی کا رخ مال روڈ کی طرف موڑ دیا۔ لمحاتی سکوت کے بعد اچانک وہ اپنی بیٹی عالیہ سے مخاطب ہوگئے۔

"بیٹی بے خوابی اور ڈپریشن بڑھتا جارہا ہے۔

رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ خوف، وہم...... مجھے اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ بلڈ پریشر بھی ہائی رہنے لگا ہے۔" سیٹھ شوکت نے پیشانی سے سردی کے باوجود ننھی ننھی بوندیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت گاڑی مال روڈ کے ایک سرخ سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ شہزاد سکتے کی کیفیت میں باپ بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ابھی تک مسٹر شوکت کی آنکھوں سے نکلنے والے تیروں سے گھائل سکڑا سمٹا سلگ رہا تھا۔

"ہاں ڈیڈی! آپ کو رات رات بھر نیند نہیں آتی؟ شاید اس لیے کہ آپ ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں۔ ایک آزاد اور ماڈرن لڑکی کے باپ، جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مری گھومنے پھرنے نکل جاتی ہے، اپنے دوست کے ساتھ سینما سے نکل کے رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی ہے۔" شوکت مرزا خاموش رہے۔ شہزاد اس کی بے باکی پر چونک پڑا۔ "لیکن ڈیڈی رات کتنی ہی گہری اور تاریک کیوں نہ ہو یہ آپ کی بیٹی کی عصمت کو نہیں ڈس سکتی۔"

چند لمحوں کے لیے پھر گاڑی میں سکوت طاری ہوگیا۔

شوکت مرزا نے اندر ہی اندر سلگتے ہوئے گاڑی چلا رہے تھے

شہزاد کے کانوں میں عالیہ کے ڈیڈی کی باتیں ابھی تک اس کے دل میں چنگاریاں اڑا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وہ اپنا گھر، علاقہ اور شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے لیکن خدا نہ کرے اگر عالیہ کو کچھ ہوگیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرسکے گا۔

❁......☆......❁

رات کے پچھلے پہر عالیہ کی والدہ نے اس کی خوب خبر لی لیکن ضدی اور خودسر عالیہ برابر شہزاد کی طرف جھکتی چلی گئی۔ وہ کسی پابندی اور روک ٹوک کو خاطر میں نہیں لارہی تھی۔ دوسری طرف شوکت مرزا اور ان کے دوست کے بیٹے سلیمان میں قربت بڑھتی جارہی تھی۔ دونوں میں خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ سلیمان نے شوکت مرزا کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ ہر بات میں ان کی ہاں میں ہاں ملانا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ عالیہ کو یہ بے جوڑ دوستی اور قربت بُری طرح کھل رہی تھی۔ سلیمان نے اسے بھی ہر طرح سے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عالیہ نے اسے مکمل طور پر مسترد کردیا۔ اتوار کے دن شوکت مرزا اور سلیمان کے درمیان شطرنج کی بازیاں بھی جمنے لگی تھیں۔ شوکت مرزا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی سلیمان کی ذات میں گم ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن عالیہ چیخ اٹھی کہ "اس سے کہیں کہ اب یہاں قدم نہ رکھے۔" لیکن شوکت مرزا نے کوئی جواب نہ دیا اور خالی خالی نگاہوں سے اسے گھورتے رہے۔

❁......☆......❁

سیٹھ شوکت مرزا بل ادا کرکے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ چکے تھے۔ خوب صورت اور وجیہہ سلیمان ہلکی بلو جینز اور گلابی شرٹ میں کچھ زیادہ ہی پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی انگلیاں ہولے ہولے سر کے سنہرے بالوں میں کنگھا کررہی تھیں۔ شوکت مرزا نئے سال کی تیاری کے سلسلے میں خریداری میں مصروف تھے وہ ہر سال اپنے کاروباری دوستوں کو نئے سال کی خوشی میں اپنے گھر مدعو کیا کرتے تھے۔ سیٹھ شوکت نے اگنیشن میں چابی داخل کرکے گھمائی لیکن گاڑی گھرر گھرر کی آواز کے ساتھ بند ہوگئی۔ یہ وہی گاڑی تھی جو عالیہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ سیٹھ شوکت کی مزید کوششوں میں سے ایک بھی بارآور ثابت نہ ہوئی۔ اب سلیمان آگے بڑھا اور بونٹ اٹھا کر تاروں اور پرزوں میں الجھ گیا لیکن جلد ہی اس نے وہ چھوٹا سا نقص ڈھونڈ نکالا جو حرکت میں مانع تھا۔ اس نے سیٹھ صاحب کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ اب گاڑی فوراً چالو ہوگئی اور سلیمان مسکراتا ہوا برابر والی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔

"تم ایک ذہین اور عملی آدمی ہو، اسی لیے میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔"

"بس آپ کی نظر کرم ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" سلیمان نے سر جھکالیا۔
"نہیں تم ہر لحاظ سے ترقی پرور اور کامیاب انسان ثابت ہوگے۔"
"میں عمر بھر آپ کے احسانات کا بوجھ نہیں اتار سکتا۔ آپ نے تو مجھے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اتنی محبت، شفقت اور مروت تو آج اپنے گھر میں بھی نہیں ملتی جو آپ نے مجھ پر نچھاور کردی ہے۔" دونوں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے مارکیٹ سے نکل کر وحدت روڈ پر آگئے لیکن جیسے ہی گاڑی نے ملتان روڈ کی طرف اقبال ٹاؤن پہنچنے کے لیے موڑ کاٹا۔ سیٹھ شوکت کا ہاتھ اسٹیرنگ سے بہک گیا شاید سر چکرانے سے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ گاڑی آؤٹ آف بیلنس ہوکر قریب سے گزرتی ایک موٹر سائیکل کو روندھ کر رکھ دیتی اگر سلیمان تیزی سے اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر برقی سرعت سے بریک پر موجود ان کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر دباتا نہ چلا گیا ہوتا۔ موٹر سائیکل سوار خفیف سی ٹھوکر لگتے ہی خوف زدہ نگاہوں سے گاڑی کو دیکھتا اور سیٹھ صاحب کو بولتا ہوا آگے نکل گیا۔
"کیا بات ہوگئی تھی مرزا صاحب!" سلیمان نے چونک کر پوچھا۔
"کیا بتاؤں بیٹے! ایک لڑکی کا باپ ہونا بڑی مصیبت ہے۔" سیٹھ شوکت نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "بیٹے میں ایک بار پھر تمہارا مشکور ہوں، تم انتہائی حاضر دماغ اور پھرتیلے نوجوان ہو، تمہارا مستقبل روشن ہے۔ میں نے کئی بار عالیہ کے سامنے تمہارا تذکرہ چھیڑا لیکن وہ تو یوں منہ بسورنے لگی جیسے دانتوں میں کوئی کڑوا بادام آ گیا ہو۔" سیٹھ شوکت نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔
"کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب! پسند اپنی اپنی ہر شخص اپنی پسند ارادے اور سوچ میں آزاد ہے۔ کب کون کس کا ہو جائے اور کون کس سے دور چلا جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر انسان کی ضرورت اور چاہت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ جو جس قدر زیادہ اہمیت دیتا ہے اس کے چکر میں زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔"
"ماشاء اللہ! کافی ذہین ہو اور فلسفہ بھی جانتے ہو۔" سیٹھ شوکت مرزا مسکرا دیئے۔
"اگر آپ عالیہ کی وجہ سے پریشان ہیں تو عملی طور پر سختی سے کام لیں، صرف زبانی سرزنش آج کے بگڑے ہوئے زمانے میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی پھر اکلوتے پن کا فائدہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ ناز سے پلی ہوئی اولادیں ماں باپ کی سعادت مند نہیں ہوا کرتی ہیں۔ تجربہ یہی کہتا ہے انسان لڑکپن میں جس لائن پر چلنا شروع کردے اس پٹڑی پر چلتا جاتا ہے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔" سیٹھ شوکت نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میں صرف اس لیے سختی سے باز پرس نہیں کرتا کہ کہیں عالیہ ٹوٹ پھوٹ نہ جائے، اس کی زندگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ جس کی خاطر میں نے تمام عمر اپنی جان کو تھوڑا تھوڑا قربان کیا کہیں وہ اچانک کسی قربانی کی زد میں نہ آ جائے۔ سیٹھ شوکت کا فطری جذبہ عود کر آیا۔
سلیمان نے خاموشی اختیار کر لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

❁......☆......❁

ان کے گھر میں نئے سال کی تقریب شروع ہو چکی تھیں۔ دوسری منزل پر آ کر سیٹھ شوکت مرزا نے تجوری والے کمرے کا دروازہ چابی سے کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ داخلی دروازہ انہوں نے بھیڑ دیا، کسی کے اس طرف آنے کا امکان نہیں تھا۔ سب کے سب پارٹی کی دلچسپیوں میں مگن تھے۔ سیٹھ شوکت نے رک کر کمرے پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور کمرے میں موجود ایک آرائشی گملے سے ایک جھٹکے کے ساتھ سامنے موجود دیوار گیر الماری کی چابیاں نکال لیں۔

تجوری الماری کے ایک خانے میں نصب تھی۔ باقی خانوں میں دوسری اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ سیٹھ صاحب نے قریب جا کر تجوری میں چابی لگائی۔ ہینڈل پر دباؤ ڈالا عین اسی لمحے ہلکی سی آواز سن کر سیٹھ شوکت نے مڑ کر دیکھا تو ان کا رنگ اڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے پیچھے دبے پاؤں آنے والے نے کوئی شے اس کی کنپٹی پر دے ماری، سیٹھ شوکت لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ حیرت کا عنصر ابھی تک اس کی آنکھوں میں منجمد دکھائی دے رہا تھا۔

❁......☆......❁

جب سیٹھ شوکت مرزا کو ہوش آیا تو تجوری خالی پڑی تھی، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عالیہ کے لیے بنوائے گئے زیورات کے خالی ڈبے دیکھ کر دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر تیزی سے سلیمان سلیمان پکارتے ہوئے نیچے بھاگا۔ اس کی پھولی ہوئی سانس اور بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر سارے مہمان چونک پڑے اکثر لوگ جا چکے تھے کچھ ابھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سیٹھ شوکت نے اپنے گارڈز اور چوکیدار کو ادھر ادھر بھگایا۔ پولیس کو فون کیے پھر عالیہ کا موبائل نمبر ملایا۔
"ہاں ڈیڈی! بول رہی ہوں۔ فرمائیے! کیا بات ہے آپ تو سلیمان کے ساتھ بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ یکا یک اتنے گھبرائے ہوئے کیوں معلوم ہو رہے ہیں۔" عالیہ نے جدید موبائل کی اسکرین پر باپ کو بدحواس دیکھ کر پوچھا۔
"وہ...... وہ بیٹی! میں بہت شرمندہ ہوں، بہت پشیمان ہوں۔"
"ڈیڈی! کیا بات ہے؟" عالیہ دھک سے رہ گئی۔
"وہ...... وہ...... لٹیرا تھا، ڈاکو تھا، چور تھا۔ وہ تجوری والے کمرے میں میرے پیچھے چلا آیا، میں نے کاغذات رکھنے کے لیے تجوری کھولی، اچانک چھینک کی آواز سنائی دی، میں چونک کر مڑا سلیمان میرے سر پر کھڑا تھا اس نے میری کنپٹی پر کوئی شے مار کر مجھے بے ہوش کر دیا اور میری تجوری سے دس لاکھ روپیہ نقد اور تمہارے جہیز کے بیس لاکھ کے قیمتی زیورات اور جواہرات اڑا کر لے گیا۔ میں اس حرام زادے کی بوٹیاں کتوں کو ڈال دوں گا۔" سیٹھ شوکت غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔
"بیٹی! اب مجھے تمہارے آپس میں ملنے اور آگے بڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔" عالیہ کو اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جلا ہوا سیاہ خوب صورت محل ہو جس کے چہار جانب رنگ برنگ کے پھول مسکرا رہے ہوں۔
"مجھے اب تمہارے انتخاب پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔ فنکار واقعی سچے اور باکردار انسان ہوتے ہیں۔ میں نے جسے تیز طرار اور نیک سمجھا وہ بہت بڑا فراڈیہ نکلا، خیر کوئی بات نہیں بیٹی کے انتخاب کی خوشی مجھے تیس لاکھ روپے میں مل گئی۔" سیٹھ شوکت مرزا نے اپنی بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"ڈیڈی! ایک خوش خبری ہماری طرف سے۔" عالیہ نے چلا کر کہا۔ "ابھی کچھ دیر قبل ایک ڈاکو اپنے بریف کیس سمیت شاید پولیس سے بچتا ہوا شہزاد کے مکان کو ویران سمجھ کر گھسا چلا آیا تھا۔ اس نے شہزاد کو یرغمال بنانے کی کوشش کی لیکن شہزاد کو کبھی جھکنا پسند نہیں، وہ اس مسلح ڈاکو سے بھڑ گیا، میں دوسرے کمرے میں تھی۔ گولی چلی لیکن شہزاد بچ گیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے، شہزاد نے اس وحشی کو چت کر دیا وہ ویٹ لفٹنگ اور مکا بازی کر چکا ہے۔ وہ چور رسیوں سے جکڑا ہوا بے ہوش پڑا ہے اور یہ آپ کے محترم سلیمان صاحب ہیں۔" عالیہ نے بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"ارے ہائیں......!" سیٹھ شوکت کا منہ حیرت اور تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

❁

قسط نمبر 15

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

میں نے ای میل دیکھی اور سمجھ گیا کہ سرمئی نے ای میل بھیج دی ہے پھر میں نے ساری ای میل پڑھی۔ وہ ساری تصاویر دیکھیں' یہ وہ چیزیں تھیں جو نواب نے روشن آراء بیگم کو اپنے ہونے والے بیٹے کے لیے دی تھیں۔

میں نے جیسا سرمئی سے کرنے کے لیے کہا تھا سرمئی نے بالکل ویسا ہی کیا تھا یہ ای میل روشن آراء کی جانب سے بھیجی گئی تھی میں نے مطمئن ہوکر نواب سے کہا۔

''سر! یہ ای میل ابھی ابھی آئی ہے اور کسی روشن آراء بیگم کی جانب سے آئی ہے۔ اس میں کچھ عجیب عجیب سی باتیں لکھی ہیں آپ اسے خود پڑھ لیں۔''

''کیا......؟ روشن آراء کی جانب سے ای میل' دکھاؤ تو کیا لکھا ہے۔'' اس نے بری طرح چونک کر کہا اور تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا اور میل پڑھنے لگا' میل کافی بڑی تھی لکھا تھا۔

''نواب سطوت الاسلام کی خدمت میں ان کی باندی روشن آراء کا بہت بہت آداب و تسلیمات! پتا نہیں حضور کو اپنی یہ باندی یاد بھی ہے یا نہیں۔ برسوں بیت گئے' ہمیں ایک دوسرے سے بچھڑے۔

میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہ آتی اگر...... اگر آپ میری ہونے والی اولاد کے لیے اتنی سفا کی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ اگر بیٹی ہوئی تو آپ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیں گے اور یقیناً اسے مارنے کے بعد آپ مجھے بھی مار دیتے کیوں کہ عورت کی حیثیت تو آپ کے لیے پیر کی جوتی سے بھی حقیر اور کم تر ہے۔

میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میرے بطن میں آپ کا بیٹا پرورش پا رہا ہے اگر میں اس وقت آپ سے یہ جھوٹ نہ بولتی تو آپ اس ننھی اور ادھوری جان کو میری کوکھ میں سلامت ہی نہ رہنے دیتے۔ میں نے آپ سے یہ بات بھی چھپائی تھی کہ میری کوکھ میں ایک نہیں دو بچے پرورش پا رہے ہیں۔

ارے اتنا پڑھ کر ہی آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا ہے۔ اتنا غصہ نہ کریں نواب صاحب! اب آپ جوان نہیں رہے بوڑھے ہوگئے ہیں۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میری کوکھ میں دو بچے تھے اس وقت تو میں نے آپ سے جھوٹ بول کر ان معصوموں کی زندگیاں بچالیں لیکن مجھے دن رات یہی فکر لگی رہتی تھی کہ اگر میرے ہاں بیٹیاں پیدا ہوگئیں اور اگر بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئے تو آپ بیٹی کو مار دیں گے۔ اپنی بیٹی کی موت کا خوف میرے ذہن میں پنجے گاڑھ کر بیٹھ گیا۔

اور پھر اللہ کی قدرت دیکھیے کہ جب آپ دبئی کے دورے پر گئے تو ایک رات اللہ تعالیٰ میرے بچوں کو دنیا میں لے آیا۔ اسپتال میں جان بوجھ کر نہیں گئی تھی' گیٹ پر موجود آپ کے گارڈز کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی' میرے پاس عشرت موجود تھی۔ وہ عشرت جس کی معصوم سولہ سالہ بیٹی آپ کی ہوس کا شکار ہوئی اور آپ کی بیوی نے اس وقت اسے مروا دیا جب اس کی کوکھ میں آپ کے گناہ کا ثمر آ گیا۔ کتنی وفادار بیوی ہے ناں آپ کی' بھئی کیوں نا مروائی اسے خوف ہوگا کہ کہیں نواب کا بیٹا نہ ہوجائے اور ایک کم ذات کی کوکھ سے سید زادہ کیسے جنم لے سکتا ہے۔

ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات مجھے دو بچے عطا کیے' ایک سید زادہ اور ایک سید زادی۔ میں نے عشرت سے کہا کہ اگر میں یہاں رکی تو ایک ظالم باپ اپنی بیٹی کو جان سے مار دے گا اور میں ایک ماں بھلا یہ ظلم ہوتا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میں چاہتی تو آپ کی گود میں بیٹا دے کر آپ کی آنکھ کا تارا بن سکتی تھی' دن رات عیش کرسکتی تھی لیکن...... لیکن میں نے اپنی بیٹی کی جان بچانے کا فیصلہ کیا اور عشرت سے کہلوایا کہ گارڈ سے کہو کہ ہمیں ایمرجنسی میں اسپتال جانا ہے فوراً ٹیکسی لے آؤ جب کہ آپ اسے ہدایت دے کر گئے تھے کہ ایسی کسی صورت میں اسے کسی کو کال کر کے بتانا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا بڑی مشکل سے مانا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے اسے اس قصور کی سزا اس کی جان لے کر دی ہوگی۔ آپ ایسا ہی کرسکتے ہیں۔

میں عشرت کے ساتھ اپنے دونوں بچے لے کر نکلی لیکن گھر سے نکل کر میں نے اس سے کہا کہ اب تم کہیں اور چلی جاؤ میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔

میں برسات کی اس رات میں تنہا بچوں کو لے کر جا رہی تھی' اندھیری رات میں کمزوری اور نقاہت دوسرے بارش کے سبب ٹھوکر کھا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک صاف ستھری جگہ پر پایا۔

معلوم ہوا کہ وہ آپ کی منظور نظر اور مشہور زمانہ سرمئی بائی کا کوٹھا ہے۔ اس عورت نے میرا اور میرے بچوں کا بہت خیال رکھا اور ایک ماہ اس کے پاس رہنے کے بعد میں تمہارے سید زادے اور تمہاری سید زادی کو اس کے حوالے کرکے یہ سوچ کر نکل آئی کہ اگر ایک ظالم شوہر نے اپنی بھگوڑی بیوی کا سراغ لگالیا تو وہ ہی جان سے جائے گی اس کے بچے تو سلامت رہیں گے۔

تمہیں معلوم بھی ہے سید نواب سطوت کہ تمہاری سید زادی کہاں ہے؟

آج وہ بھی ایک نامی گرمی طوائف ہے اور تمہارا سید زادہ نواب سطوت کا ہونے والا گدی نشین ایک طوائف کے کوٹھے پر دلال ہے۔

اب تم تلاش کرسکتے ہو تو تلاش کرلو۔ اپنے بچوں کو تمہیں ایک ایک طوائف کا در جھانکنا ہوگا اور ہر طوائف میں اپنی بیٹی کا چہرہ تلاش کرنا ہوگا۔ سرمئی تو

مر گئی لیکن تمہاری بیٹی کو اپنی جگہ دے گئی۔

دونوں بہن بھائی کو اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ وہ آپس میں بہن بھائی ہیں۔ تمہاری آسانی کے لیے اتنا بتا دیتی ہوں کہ تمہارا بیٹا بالکل تمہاری شکل ہے۔ بالکل تمہاری جوانی......! اسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ نواب سطوت نے عورتوں کی دلالی کا کام شروع کر دیا ہے اور تمہاری بیٹی بھی تمہاری ہم شکل ہے۔

مجھے یقین ہے کہ تم اپنی بیٹی کو نہیں تو کم از کم اپنے بیٹے کو ضرور تلاش کرنے کی کوشش کرو گے اور ہاں اب کسی بھی طوائف کو اپنے بستر کی زینت بنانے سے پہلے ایک بار ضرور سوچ لینا کہ کہیں یہ تمہاری بیٹی ہی نا ہو کیوں کہ تمہیں گندگی میں منہ مارنے کی بہت بُری عادت ہے۔

کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ روشن آراء کا نام لے کر تمہیں کوئی اور یہ سب کچھ بتا رہا ہے تو یقین رکھو نواب سطوت کہ یہ میں ہی ہوں روشن آراء! ابھی تک تمہاری منکوحہ۔ اس کا ثبوت ان ساری چیزوں کی تصاویر بھیج رہی ہوں جو تم نے مجھے اپنے بیٹے کے لیے دی تھیں۔ اگر کہو تو تمہارا یہ خاندانی تعویز تمہارے بیٹے کے گلے میں ڈال دوں تاکہ سب اسے تمہارے بیٹے کی حیثیت سے پہچان لیں۔ اجازت دو نواب سطوت پھر بات ہوگی' اللہ حافظ۔"

نواب جیسے جیسے روشن آراء کی جانب سے آنے والی اس ای میل کو پڑھتا جاتا تھا اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ میں بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس کی بدلتی ہوئی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ ان ساری باتوں کو پڑھ کر اس وقت اس کے دل و دماغ میں کتنی شدید ہلچل مچ رہی ہے' اس کی پیشانی پر ایک موٹی رگ پھول کر ابھر آئی تھی' اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور جسم پر خفیف سا لرزا طاری تھا۔

جیسے ہی اس نے ای میل پڑھ کر ختم کی' لیپ ٹاپ اٹھایا اور پوری قوت سے فرش پر دے مارا پھر اس کے منہ سے روشن آراء کے لیے فحش گالیوں کا طوفان برآمد ہو گیا۔ وہ روشن آراء کو مختلف بے ہودہ خطابات سے نواز رہا تھا۔ نہ جانے کس کس جانور کے ساتھ اس کے ناجائز رشتے جوڑ رہا تھا' مارے طیش کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ہونٹوں کے کناروں سے کف بہہ کر باہر آ رہا تھا' وہ اپنے آپے میں نہیں تھا پوری طرح جامے سے باہر آ چکا تھا۔

اب مجھے اپنی جگہ سے اٹھنا ہی پڑا کیوں کہ میں زیادہ دیر خاموش بیٹھ کر اس کی اس باؤلے ہو جانے والی کیفیت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا' اس وقت جتنا نواب غضب ناک اور طیش کی حالت میں تھا اتنا ہی میں سرور اور شادمانی کی کیفیت میں تھا' آج بہت عرصہ کے بعد دل میں بھڑکتی ہوئی آگ پر جیسے ٹھنڈی شبنم کے قطرے گر رہے ہوں۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور نواب کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس نے اس وقت سارا کمرہ تہس نہس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی اتنی شدید چیخ و پکار سن کر باہر دروازے پر موجود گارڈ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور میری جانب اپنی گن تان لی۔

"دفع ہو جاؤ الو کے پٹھے! تمہیں کس نے بلایا ہے' کس کی اجازت سے اندر آیا ہے؟" نواب کی توپوں کا رخ گارڈ کی جانب ہو گیا۔

"سوری! میں نے سمجھا کہ......" اس نے سر جھکا کر معذرت کی۔

"کیا سمجھے تم...... ہیں...... کیا سمجھے تم کہ کسی نے میری عزت اتارنے کی کوشش کی ہے...... ہے کسی میں اتنی جرأت جو نواب سطوت کو ہراساں کر سکے...... جھوٹ بولتی ہے وہ...... الو کی پٹھی...... دیکھ لوں گا میں اسے بھی۔ نواب سطوت ہے میرا نام......" وہ گارڈ سے کہنے لگا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا تو وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

"ریلیکس ہو جائیں سر! دیکھیں آپ کی حالت اچھی نہیں ہے۔ آپ کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو ریلیکس نہیں کیا تو آپ کے دماغ کی شریان بھی پھٹ سکتی ہے۔" میں نے اسے سنبھال کر بیڈ پر لٹایا اور جلدی سے کمرے میں موجود دواؤں کے کیبنٹ کی جانب بڑھ گیا' نواب کی یہ ساری دوائیں بیرون ملک سے منگوائی جاتی تھیں اور ہمہ وقت نواب کے کمرے میں ان کا اسٹاک رہتا تھا۔

میں نے کیبنٹ کھولی تو اس میں بلڈ پریشر چیک کرنے کا آلہ دکھائی دیا' میں نے فوری طور پر اسے اٹھایا اور نواب کے پاس آیا' وہ چت لیٹا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا' اپنے سر کو بے چینی سے اِدھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔

"تم نے پڑھی تھی وہ ای میل؟ دیکھا تم نے اس الو کی پٹھی روشن آراء کو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے' میرے بیٹے کو...... نواب سطوت آف شاداب پور کے پیر سائیں کے ہونے والے گدی نشین کو وہ کسی طوائف کے کوٹھے پر رکھ چھوڑے اور نواب کے اعلیٰ خون کو اس کی بیٹی کو لوگوں کے دل بہلانے کا سامان کرے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا' وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ روشن آراء تو نے سرمئی کے ساتھ مل کر میرے ساتھ اتنا بھیانک کھیل کھیلا۔" بولتے بولتے وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی' ایسا لگ رہا تھا کہ آنسوؤں کا ایک گولہ تھا جو اس کے حلق میں آ کر پھنس گیا تھا پھر اس

کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔

میں نے اس کی بات کو خاموشی سے سنا اور اس کا بلڈ پریشر چیک کیا' دو سو کے ہندسے کو بلڈ پریشر بتانے والی سوئی چھو رہی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! اٹس ٹو مچ۔" میں نے گھبرا کر کہا اور انجکشن نکال کر اس کے بازو میں انجکٹ کر دیا اور کہا۔

"آپ تھوڑی دیر خاموش رہیں' ابھی طبیعت بہتر ہو جائے گی پھر ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اس نے میرا چین میرا سکون سب لوٹ لیا ہے' میں تو اسے بھول بھی گیا تھا اور اس کے چلے جانے پر میں یہی سمجھا تھا کہ یقیناً اس کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی ہوگی اور وہ خوف زدہ ہو کر اپنا منہ کالا کر چکی ہے۔"

اتنے سال خاموشی سے گزر گئے تھے جب کچھ عرصہ پہلے مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ روشن آراء ملیر کھوکھراپار کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہی ہے۔ وہ تنہا ہی ہے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہے تب بھی مجھے یہی اطمینان ہوا کہ اس کا بچہ مر گیا ہوگا۔

میں نے تم سے اس لیے کہا تھا کہ اسے یہاں لے کر آؤ میرے پاس لیکن تم میرا یہ کام نہ کر سکے وہ یقیناً لودھی کے پاس ہوگی اس کے آدمی اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے اور اتنی جرأت اسے لودھی کا ساتھ ہی دے سکتا ہے۔ ورنہ جہاں اتنے عرصے وہ خاموش رہی تھی اب بھی رہتی۔" بولتے بولتے نواب ایک بار پھر ہانپنے لگا تو میں نے بہت نرمی اور رسان سے کہا۔

"سر! میں کہہ رہا ہوں پلیز خاموش لیٹے رہیں۔ میں نے آپ کو انجکشن دے دیا ہے آپ آرام کریں گے تو بی پی نیچے آئے گا۔"

"تم بتاؤ تو شمروز! کیا واقعی اس نے ایسا ہی کیا ہوگا کہ میرے خون کو...... سید زادوں کو اس گندگی میں پھینک دیا ہوگا...... وہ تو ماں تھی کیا ایک ماں ایسا ظلم اپنے بچوں پر کر سکتی ہے؟" اس نے بہت بے چارگی سے مجھ سے پوچھا۔

"آپ میری بات مان نہیں رہے ہیں' میں آپ کو ایک انجکشن اور دے رہا ہوں' یہ آپ کو ریلیکس کرے گا اور ہلکی سی نیند دے گا تاکہ آپ کے اعصاب پرسکون ہو سکیں۔"

میں دل ہی دل میں مسکراتا ہوا بظاہر سنجیدہ چہرہ بناتے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرا انجکشن اسے لگایا اور اس انجکشن کا اثر یہ ہوا کہ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا نیند میں چلا گیا۔

نواب نیند میں چلا گیا تو میں صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا وہ حقیقت میں بہت سخت اعصاب کا مالک تھا' کیوں کہ اتنی عمر میں اگر کسی اور شخص کا بی پی اتنا زیادہ ہائی ہو جائے تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ مسلسل بول رہا تھا اور اپنے دل کی ہر بات زبان پر لا رہا تھا میں چاہتا تو فوری طور پر اس کے کمرے سے جا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا' نیند کی یہ حالت اس کی زیادہ دیر کے لیے نہیں تھی بس آدھے گھنٹے کے بعد اس نے بیدار ہو جانا تھا اور تب تک اس کا بی پی بھی نارمل حالت میں آ جاتا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا بلڈ پریشر چیک کیا' پہلے سے کم ہو گیا تھا' میں مطمئن ہو گیا کیوں کہ میں اسے اتنی آسانی سے مرنے نہیں دینے والا تھا ابھی یہ پہلا جھٹکا تھا۔ ابھی تو بہت سے جھٹکے اسے اور دینے تھے میں حقیقت میں اس کا چین و سکون' اس کی نیند اس کا فخر اور غرور و تکبر مٹی میں ملانا چاہتا تھا۔ اسے ابھی بہت کچھ سہنا تھا اور زندہ رہنا تھا۔ جس طرح میں آج تک سہہ رہا ہوں' جس طرح روشن آنٹی نے سہا اور سرمئی نے اپنا بچپن اور جوانی اپنے باپ کا نام نہ

جاننے کے لیے کلس کلس کر گزاری۔ تم پر بہت لوگوں کے قرض ہیں نواب سطوت! تم کس کس کا قرض اتارو گے۔ تمہارے اوپر بے تحاشا لوگوں کے دکھوں کے قرض ہیں اتنے کہ انہیں چکانے کے لیے تمہیں ایسی کئی زندگیاں چاہئیں۔ میں اسے چپ چاپ بستر پر پڑے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا پھر وقت گزاری کے لیے میں نے اس کمرے میں پھیلی چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

❀......☆......❀
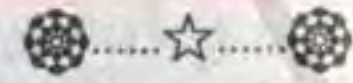
شمروز بھائی نے جس طرح کہا تھا میں نے وہی کیا' ای میل کا متن میں نے' امی نے اور شمروز بھائی نے مل کر سوچا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ امی کی جانب سے اسے ایسی باتیں بتائی جائیں کہ وہ پچھتاوے ندامت اور شرمندگی کے بوجھ تلے ہمیشہ دبا رہے۔

بقول امی کے کہ انہوں نے نواب سطوت سے بہت ٹوٹ کر محبت کی تھی' اسے اپنانے کے لیے انہوں نے اپنے ایک واحد رشتے دار اپنی بڑی بہن کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی بیسٹ فرینڈ اور سوتن نفیسہ نے بھی انہیں نواب سطوت کے بارے میں کھل کے بتایا تھا لیکن وہ امی کے سامنے اتنا اچھا بن کر آتا تھا کہ امی نے ان کی باتوں کا یقین نہ کیا' الٹا انہیں ہی قصور وار سمجھا۔ وہ سر تا پا اس کے عشق میں ڈوب چکی تھیں۔

لیکن امی کے اس بے لوث عشق کے صلے میں نواب نے انہیں کیا دیا' وہ اپنی سابقہ جون میں لوٹ آیا' صرف ایک ظالم شوہر ایک نواب جاگیردار بن کر رہ گیا۔ اسے اپنے سید زادہ ہونے کا بہت غرور تھا۔

ایسے ہوتے ہیں سید زادے...... امی نفرت سے کہتیں...... بدکار...... ظالم اور شرابی۔ ایسے نام نہاد سید زادوں سے تو شریف اور باکردار موچی اور چمار اچھے۔

میں شدت سے منتظر تھی کہ کب شمروز بھائی کی کال آئے اور میں یہ ای میل تھرو کروں بالآخر ایک دن شمروز بھائی نے مجھے فون کر کے کہا کہ میں اپنا کام کر دوں۔

اس وقت میں اپنے آفس میں ہی تھی اور ایک اہم اسائنمنٹ کے لیے باہر نکلنے ہی والی تھی کہ شمروز بھائی کی کال آ گئی اور میں نے جلدی جلدی یہ کام کیا اور اپنا روم لاک کر کے کیمرہ مین راشد اور اپنی ٹیم کے ہمراہ نیوٹاؤن کے تھانے پہنچ گئی۔

وہاں لوگوں کا بے تحاشا رش تھا' ان دنوں شہر میں دن دیہاڑے ڈاکوؤں کا راج تھا' وہ کسی بھی دکان اور مکان کو دھڑلے سے لوٹ کر فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو جاتے بعض اوقات اگر کوئی مزاحمت کرتا تو بلاجھجک اسے گولی مار دیتے اور ہماری پولیس ہمیشہ کی طرح ناکام رہتی' نا ڈاکو پکڑے جاتے اور نا قاتل۔

اس کے علاوہ شہر میں بھتہ خوری کی وارداتیں بھی زور پکڑ چکی تھیں۔ غنڈوں اور بدمعاشوں کے گروہ کا ایک بندہ آتا اور دکان دار کو پرچی دیتا' جس پر رقم کا اماؤنٹ تحریر ہوتا تھا۔ دکان دار خاموشی سے یہ رقم ادا کر دیتے کیوں کہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ اگر انہوں نے بھتے کی یہ رقم ادا نہ کی تو دوسرے دن یا تو رات کو ان کی دکان کو آگ لگا دی جائے گی یا پھر ڈاکو دندناتے ہوئے آئیں گے دکان لوٹیں گے اور ساتھ ہی دکان دار کو بھی ہلاک کر جائیں گے۔

یہ کیس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی یہاں بے تحاشا رش تھا' نوجوانوں میں بڑا اشتعال تھا' اگرچہ چند بزرگ حضرات انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی کے سمجھانے سے سمجھ نہیں رہے تھے' میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے ان مشتعل نوجوانوں کے قریب چلی گئی۔

ان میں ایک لڑکا جو شکل سے پڑھا لکھا دکھائی دے رہا تھا' بزرگوں کے سمجھانے سے مان گیا اور کہنے لگا۔

"دیکھو توڑ پھوڑ کرنے اور جلاؤ گھیراؤ کرنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہم پرامن احتجاج کرتے ہیں' نماز جنازہ پڑھانے کے بعد ہم جنازے کو دفنانے سے پہلے یہاں دوبارہ لائیں گے اور تھانے کے سامنے جا کر احتجاج کریں گے۔"

"تو کیا ہم میت کی بے حرمتی کریں گے؟" ایک نوجوان نے بھڑک کر کہا۔

"دیکھو میرے بھائی! اس میں جمیل بھائی کی بے حرمتی نہیں ہے' اس طرح کرنے سے ان کے قاتل پکڑے جائیں گے اور ان کی روح کو سکون ملے گا۔ ورنہ یہ سارے لڑکے اتنے زیادہ مشتعل ہیں کہ وہ یہاں ہنگامہ کریں گے' توڑ پھوڑ کریں گے جلاؤ گھیراؤ کریں گے۔"

یہیں قریب میں ایدھی کی ایمبولینس میں دکان دار جمیل کی ڈیڈ باڈی رکھی تھی جو انہوں نے پولیس سے حاصل کی تھی اور ابھی گھر نہیں لے گئے تھے۔

اسی اثناء میں مرحوم جمیل کے گھر اور خاندان کے دیگر افراد بھی وہاں آ گئے' وہ میت کو تھانے لے جانے سے انکار کر رہے تھے لیکن وہاں موجود دوسرے مشتعل افراد جن میں مارکیٹ کے دوسرے دکان دار بھی شامل تھے ان کے سخت دباؤ میں آ کر وہ بھی مان گئے۔

ہمارے علاوہ وہاں دیگر نیوز چینل کے بھی نمائندے تھے۔ میں نے وہاں موجود ایک نوجوان لڑکے کو جو بہت اچھل رہا تھا' اپنے قریب بلایا اور اس سے ساری بات معلوم کرنے کا فیصلہ کیا' میں نے اپنے کیمرہ مین کو اشارہ کیا اس نے کیمرہ اسٹارٹ کیا اور میں نے مائک سنبھال لیا اور اس سے بات شروع کی' میری لائیو رپورٹ چینل پر نشر ہو رہی تھی۔

اس کے بعد جنازہ اٹھا کر میت گاڑی میں رکھا گیا اور قبرستان کی جانب تدفین کے لیے روانہ ہو گیا لیکن اب بھی بہت سے شرپسند ایسے تھے جو اس ساری صورت حال سے مطمئن نہیں تھے۔

ان کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ کہیں سے آ گئے اور انہوں نے تھانے کی عمارت پر ہلّہ بول دیا' پولیس والے اپنی جانیں بچا رہے تھے' ایس پی اور جنازہ وہاں سے روانہ ہو چکا تھا اور اب یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا۔

پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔ عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی ادھر سے لوگ پتھراؤ کر رہے تھے' اُدھر سے پولیس شیلنگ کر رہی تھی پھر ان لوگوں میں سے کسی نے فائرنگ شروع کر دی' جس کے نتیجے میں مزید کئی افراد زخمی ہو گئے۔ دو افراد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے اور لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے کہ پولیس نے براہ راست فائرنگ کر کے بے گناہ احتجاجیوں کو مار دیا ہے۔

شدید پتھراؤ کے نتیجے میں ایک پتھر میری ٹانگ پر آ کر لگا اور میں تکلیف کی شدت سے بیٹھ گئی' میرے ٹخنے میں شدید چوٹ آئی تھی' میرے ساتھیوں نے مجھے وہاں سے نکالا اور لا کر گاڑی میں بٹھایا۔

میں نے وہاں سے جانے سے انکار کر دیا جب ہی رمضانی صاحب کی کال آ گئی کہ تم واپس آ جاؤ میں حشام کو وہاں بھیج رہا ہوں' میرا پاؤں سوجنا شروع ہو گیا تھا تکلیف اتنی تھی کہ میں پاؤں زمین پر رکھ نہیں پا رہی تھی ناچار کیا کرتی مجھے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

نیوز چینل واپس آتے ہوئے ہم نے سڑکوں پر کئی گاڑیاں موٹر سائیکلیں اور دکانوں کو جلتے ہوئے دیکھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ سوگواران تو اپنے پیارے کو دفنانے اور فاتحہ پڑھنے کے لیے قبرستان میں ہیں پھر یہ کون لوگ ہیں جو یہ جلاؤ گھیراؤ اور توڑ پھوڑ کر رہے ہیں؟ یقیناً ہمارے ملک میں کچھ ایسی نادیدہ قوتیں ہیں جو اس قسم کے حادثات اور واقعات سے فائدہ اٹھا کر ملک کی صورت حال اور اس کا سکون برباد کر رہے ہیں آخر ان لوگوں کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ کون لوگ ہیں یہ؟

کیا "را" والے ہیں کیا موساد والے؟ یہودی اور نصرانی قوتیں تو ازل سے مسلمانوں کے پیچھے پڑی ہیں اور آج تک انہوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہ کیسے اسے اس کی بنیادوں پر کھڑا رہنے دیں گے۔ بھارت نے اپنی فلموں اور ڈراموں کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کو تباہ کیا تو یہودی اور نصرانی طاقتوں نے اندرونی طور پر لسانی اور فرقہ پرستی کی بنیاد ڈالی اور ہمیں آپس میں لڑوا کر ختم کرنا چاہا لیکن جب تک اس پاکستان میں ایک بھی سچا مسلمان اور محبِ وطن پاکستانی موجود ہے یہ ساری طاغوتی قوتیں مل کر بھی اس پاکستان کو تباہ نہیں کر سکتیں۔ جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور آج بھی ہو گی ان شاء اللہ۔

میں آنکھیں بند کیے یہ ساری باتیں سوچ جا رہی تھی کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی ہم اپنے آفس پہنچ چکے تھے۔

میں بہ مشکل گاڑی سے اتری باہر ہی میرے گرد بہت سے ساتھی جمع ہو گئے۔ میری نگاہیں حشام کو تلاش کر رہی تھیں پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ اسٹاپ پر گیا ہے جہاں یہ ساری ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے' خبر یہ ملی کہ وہاں لوگوں اور پولیس والوں میں مورچہ بند

مقابلہ اور فائرنگ شروع ہوچکی ہے‘ میں حشام کو لے کر تھوڑی فکر مند ہوئی لیکن پھر دل ہی دل میں اسے اللہ کی امان میں دے کر مطمئن ہوگئی۔

رمضانی صاحب نے مجھے فوراً اسپتال جانے اور پھر گھر جانے کا آرڈر دے دیا میرے پاؤں میں اتنی تکلیف تھی کہ میں کار خود ڈرائیو نہیں کرسکتی تھی۔

وہاں سے حماد مجھے لے کر اسپتال آیا وہ میری کار ڈرائیو کررہا تھا۔ اسپتال میں میرے پاؤں کا ایکسرا ہوا‘ شکر تھا کہ ہڈی سلامت تھی‘ بس چوٹ لگنے کے باعث سوجن آگئی تھی‘ ڈاکٹر نے بینڈج کرکے ڈھیر ساری دوائیں کھانے کے لیے لکھ دیں۔

حماد کے ساتھ میں گھر آئی تو امی مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔

میں نے اور حماد نے انہیں تسلی دی کہ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے‘ دو تین دن آرام کروں گی تو ٹھیک ہوجاؤں گی۔

حماد کے لیے امی زبردستی چائے بنالائیں حالاں کہ وہ منع بھی کررہا تھا‘ وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ اس کے سیل فون پر کال آئی۔ اس نے فون سنا اور بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

”ارے گولی کہاں لگی ہے؟ کیسا ہے وہ؟“ اس نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”کیا ہوا حماد! خیریت تو ہے؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”حشام کو گولی لگی ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا......؟“ میں اپنی تکلیف بھول کر بے ساختہ کھڑی ہوگئی اور ایک روح فرسا خیال کے آتے ہی میں بے ہوش ہوکر حماد کی بانہوں میں جھول گئی۔

❁......☆......❁
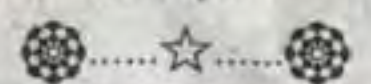
ساری چیزوں کو سمیٹنے کے بعد میں پھر سوفے پر بیٹھ گیا‘ میری نگاہیں نواب کے چہرے پر تھیں میں اس کے بیدار ہونے کا انتظار کررہا تھا‘ ساتھ ہی میں سرمئی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہ بڑی بے صبری سے میری کال کا انتظار کررہی ہوگی لیکن نواب کی نگاہوں میں اپنے نمبر بڑھانے کے لیے مجھے اس کے کمرے میں ٹھہرنا ہی تھا اس کی دیکھ بھال کرنا تھی‘ اس کا خیال رکھنا تھا۔

میں نے بے سدھ پڑے نواب کے جسم اور پلکوں پر ہلکی سی جنبش دیکھی تو سمجھ گیا کہ دوا کا اثر ختم ہورہا ہے اور اب یہ اپنی آنکھیں کھول دے گا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے بیڈ کے قریب کھڑا ہوگیا اور ایک بار پھر اس کا بی پی چیک کیا۔ اس وقت اس کا بی پی بالکل نارمل تو نہیں تھا تھوڑا سا بڑھا ہوا تھا اور جو کنڈیشن اس کی ہوگئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بہت غنیمت تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح سے کھول دیں اور خالی خالی نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

”اب کیسی طبیعت ہے نواب صاحب! آپ کیسا محسوس کررہے ہیں‘ طبیعت میں بہتری آئی؟“ میں نے جھک کر اس سے نرم لہجے میں پوچھا۔

”مجھے کیا ہوگیا تھا؟“ اس نے کھوئی کھوئی سی کیفیت میں سوال کیا۔

”کچھ بھی تو نہیں‘ بس ذرا سا بی پی بڑھ گیا تھا میں نے آپ کو انجکشن دے دیئے تھے تاکہ آپ بہتر محسوس کریں۔ آپ کے سر میں بھاری پن یا چکر تو نہیں محسوس ہورہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں سر میں ہلکا سا بھاری پن ہے۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ بھی ٹھیک ہوجائے گا‘ میں آپ کے لیے جوس

جگر مرادآبادی کی توبہ

جگر مرادآبادی بڑے مشہور شاعر تھے اور بے حد شراب پیتے تھے۔ اتنی شراب پیتے تھے کہ لوگ مشاعرہ میں سے اٹھا کر لے جاتے تھے بلکہ خود فرماتے ہیں۔

پینے کو تو بے حساب پی لی
اب ہے روزِ حساب کا دھڑکا

بڑی عجیب بات ہے کہ توبہ کرنے سے پہلے ہی اپنے دیوان میں اس شعر کا اضافہ کیا۔

چلو دیکھ کر آئیں تماشہ جگر کا
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگیا

جب ان پر اللہ کا خوف طاری ہوا تو حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے مشورہ کیا کہ میں کیسے توبہ کروں؟ خواجہ صاحب نے فرمایا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں چلو۔ چنانچہ حاضر ہوئے اور توبہ کی اور حضرت سے چار دعاؤں کی درخواست کی۔

ا۔ میں شراب چھوڑ دوں 2۔ داڑھی رکھ لوں 3۔ حج کرآؤں 4۔ اللہ میری مغفرت فرمادیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے تین دعائیں تو دنیا میں قبول فرمائیں اور چوتھی کے بارے میں خود جگر کہتے تھے کہ اللہ نے وہ بھی قبول فرمائی ہوگی۔ چنانچہ داڑھی رکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے حج بھی نصیب فرمادیا اور شراب بھی چھوڑ دی۔ جب شراب چھوڑی تو بیمار ہوگئے...... ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ پیتے رہیں ورنہ آپ مرجائیں گے۔ انہوں نے پوچھا کہ اگر پیتا رہوں تو کتنے سال زندہ رہوں گا۔ ڈاکٹروں نے کہا دو چار سال تک زندہ رہ سکتے ہو تو فرمایا کہ اللہ کے غضب کے ساتھ دو چار سال تک زندہ رہنے سے‘ بہتر ہے کہ ابھی اللہ کی رحمت کے سائے میں مرجاؤں...... لیکن اللہ نے پھر صحت بھی دی اور کئی سال تک زندہ رہے۔ ایک بار میرٹھ میں تانگے میں بیٹھے ہوئے تھے اور تانگے والا یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

چلو دیکھ کر آئیں تماشہ جگر
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگیا

تانگے والے کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ یہ داڑھی والا ٹوپی والا اور سنت لباس میں ملبوس شخص جگر صاحب ہیں‘ شعر سن کر جگر صاحب رونے لگے اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے توبہ سے پہلے یہ شعر کہلوایا۔

(محمد عبداللہ عاطر......منگلا کینٹ)

منگواتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔

”ٹھہرو شمروز! ادھر آؤ میرے پاس۔“

تو میں دوبارہ اس کے نزدیک چلا گیا۔

”شکریہ!“ اس نے انسانیت کے جامے میں رہتے ہوئے ممنونیت سے کہا۔

”کس بات کا شکریہ نواب صاحب! یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ آپ میرے دل میں کیا مقام رکھتے ہیں اور آپ کا دست شفقت میں اپنے لیے کتنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو‘ آپ کے لیے تو یہ جان بھی قربان ہے۔“ میں نے یہ الفاظ اتنے جذباتی انداز میں کہے کہ نواب جیسا جہاندیدہ اور تیز نگاہ رکھنے والا شخص بھی میری اداکاری کے جھانسے میں آ گیا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

”میری نگاہ التفات یوں ہی تو تمہارے اوپر نہیں

ٹھہری تھی۔ میں نے تمہارے اندر چھپے ہوئے ایک وفادار انسان کو پہلی ہی نگاہ میں پہچان لیا تھا۔‘‘

’’یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے نواب صاحب! ورنہ میں تو ایک حقیر سا بندہ ہوں‘ جس کے اوپر آپ نے نظرِ عنایت کی ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

’’اچھا تم ایسا کرو کہ عنایت حسین کو بلواؤ میرے کھانے پینے کا خیال وہی رکھتا ہے۔‘‘ نواب نے ایک نئے شخص کا نام لیا‘ جس سے اتنے دن اس کوٹھی میں رہنے کے باوجود میں ناواقف تھا۔

’’کہاں ملے گا عنایت حسین؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’میرے موبائل میں اس کا نمبر ہے‘ تم کال کرکے یہاں بلوالو اور اسے میرے کھانے کی ہدایت دے دو۔ جو تم کہو گے وہ بنالائے گا۔‘‘ نواب نے اپنے سیل فون کی جانب اشارہ کیا تو میں نے اس کے سیل فون سے عنایت کا نمبر دیکھ کر اسے کال کرکے کہا کہ وہ نواب صاحب کے روم میں آجائے۔

اگلے تین منٹ بعد ہی عنایت حسین آگیا۔ وہ ایک جوان اور جسیم جسامت کا حامل شخص تھا۔

’’آپ نے یاد فرمایا نواب صاحب!‘‘ اس نے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر کہا۔

’’ہاں دیکھو یہ تمہیں میرے کھانے کے نئے شیڈول کے بارے میں بتائیں گے ان کی بات غور سے سنو۔‘‘ نواب نے میری جانب اشارہ کیا تو وہ میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا پھر میں نے نواب کے لیے اس کے کھانوں کا دن بھر کا چارٹ اس کے حوالے کیا اور فوری طور پر جوس لانے کے لیے کہا۔

’’یار تم نے نمک بند کرکے اچھا نہیں کیا‘ مجھ سے پھیکا کھانا نہیں کھایا جائے گا۔‘‘ اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

’’ایسا ہمیشہ کے لیے نہیں ہے‘ بس ذرا آپ کی طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر آپ اپنی مرضی کا کھانا کھایئے گا۔‘‘ میں نے نرم لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو نواب بیڈ کے سرہانے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا‘ وہ بالکل خاموش تھا اور کچھ سوچ رہا تھا میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا اور اسے سوچنے دیا‘ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے نقوش کبھی بگڑنے لگتے‘ کبھی پیشانی پر ڈھیروں بل آجاتے پھر اس کے چہرے پر ایک بار سرخی آنی شروع ہوگئی اور وہ تیز تیز سانسیں لینے لگا تب میں بولا۔

’’آپ پھر کوئی فضول بات سوچ رہے ہیں‘ دیکھیں آپ کا بی پی پھر بڑھنے لگے گا۔‘‘

’’تو پھر میں کیا کروں۔‘‘ پہلی مرتبہ میں نے اس کے چہرے پر لاچاری کے تاثرات دیکھے۔

اور اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا‘ عنایت حسین جوس لے کر آگیا‘ میں نے اس کے ہاتھ سے جوس لے کر اسے جانے کا اشارہ کیا اور کہا رات آٹھ بجے نواب صاحب ڈنر کریں گے۔

’’نہیں رہنے دو‘ میرا کھانے کے لیے دل نہیں چاہ رہا۔‘‘ نواب نے کہا۔

’’کھانا آپ کے لیے ضروری ہے نواب صاحب!‘‘ میں نے اسے سمجھایا۔ ’’تم جاؤ اور ٹھیک آٹھ بجے ڈنر لے آنا۔‘‘ میں نے عنایت حسین سے کہا تو وہ چلا گیا۔

’’تم تو سچ مچ میرے ڈاکٹر بن گئے ہو۔‘‘ اس نے زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

’’یہ بھی آپ کی عنایت ہے نواب صاحب! کیوں کہ یہ بات بھی صرف میں ہی جانتا ہوں کہ آپ کی اچانک طبیعت کے بگڑنے کا سبب کیا ہے‘

کسی اور کو یہ بات تھوڑی بتائی جاسکتی ہے۔‘‘ میں نے لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔

’’میں تم پر بہت اعتبار کر رہا ہوں‘ مجھے امید ہے تم میرا اعتبار کبھی نہیں توڑو گے۔‘‘ اس نے دوبارہ نواب سطوت کے روپ میں آکر تنبیہ کے انداز میں کہا۔

’’آپ کا خادم ہوں سر!‘‘ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیتے ہوئے کہا۔

’’تم مجھے ایک مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے‘ اس ذلیل عورت نے میرے ساتھ بہت بڑا کھیل کھیلا ہے‘ اس نے نواب سطوت کو نیچا دکھانے کی‘ ہرانے کی کوشش کی ہے۔‘‘ نواب نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

’’اس کائنات کا نظام ہے سر!‘‘ میں اتنا کہہ کر رک گیا تو نواب چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔

’’ہمیشہ جیتنے والوں کو بھی کبھی نہ کبھی مات ضرور ہوتی ہے‘ ہم انسان ہیں اور کبھی کبھی تو چیونٹی بھی پاؤں میں دب کر کاٹ لیتی ہے۔ روشن آراء بیگم کو بھی آپ نے چیونٹی سمجھ کر اپنے قدموں تلے دبایا تھا‘ اس نے بھی کاٹ لیا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تو اب اس کا علاج کس طرح کیا جائے؟‘‘ اس نے زچ ہونے کے انداز میں کہا۔

’’آپ اپنے چچازاد بھائی لودھی کے ہاں معلوم کروائیں کہ کیا واقعی روشن آراء بیگم اسی کے پاس ہیں‘ اگر ایسا ہے تو پھر ہم کوئی ڈیل کرسکتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’لیکن میں ان دونوں میں سے کسی سے بھی ڈیل نہیں کروں گا۔ مجھے روشن آراء چاہیے زندہ یا مردہ۔ میں اسے اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ زندہ یا مردہ دونوں حالتوں میں اپنے ہاتھوں سے اس کے سینے میں چھ گولیاں اتاروں گا۔‘‘ نواب نے بگڑ کر کہا۔

’’اس سے کیا ہوگا روشن آراء اگر مر بھی گئی تو اس سے آپ کا مسئلہ تو حل نہیں ہوگا۔ آپ کا اصل مسئلہ تو اپنے بچوں کی تلاش ہے‘ انہیں آپ کہاں تلاش کریں گے۔ ہاں ایک کام ہوسکتا ہے کہ آپ اس سرمئی بائی کو تلاش کریں۔‘‘ میں نے کہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

’’لیکن سرمئی کے بارے میں اس نے بتایا ہے کہ وہ تو مر چکی ہے۔‘‘

’’آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’سرمئی بائی کا کیا چکر ہے؟ وہ کس طرح آپ کے خلاف روشن آراء کے ساتھ مل گئی۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بس یار! یہ بھی ہماری جوانی کی ایک بھول تھی۔‘‘ اس نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ’’سرمئی اتنی حسین عورت تھی کہ شاید اپنی ساری لائف میں‘ میں نے اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔ اس پر میرا دل آگیا تھا وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی‘ میں نے اس سے کہا کہ تم محفل سجانا چھوڑ دو تو اس نے میری خاطر یہ کام چھوڑ دیا اور خود کو صرف میرے لیے وقف کردیا‘ وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے نکاح کرلوں لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا نکاح اور وہ بھی ایک طوائف سے۔ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میں اس کی جوانی سے کھیلنا چاہتا تھا‘ میں نے اسے بہت لالچ دیئے‘ بہت مال و متاع دیتا رہا۔ باغات اور زمینیں دیں لیکن وہ بغیر نکاح کے اس بات کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب روشن آراء سے میں نے نکاح کیا تھا اور اسے لاہور میں ایک بنگلے میں رکھا ہوا تھا۔ سرمئی کو ملنے کے لیے میں ایک دوسرے بنگلے میں بلوایا کرتا تھا۔

میں سوچتا تھا کہ میں نے سرمئی کو اتنا کچھ دیا ہے مزید کچھ اور دوں گا کبھی نہ کبھی تو وہ مانے گی۔‘‘ لیکن

اتنا کہہ کر وہ ٹھہر گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا' بالکل ایسے جیسے دور سے پیدل چلتا ہوا آ رہا ہو۔ ذرا دیر دم لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''لیکن مجھے ایک صاحب نے دبئی بلوایا تھا' میرے بہت اچھے دوست ہیں ان کے شغل بھی ہمارے جیسے تھے' ان کے پاس انڈیا سے ایک لڑکی آئی تھی اس کا پیغام آیا کہ نواب صاحب آجائیں ایک ایسا گوہر نایاب ہاتھ لگا ہے کہ آپ دیکھیں گے تو پھڑک جائیں گے۔ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے اور یہ قیمتی تحفہ آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

ان دنوں میں سرمئی کے حصول کے لیے ویسے ہی بے تاب ہو رہا تھا اور وہ مان نہیں رہی تھی۔ بس اس کا فون آیا تو میں بے تاب ہو کر دبئی چلا گیا۔

پندرہ سولہ سالہ رکمنی حقیقت میں گلاب کی ادھ کھلی کلی تھی مگر انتہائی حیرت انگیز بات تھی کہ اس پندرہ سولہ سالہ رکمنی کے اندر اللہ جانے کیسی آگ بھری تھی کہ میں اسے چھو کر سب کچھ بول گیا۔

گیا تو میں چند دنوں کے لیے تھا لیکن رکمنی کا نشہ میرے اوپر اتنا زیادہ چڑھا کہ میں یہ بھی بھول گیا کہ روشن آراء کی ڈیلیوری ڈیٹ بھی آنے والی ہے۔

وہ تو جب میرے پاس روشن آراء کے غیاب کی اطلاع پہنچی تو میں فوراً آ گیا۔ گارڈ کو میں نے سزا کے طور پر مروادیا' عشرت بھی مل گئی لیکن وہ بھی روشن آراء کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔ اس نے اس وقت سچ ہی بولا تھا' کہ روشن آراء اور وہ بنگلے سے نکل کر علیحدہ ہو گئے تھے میں نے اسے سزا کے طور پر اپنی حویلی میں قید کروادیا تھا۔ وہ بھی چند ماہ بعد ہی مر گئی تھی۔

روشن آراء کی تلاش میں' میں نے سرمئی کو بھی فراموش کر دیا اور روشن آراء جو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی مجھے اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا کاش اس وقت مجھے سرمئی کا خیال آ جاتا۔

دونوں نے مل کر مجھ سے انتقام لیا تھا جب سرمئی کا پتا کرایا تو اس کا کوٹھا بھی ویران پڑا تھا اور کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی' تھک کر میں نے روشن آراء اور سرمئی دونوں پر لعنت بھیج دی۔ میں تو ان دونوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔

حالاں کہ میں پچھلے دس سالوں سے کراچی میں مقیم ہوں لیکن روشن آراء کے بارے میں خیال ہی نہیں آیا کہ وہ بھی کراچی میں ہو سکتی ہے' اتفاق سے کسی کے ذریعے سے میرے ایک آدمی کو اس کے بارے میں خبر ملی کہ وہ کراچی کی ایک نواحی بستی میں موجود ہے' میں نے تمہیں بھیجا بھی لیکن......'' اتنی ڈھیر ساری باتیں کر کے وہ بہت تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔

''میرے ذہن میں تو یہی خیال آ رہا ہے کہ آپ کسی قابل اعتبار بندے کو اس کام پر لگا دیں کہ وہ کراچی میں یا لاہور میں جتنی بھی ایسی جگہیں ہیں وہاں جا کر آپ کی شکل سے ملتی جلتی شکل کے بندے یا پھر اس لڑکی کی تلاش کریں۔'' میں نے کہا۔

''پاگل ہو گئے ہو' میں یہ بات کسی سے بھی نہیں کر سکتا۔ کسی کو بھی یہ بات بتانے کا مطلب سمجھتے ہو تم۔ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنا۔'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تو پھر......'' میں نے کہا۔

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ یہ کام تم اپنے ذمہ لے لو۔ مجھے یقین ہے تم یہ کام بھی کر لو گے اور یہ راز کسی دوسرے کے علم میں بھی نہیں آئے گا۔'' نواب نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''میں سر......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں تم...... میرا یہ کام صرف تم ہی کر سکتے ہو اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ دونوں پاکستان میں موجود ہیں تو تم انہیں تلاش کر لو گے اگر تم انہیں ڈھونڈ نکالو تو سیدھے میرے پاس لے کر آنا اور شمروز! اگر تم نے یہ کام کر دیا تو میں تمہیں اتنا مالا مال کر دوں گا کہ جس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔''

''ٹھیک ہے نواب صاحب! آپ کی خاطر میں کراچی تو کیا پاکستان کے تمام بالا خانوں کی خاک چھان لوں گا لیکن آپ کو بھی ایک بات کا دھیان رکھنا ہو گا۔'' میں نے آخری جملہ اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ کا کہنا ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں' بھروسہ کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے آج اور ابھی اگر میں اپنے کسی بھی کام سے باہر جاؤں گا تو آپ کا کوئی نہ کوئی بندہ میرے پیچھے لگ جائے گا' میں سب جانتا ہوں سر! بعض دفعہ تو مجھے اس بات پر اتنا افسوس بھی ہوتا ہے کہ میں ابھی تک آپ کا اعتماد نہیں جیت سکا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ میں ہوں تو آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہی ناں اور ہم جیسے بے حیثیت لوگ چیونٹی سے بھی حقیر ہوتے ہیں۔'' میں نے گہری اداسی بھرے لہجے میں کہا۔

میری بات سن کر نواب خاموش ہو گیا پھر بولا۔

''اچھا چلو جو ہوا اس کو بھول جاؤ۔ تم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میرے دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں۔ اس لیے کوئی اپنے آپ کو قابل بھروسہ ثابت کرے اس کے لیے بڑی کسوٹی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خیر اب سے آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے تم پر بھروسہ ہی تو کیا ہے جب ہی اتنا بڑا اور اہم کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اب تم آزاد ہو اب کوئی تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔''

''یہ بات میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر میں اس کام میں لگ جاؤں گا تو دوسروں کو ضرور تشویش ہو گی کہ میں یہ کام کیوں اور کس کے لیے کر رہا ہوں پھر آپ کی نگاہ میں اپنے نمبر بڑھانے کے لیے وہ اس بات کی کھوج لگائیں گے اور پھر یہ کام خفیہ نہیں رہے گا۔ ورنہ مجھے کوئی اعتراض اور ڈر و خوف نہیں ہے کہ کوئی میری مخبری نہ کرے' جو چور ہو وہی ڈرے گا اور نہ تو میں چور ہوں اور نہ ہی دھوکے باز۔ آپ مالک ہیں' جیسا چاہیں کریں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو' میں تمہارے لیے ایک گاڑی کا کہہ دیتا ہوں اور اخراجات کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہو وہ تم شہباز سے لے سکتے ہو۔ گاڑی کا انتظام بھی وہی کرے گا۔ میں تمہارے کمرے میں شہباز کو بھیج دوں گا۔'' نواب نے کہا۔

''اچھا سر یہ بتائیں کہ اس ای میل کا کوئی جواب دینا ہے کہ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم ہی بتاؤ جواب دیا جائے یا نہیں اور اگر جواب دیا جائے تو کیا دیا جائے۔'' نواب کو اس وقت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ساری عقل و فراست بھول چکا ہے' سرمئی کی اس ای میل نے حقیقت میں اسے چاروں خانے چت کر دیا تھا۔

''میرا تو مشورہ یہ ہے کہ سر ہمیں اس ای میل کا کوئی جواب دینا ہی نہیں چاہیے' وہ یہ سمجھیں گی کہ آپ نے ان کی ای میل کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ہے' اس لیے خود بھی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گی۔ اگر آپ نے جواب دیا تو اسے وہ اپنی کامیابی تصور کریں گی' ہم اپنا کام خاموشی سے کرتے رہیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

اپنا مشورہ دینے کے بعد میں نے اس کا خیال پوچھا۔

''بات تو تم نے بالکل ٹھیک کی ہے' اس الو کی پٹھی

نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کرلی ہے' واقعی میری خاموشی سے اس کا یہ بڑھا حوصلہ پست ہوجائے گا۔'' نواب نے میرے مشورے کو پسند کیا اور سراہا۔

ہمیں پتا ہی نہیں چلا اور آٹھ بج گئے۔ عنایت حسین ڈنر ریڈی ہے کی اطلاع لے کر آ گیا تو میں نے اس سے اجازت مانگی اور چلتے چلتے اسے تاکید کی کہ اب اس کی ساری ٹینشن میں نے لے لی ہے اور اسے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی کہ وہ ڈنر کرکے دوائیں لے اور آرام سے سو جائے' میں نے اس کی دوائیں ٹیبل پر رکھیں اور اسے یہ اطمینان دلا کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا کہ میں کل سے ہی اپنا کام شروع کردوں گا۔

نواب سے رخصت ہوکر میں اپنے کمرے میں آیا لیکن میں شہباز کا انتظار کرنے لگا کہ وہ میرے پاس سے ہوکر چلا جائے تب میں اطمینان سے سرمئی سے بات کروں۔

لیکن شہباز کے آنے سے پہلے میرا ڈنر بھی آ گیا۔ میں ڈنر کررہا تھا تو شہباز آ گیا اس نے ایک کرولا کی چابی میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا کہ آج سے یہ تمہارے استعمال میں رہے گی' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک براؤن کلر کا بھاری لفافہ میرے حوالے کیا کہ اس میں میرے استعمال کے لیے رقم ہے۔

میں نے اس سے دونوں چیزیں لے کر اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے اپنا سیل فون نمبر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ نواب صاحب کی ہدایت ہے کہ تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو یا مزید رقم کی ضرورت ہو وہ تم مجھے بتا سکتے ہو۔

میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکراتا ہوا میرے روم سے چلا گیا۔ میں نے اپنا ڈنر ختم کیا۔ ملازم کھانے کی ٹرالی لے کر چلا گیا تو میں نے چائے کی فرمائش کردی۔ چائے پی کر فارغ ہوا تو میں نے اپنا روم لاک کیا اور پھر سرمئی کا نمبر ملایا۔

سرمئی کا فون مسلسل بج بج کر بند ہورہا تھا اور وہ فون ریسیو نہیں کررہی تھی۔ کئی بار ایسا ہونے کے بعد میں پریشان ہوگیا کہ کیا کروں' سرمئی تو بے قراری سے میرے فون کا انتظار کررہی ہوگی' ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ فون ہی نہیں ریسیو کررہی' ایسا بھی نہیں ہوسکتا کہ اس نے اپنا سیل فون کہیں اور رکھ دیا ہو اور خود کہیں اور بیٹھی ہو پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈرائیو کررہی ہو اور ٹریفک کے شور میں وہ فون کی رنگ ٹون نہیں سن پا رہی ہو۔

میں نے فون رکھ دیا اور عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرنے لگا' نماز عشاء سے فارغ ہوا تو پھر خیال آیا کہ فون کروں' اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور سرمئی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ میرے پاس کوئی دوسرا نمبر بھی نہیں تھا مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ مجھے سرمئی کے گھر کا نمبر بھی لے لینا چاہیے تھا پھر یہ سوچ کر سونے کے لیے لیٹ گیا کہ سرمئی اپنے سیل فون پر میری اتنی مس کالز دیکھے گی تو خود ہی فون کرے گی۔

میں سونے لیٹا تو اپنے آپ کو ذہنی طور پر بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا' آج میں نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ ایک نہیں بلکہ دو دو کامیابیاں۔ ایک تو یہ کہ میں نواب کو ایک بہت بڑا دھچکا دینے میں کامیاب رہا تھا' دوسرا اس کا اعتماد جیتنے کا۔ اب میں آزاد تھا' اپنی مرضی سے کہیں بھی جاسکتا تھا لیکن ہزار آزادی کا احساس سہی' مجھے ہر حال میں محتاط رہنا تھا' اس لیے کہ ہم ڈاکٹرز کا مقولہ ہے کہ ''احتیاط علاج سے بہتر ہے۔''

میں نے سونے سے پہلے فیصلہ کیا کہ کل میں سرمئی کے گھر جا کر خیریت معلوم کروں گا اور زبانی طور پر نواب کی ساری کیفیت بتاؤں گا۔ آج مجھے بہت میٹھی اور گہری نیند آ رہی تھی۔

رات کا وہ نہ جانے کون سا پہر تھا کہ جب فون کی تیز بیل سے میری آنکھ کھلی۔ میں بہت گہری نیند میں تھا اس لیے ناگواری سے فون اٹھایا اور بمشکل آنکھیں کھول کر اسکرین پر نمبر دیکھا۔

یہ سرمئی کا نمبر تھا' سرمئی کا نمبر دیکھ کر میری ناگواری پل میں دور ہوگئی اور میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے یس کا بٹن پش کرتے ہی کہا۔

''سب خیریت ہے ناں سرمئی! تم میرا فون کیوں ریسیو نہیں کررہی تھیں؟''

''کچھ ٹھیک نہیں ہے شمروز بھائی! آپ نے نیوز نہیں دیکھیں کیا؟'' مجھے سرمئی کی آنسوؤں میں بھیگی بھیگی آواز سنائی دی۔

''نہیں! میں نے نیوز نہیں دیکھیں؟ دراصل تمہاری ای میل نے بڑا زبردست کام کردیا ہے' تم سنو گی تو......''

''دفع کریں آپ اس ای میل کو۔'' سرمئی نے روتے ہوئے کہا تو میں خاصا پریشان ہوگیا اور کہا۔

''جلد بتاؤ گڑیا! کیا ہوا ہے' تم رو کیوں رہی ہو؟''

''بھائی! حشام کو گولی لگی ہے وہ شدید زخمی ہے اور اسپتال میں ہے۔''

❁......☆......❁
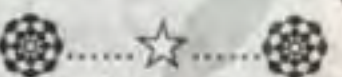
ہوش میں آکر میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو سب کے درمیان گھرا ہوا پایا' امی' بابا' اماں اور حماد۔ سب ہی کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی۔ میں چند لمحوں تک خالی ذہن سے ان سب کے چہروں کو دیکھتی رہی' ذہن میں جیسے ڈھیر ساری دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تب ہی امی کی نرم اور میٹھی آواز میرے کانوں میں آئی۔

''کیسی ہو میری بچی؟''

اور پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ خاموش کھڑے حماد پر نگاہ پڑی تو مجھے حماد کے وہ دل خراش الفاظ یاد آ گئے اور میں ایک چیخ مار کر تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور حماد کی

شب خون

شروع ہی سے وہ مجھے اچھا لگا
پھر احساس ہوا کہ میرے دل نے
بغاوت کردی اور مجھے اس سے
پیار ہوگیا!
اس کی آنکھوں میں بھی الفت کے دیپ
جگمگانے لگے اور پھر بہت تیزی
سے ہم نے محبت کی منزلیں طے کیں
ہوئے عہد و پیماں!
کھائیں جینے مرنے کی قسمیں بھی پھر
اچانک ہی قیامت برپا ہوگی اس نے
نگاہیں پھیرلیں اور مجھ سے شروع کردی
بے رخی برتنا!
وہ بدل گیا موسموں کی طرح وہ چھوڑ گیا
ساتھ اجنبیوں کی طرح' میں دم بخود رہ گئی
دیکھتی کہ یہ کیا ہوگیا ہماری محبت کے
اونچے مینار پر تنزیلہ!
کب' کیسے اور کس نے شب خون مار دیا
(تنزیلہ ہاشمی' جھنگ صدر)

جانب متوحش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''حشام زندہ تو ہے؟''
''اللہ سے خیر کی دعا مانگو کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ ہمیشہ منہ سے اچھے الفاظ نکالا کرو' اللہ اسے زندگی دے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اماں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ حماد ہنوز خاموش تھا۔
''میں تم سے پوچھ رہی ہوں حماد! تم چپ کیوں ہو جواب کیوں نہیں دیتے؟'' میں نے اپنے پاؤں کی تکلیف کی پروانہ کرتے ہوئے اسے دیوانوں کی مانند جھنجوڑ ڈالا۔
''پتا نہیں وہ کیسا ہے؟ وہاں جاؤں گا تو پتا چلے گا۔ فی الحال تو ہم سب تمہارے چکر میں لگ گئے' تم تو حشام کے گولی لگنے کی خبر سنتے ہی اس طرح بے ہوش ہو گئیں جیسے......'' حماد نے بے پروا لہجے میں کہا اور آخری الفاظ معنی خیز لہجے میں ادا کیے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ حماد میرا کولیگ ہے اور میرے کولیگ میں سے کوئی میرے اور حشام کے اس دلی رشتے کے بارے میں نہیں جانتا تھا بلکہ ان سب نے تو مجھے ہمیشہ حشام سے لڑائی جھگڑا کرتے اور اسے ہمیشہ فضول قسم کی دھمکیاں دیتے ہوئے سنا تھا۔
''تو کیا ہوا وہ ہمارا کولیگ ہے' ہم ساتھ کام کرتے ہیں۔ کسی کے بارے میں بھی ایسی تشویشناک خبر سن کر میرا یہی حال ہوگا۔''
''میرے بارے میں بھی۔'' حماد نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''تم فضول باتیں چھوڑو' میں خود طلال انکل سے بات کرتی ہوں۔'' میں نے اس کا معنی خیز جملہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور جلدی جلدی طلال انکل کا نمبر ملانے لگی۔
طلال انکل نے میری پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کرلیا' میرے بولنے سے قبل ہی وہ بول اٹھے۔
''سرمئی بیٹی!'' لہجہ بہت شکستہ اور افسردہ تھا۔
''انکل! حشام کیسا ہے؟ وہ زیادہ زخمی تو نہیں ہے ناں۔ اس کو کتنی گولیاں لگی ہیں؟ گولیاں کہاں کہاں لگی ہیں؟'' میں نے بے قرار لہجے میں ڈھیروں سوالات ایک ساتھ کرڈالے۔
''حشام بہت زخمی ہوا ہے بیٹی! تم بہت دعا کرو کہ اللہ میرے حشام کو بچالے' تمہاری آنٹی کا بہت بُرا حال ہے' اگر ہو سکے تو تم یہاں آ جاؤ۔ انہیں تمہارے قرب کی تمہارے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔ میں تو خود اتنا پریشان ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ سب کیسے ہو گیا۔ حشام اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے' ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' انکل نے بہ مشکل یہ چند جملے کہے اور ان کا ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ان کی آواز رندھ گئی اور انہوں نے فون بند کردیا۔
''چلو حماد ابھی چلو...... مجھے اسپتال جانا ہے۔'' میں نے اپنے پیر کی تکلیف کی پروا کیے بغیر کہا۔
''تم کیسے جاسکتی ہو' تم گھر میں رکو میں اسپتال جارہا ہوں۔ وہاں سے تمہیں فون کرکے بتاتا رہوں گا' ویسے بھی تمہیں ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔'' حماد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
''بھاڑ میں گیا ڈاکٹر اور میری تکلیف۔ مجھے ابھی اسپتال جانا ہے' دیکھو اگر تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود گاڑی ڈرائیو کرکے چلی جاؤں گی۔'' میں نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔
''ارے بیٹا! کچھ بتاتی تو جاؤ کہ حشام بیٹا کیسا ہے؟ اے میرے مالک اس بچے پر رحم فرما۔ اسے زندگی عطا کردے میرے مولا!'' اماں نے میرا کندھا

ہلاتے ہوئے کہا۔
''اماں وہ بہت شدید زخمی ہے' آپ بس ڈھیر ساری دعائیں کریں۔ اس کا آپریشن ہو رہا ہے' آنٹی اکیلی ہیں اور بہت پریشان ہیں۔'' میں نے چپل میں بمشکل پاؤں ڈالا اور لنگڑاتی ہوئی باہر کی جانب لپکی۔
''ارے بیٹا اس کے پیچھے جاؤ' کہیں یہ باؤلی اکیلی ہی گاڑی لے کر نہ نکل جائے۔ اے خدایا! کیا قیامت ٹوٹی ہے ان ماں باپ پر۔'' اماں بھی رونے لگیں جب کہ امی بس خاموش منہ ہی منہ دعائیں پڑھ رہی تھیں۔
حماد میرے پیچھے پیچھے آیا اور بھاگتا ہوا گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا' میں بھی جلدی سے اس کے ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹا لے کر باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر حشام کی زندگی کے لیے دعا کرنے لگی جب سے میری طلال انکل سے بات ہوئی تھی تب ہی مجھے اس واقعے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔
میں اتنی بے تابی سے گھر سے نکلی تھی کہ موبائل صوفے پر پڑا رہ گیا اور میں اسپتال چلی گئی۔ انکل نے مجھے اسپتال کا نام بتادیا تھا' اس لیے ہم تیزی سے ڈرائیونگ کرتے جلد ہی اسپتال پہنچ گئے۔ سارے راستے میں دعائیں مانگتی رہی' میں اللہ تعالیٰ سے کہہ رہی تھی۔
''اے میرے پیارے اللہ تعالیٰ! اب میں آپ سے اور کچھ نہیں مانگوں گی' بس آپ حشام کو زندہ رکھیں' وہ ہم سب کی جان ہے۔ میری' انکل کی' آنٹی کی۔ وہ نہیں رہا تو ہم سب کیسے رہیں گے۔'' آج حقیقت میں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ حشام کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔
سارے راستے حماد بالکل خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا' وہ جو بھی سوچ رہا ہو میرے اور حشام کے بارے میں مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔
ہم اسپتال پہنچے تو مجھ سے گاڑی سے پاؤں نیچے نہیں رکھا جارہا تھا' پاؤں میں شدید تکلیف تھی۔ میں نے اپنے جبڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے بھینچ کر درد کو برداشت کیا اور حماد کے ہاتھ کا سہارا لیتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھادیے۔
''ٹھہرو میں تمہارے لیے وہیل چیئر لے آتا ہوں۔ تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔'' حماد نے میرا چہرہ دیکھ کر کہا۔
''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے' میں چل لوں گی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
اندر پہنچے تو لوگوں کا بے تحاشا رش لگا ہوا تھا' آفس کے بہت سے لوگ تھے' رمضانی صاحب بھی موجود تھے' پریس اور میڈیا کے لوگ بھی تھے۔
میں سیدھی آنٹی کی جانب بڑھی وہ مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں نے اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر خود پر نہ جانے کس طرح قابو پایا اور آنٹی کو تسلیاں اور دلاسے دینے لگی۔
''حشام کو اس وقت آپ کے رونے کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔ آنسو اگر بہانے ہی ہیں تو اللہ کے آگے التجا کرتے اور گڑگڑاتے ہوئے بہائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور اللہ کا کرم ہوگا۔''
آنٹی سے بات کرکے میں لنگڑاتے ہوئے انکل کی جانب بڑھی۔ یہاں رمضانی صاحب اور چینل کے دوسرے ساتھی اور پولیس کے آدمی موجود تھے۔
''ارے تمہیں کیا ہوا؟'' انکل نے مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔
''ارے بھئی یہ میری غلطی تھی' وہاں اتنی زیادہ ہنگامہ آرائی ہو جائے گی اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ پھر سنا کہ وہاں ہونے والے پتھراؤ سے سرمئی زخمی ہو گئی تو میں

نے ان لوگوں کو بلوالیا اور حشام کو دوسری ٹیم کے ہمراہ وہاں بھیج دیا۔" رمضانی صاحب نے وضاحت کی۔

میں انکل کے پاس بیٹھ گئی اور پوچھا۔ "انکل حشام کو کتنی گولیاں لگی ہیں اور کہاں؟"

"تین گولیاں لگی ہیں' ایک بازو میں ایک ٹانگ میں اور ایک سینے میں۔ جو پسلی کو توڑتی ہوئی اندر چلی گئی ہے۔ خون بھی کافی بہہ گیا ہے۔" انکل نے آہستہ سے بتایا۔

"حشام کے ساتھ کیمرہ مین کون گیا تھا رمضانی صاحب؟" میں نے انکل کے سامنے سے جھک کر رمضانی صاحب کو مخاطب کیا۔

"جاوید اور شہزاد تھے۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں ہیں وہ دونوں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں تھے' تم فون کرلو۔" انہوں نے جواب دیا تو میں نے جاوید کا نمبر یاد کرکے انکل کے موبائل فون سے نمبر ملایا اور کال کا بٹن پش کردیا۔

جاوید نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی اور بولا۔ "سرمئی تمہیں حشام کا پتا چلا؟"

"تم کہاں ہو اس وقت؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو اسپتال میں ہوں' تم اب کیسی ہو؟ تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" اس نے یہ سمجھا کہ میں اپنے گھر سے کال کررہی ہوں۔

"میں یہاں رمضانی صاحب کے پاس بیٹھی ہوں جاوید! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ ذرا اسپتال کے کینٹین میں آجاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا تمہیں علم ہوگیا حشام کے زخمی ہونے کا۔ اچھا میں آرہا ہوں۔" جاوید نے جلدی سے کہا۔

جاوید ایک معصوم اور بہت سیدھا سا لڑکا تھا' بہت جلدی جلدی بولتا تھا' بعض اوقات تو وہ جملہ اتنی تیزی اور روانی سے ادا کرتا تھا کہ سامنے والے کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا اور سب اس سے ہنس کر کہتے۔

"اپنی تیز گام کو بریک لگاتے ہوئے بات کرو۔"

دبلے پتلے جسم والے جاوید کی نگاہ اور مشاہدہ بہت غضب کا تھا اور اپنی چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود وہ بڑے کام کا بندہ تھا۔ ایسے موقعوں پر بہترین عکاسی کرتا تھا۔

میرے دل میں رہ رہ کر بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے اور میرے خیال میں میرے ان سوالوں کے تسلی بخش جوابات جاوید ہی دے سکتا تھا اور یہ تو بہت ہی اچھی بات تھی کہ اس وقت جاوید حشام کے ساتھ تھا۔

میں ان لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر خاموشی سے ان کے درمیان سے اٹھ گئی۔ میں نے دوسری جانب جاکر آنٹی پر ایک نگاہ ڈالی وہ بند آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے دعا کررہی تھیں۔ دعائیں تو میرا دل بھی ہر لمحہ کررہا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے بہت کچھ جاننا ضروری تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس واقعے کو اتفاقی حادثہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا' بس بار بار ایک ہی بات دماغ میں ڈنک مار رہی تھی کہ حشام کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔ اب اس کی وجوہات کیا تھیں' اس کے بارے میں بھی انکل سے بعد میں تفصیلی بات ہوسکتی ہے' انکل طلال ایک سینئر جرنلسٹ تھے' ان کا صحافت کی دنیا میں ایک بڑا نام تھا اور اسی حوالے سے ان کی بہت سے لوگوں سے ٹھیک ٹھاک لگتی تھی' ہوسکتا ہے کہ کسی نے......

میں اپنی تکلیف برداشت کرتی اور لنگڑاتی ہوئی کینٹین کے قریب پہنچ گئی۔ دور سے ہی مجھے جاوید کینٹین کے دروازے پر کھڑا دکھائی دے گیا۔ اس کی میرے اوپر نگاہ پڑی تو تیزی سے میرے نزدیک آگیا اور بولا۔

"ارے سرمئی! تمہارے پاؤں میں تکلیف تھی تو خود کیوں آئیں مجھے وہیں بلالیا ہوتا جہاں تم بیٹھی تھیں۔"

"بلا تو سکتی تھی جاوید لیکن وہ باتیں میں تم سب کے سامنے نہیں کرسکتی تھی۔" میں نے اس کے ہاتھ کا سہارا لیا اور کہا۔ "کسی ایسی جگہ بیٹھو جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کرسکیں۔"

"پھر تو کینٹین میں جانا بے کار ہی ہے کیوں کہ اندر خاصا رش ہے اور شور بھی۔ اچھا ایسا کرتے ہیں وہاں جاکر بیٹھتے ہیں۔" اس نے سامنے ایک گیلری کی جانب اشارہ کیا' جہاں آمنے سامنے ان ڈاکٹرز کے روم تھے جو مختلف امراض کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور دن میں او پی ڈی کرتے تھے وہاں لائن سے بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور یہ حصہ سنسان پڑا تھا۔

میں اور جاوید ان کرسیوں پر بیٹھ گئے پھر بھی احتیاطاً ہم نے گفتگو کے دوران اپنی آوازیں دھیمی رکھیں۔

"تم مجھے سارا واقعہ سناؤ جاوید کہ کیا ہوا تھا؟ حشام کہاں تھا اور گولیاں اسے کس طرح لگیں؟" میں نے بیٹھتے ہی بے صبری سے جاوید سے سرگوشی میں سوال کیا۔

"یقین جانو سرمئی! مجھے بھی شدید حیرت ہے کہ حشام کو وہ گولیاں کس طرح لگ گئیں کیوں کہ جہاں ہم کھڑے تھے وہ حصہ تو بالکل سیف تھا میں ہاتھ میں کیمرہ سنبھالے ویڈیو بنارہا تھا' لوگوں کا بپھرا ہوا جم غفیر تھا' پولیس میں اور لوگوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا' تو کافی مجمع چھٹ گیا اور بس پھر اچانک ہی حشام کی ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ وہ مڑا' سیدھا ہوا اور مزید گولیاں اس کے لگیں۔ میں نے اور شہزاد نے حشام کے گرتے ہوئے جسم کو سنبھالا اور اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر وہاں سے بھاگے۔" جاوید نے بتایا۔

"اچھا تو جس وقت حشام کو گولیاں لگیں تم ویڈیو بنارہے تھے۔" میں نے اچانک ایک خیال کے تحت تیزی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں' ابھی تو بتایا ہے۔" جاوید نے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا جاوید کہ حشام کو یہ گولیاں اتفاقاً حادثتاً نہیں لگیں بلکہ اسے جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "میں حیران ہوں کہ مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کیوں کہ اتفاقاً اسے گولی لگی لیکن ایک ہی بندے پر متواتر تین فائر...... یہ تو سوچی سمجھی اسکیم لگتی ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے' اب تم یہ بھی سوچو کہ وہ گولیاں اگر اتفاقاً لگی تھیں تو تمہیں یا وہاں موجود کسی اور شخص کو کیوں نہیں لگیں۔" میں نے مزید جاوید کی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو ارے یار! یہ تو بریکنگ نیوز ہے۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ششش......" میں نے اسے منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کے لیے کہا۔ "مجھ سے وعدہ کرو' تم ابھی ایسی کوئی بات کسی سے بھی نہیں کرو گے۔ جب تک ہم اس سارے معاملے کی کھوج نہیں لگالیتے۔" میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"اوکے! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں' تم بے فکر رہو۔ میں ایسا کچھ نہیں کہوں گا۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ شاید وہ اس سارے واقعہ کو ذہن میں دہرا کر کچھ تلاش کررہا تھا۔ کوئی نکتہ' کوئی انہونی بات' کوئی ایسا شخص جو اس کی نگاہ میں اور کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہوگیا ہو۔

"جاوید......!" میں نے سنسنی خیز لہجے میں اسے پکارا۔
"ہوں......ہاں......" وہ چونک کر بولا۔
"وہ کیمرہ اور وہ ویڈیو کہاں ہے جو تم نے اس وقت بنائی تھی؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"کیمرہ تو آفس میں ہی چھوڑ آیا۔ ویڈیو بھی اسی میں ہے۔" اس نے کہا۔
"پھر چلو اٹھو! ابھی ہم فوراً اپنے آفس چلتے ہیں، تمہیں وہ ویڈیو فوری طور پر کیمرے سے غائب کرنی ہوگی۔ ہوسکتا ہے اس کے ذریعے ہمارے ہاتھ کوئی بہت بڑا ثبوت لگ جائے اور جیسا ہم سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو۔ جاوید مجھے اس سارے واقعے سے ایک بہت بڑی سازش کی بُو آرہی ہے۔ رمضانی صاحب اور بہت سے لوگ یہیں موجود ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو ناں کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔" میں نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی جاوید سے بہت کچھ کہہ دیا۔
"ہاں بالکل چلو۔" وہ جھٹ کھڑا ہوگیا۔
"اچھا تم ایسا کرو کہ میری گاڑی میں جاکر بیٹھو۔ یہ لو چابی، میں انکل سے کہتی ہوں کہ میرے پیر میں بہت تکلیف ہورہی ہے اور میں گھر جارہی ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی گاڑی کی چابی جاوید کے حوالے کی، جو گاڑی سے اترنے کے بعد حماد نے میرے حوالے کردی تھی اور خود نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا اور وہاں اتنے لوگوں میں مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔
جاوید وہاں سے فوراً ہی اٹھ کر چلا گیا تو میں بمشکل اپنا پاؤں گھسیٹتی ہوئی انکل کے پاس آئی آپریشن ابھی جاری تھا وہ ہنوز پریشان بیٹھے تھے اور رمضانی صاحب انکل کو تسلیاں دے رہے تھے۔
"تم کہاں تھیں بیٹی! آنٹی کے پاس......؟" انکل نے پوچھا۔
"جی انکل! میں آنٹی کے پاس تھی، وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ انکل میں گھر جارہی ہوں، میرے پیر کی تکلیف ناقابل برداشت ہورہی ہے۔" میں نے کہا تو انکل نے عجیب حیران نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور کچھ نہیں بولے بلکہ رمضانی صاحب بولے۔
"ہاں ہاں سرمئی! تم گھر جاکر آرام کرو۔ دعا تو تم گھر پر بھی کرسکتی ہو۔ ویسے بھی یہاں اتنے لوگوں کا جمع ہونا ٹھیک نہیں ہے۔"
تو میں رمضانی صاحب کو کوئی جواب دیئے بنا ہی وہاں سے چل دی۔ میں سمجھ رہی تھی اس بات کو کہ انکل میرے اس جملے سے شاکڈ سے ہوگئے تھے کہ میں انہیں اور آنٹی اور خاص طور پر حسام کو اس حالت میں چھوڑ کر جارہی ہوں اور مجھے اپنی اتنی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں ہورہی جب کہ حسام آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔
لیکن یہ وقت نہیں تھا کہ میں انہیں اپنے جذبات سے آگاہ کرتی یا وہ کام بتاتی جس کے لیے میں انہیں اس مشکل گھڑی میں چھوڑ کر جارہی تھی میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ جو بھی کرنا ہے وہ اللہ اور اس کے بعد ڈاکٹر نے کرنا ہے لیکن میں جو کام کرنے جارہی تھی وہ اپنی جگہ اہم ہے۔ کوئی ان دیکھا ہاتھ اس ویڈیو کو غائب بھی کرسکتا تھا۔
میں پارکنگ ایریا میں آئی تو اندھیرے میں شیڈ کے نیچے میں نے ایک سائے کو دیکھا جو فون پر کسی سے بات کررہا تھا مجھے آتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے ہلا تو میں نے اسے پہچان لیا وہ حماد تھا۔ نہ جانے کیوں میں اس وقت اتنی حساس ہورہی تھی، میری ساری حسیں بیدار تھیں خاص طور پر چھٹی حس۔ حماد کو اس طرح فون پر باتیں کرتے دیکھ کر میں اس کی جانب

سے مشکوک سی ہوگئی اور گاڑی کا دروزہ کھولتے ہوئے میں نے با آواز بلند زور سے کراہتے ہوئے کہا۔
"جلدی گھر چلو جاوید! مجھ سے پاؤں کی تکلیف برداشت نہیں ہورہی ہے۔" اور میں تیزی سے سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کردیا۔
"گھر......" جاوید نے حیران کن لہجے میں کہا۔
"تم گاڑی باہر نکالو میں بتاتی ہوں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔
جاوید نے ہیڈ لائیٹس آن کیں تو حماد نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا لیکن پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا وہ سو فیصد حماد ہی تھا۔ وہ کیوں مجھ سے اپنے آپ کو چھپا رہا تھا اس نے مجھے دیکھ لیا تھا تو میرے قریب آکر میرا حال بھی پوچھ سکتا تھا۔
"تم اپنے آفس ہی چلو۔" میں نے اسپتال سے گاڑی کے نکلتے ہی کہا۔
"لیکن تم نے گھر کیوں کہا؟" اس نے پوچھا۔
"حماد کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔
"حماد کی وجہ سے......؟" اس نے حیرانی سے جملہ دہرایا۔ "لیکن حماد کہاں تھا، مجھے تو دکھائی نہیں دیا؟"
"وہ پیچھے کھڑا تھا اور میں نے آتے ہوئے اسے دیکھ لیا تھا وہ فون پر کسی سے بات کررہا تھا اور گھر پر اس نے مجھ سے بہت بے پروا لہجے میں کہا تھا کہ "پتا نہیں وہ زندہ ہے یا مرگیا یہ تو اسپتال جاکر پتا چلے گا۔" جب کہ ایک کولیگ کی حیثیت سے اسے یہ جملہ اور اس انداز سے ادا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، ہم سب ہی کو اس واقعہ کا بہت افسوس ہوا ہے، دکھ پہنچا ہے، بلکہ جب ڈاکٹرز نے بلڈ کی اپیل کی تو سب کے سب اپنا بلڈ دینے کے لیے تیار ہوگئے اور دیکھ لو کہ اتنا خون جمع ہوگیا کہ ڈاکٹرز نے منع کردیا کہ اب بلڈ کی مزید ضرورت نہیں ہے۔" جاوید نے کہا۔
"ابھی کیا تم جاکر وہ ویڈیو دیکھو گی؟" جاوید نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا
"نہیں!" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "اس کام کے لیے ٹائم نہیں ہے، ہمیں دوبارہ اسپتال پہنچنا ہے، فی الحال تو میں یہ چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ وہ ویڈیو کوئی اور دیکھے ہمیں اسے اپنے قبضے میں کرلینا چاہیے۔" میں نے کہا۔
میرا دل ایک بار پھر حسام کی جانب چلا گیا، دل ہی دل میں میں نے نہ جانے کون کون سی منتیں مانگ لی تھیں۔ اتنی باتوں کے دوران بھی میرا دل ایک لمحہ کے لیے بھی حسام کی جانب سے غافل نہیں ہوا تھا، دل سے بس ایک ہی دعا نکل رہی تھی کہ یااللہ میرے حسام کی زندگی لوٹا دے۔
بقیہ راستہ ہم نے خاموشی سے اپنی اپنی سوچوں میں گم طے کیا۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرکے جاوید تیزی سے اترا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے زمین پر پاؤں رکھا تو تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اب ایک قدم بھی چل نہیں پارہی تھی پھر مجھے حسام کا خیال آیا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے اس کے جسم پر جب تین گولیاں لگی ہوں گی تو اس کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ میری یہ تکلیف تو اس کی تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔
بس اسی بات سے مجھے حوصلہ ملا اور میں خود پر بہت ضبط کرکے کھڑی ہوگئی اور پھر جیسے تکلیف کا وہ شدید احساس میرے ذہن سے محو ہوگیا۔
"کیا ہوا سرمئی! آؤ، ناں؟" جاوید نے آگے جاکر جب مجھے اپنے سامنے نہ پایا تو پیچھے مڑ کر دیکھا

تو مجھے گاڑی میں بیٹھا ہوا پایا۔
میں فوراً گاڑی سے اتر آئی اور جاوید کی جانب چل دی۔ ہم دونوں بنا کسی سے کوئی بات کیے سیدھے جاوید کے کیبن کی جانب بڑھے' جاوید نے اپنے کیبن میں موجود چھوٹی سی الماری کا لاک کھولا اور کیمرہ نکال کر اس میں موجود ویڈیو کیسٹ نکال کر جیب میں رکھ لی' پھر اس میں دوسری کیسٹ لگائی اور ویڈیو کیمرہ دوبارہ سے الماری میں رکھ کر اسے لاک کر دیا پھر ہم دونوں اسی خاموشی سے باہر نکل آئے۔
راہداری سے گزرتے ہوئے ہمارا سامنا سلطان سے ہو گیا۔ وہ بھی نیوز رپورٹر تھا' اس نے رک کر ہیلو ہائے کیا پھر بولا۔
"سنا ہے تم بھی زخمی ہو گئی تھیں' کہاں چوٹ لگی؟"
"ارے ایسا کچھ خاص نہیں ہے بس ایک چھوٹا سا پتھر مجھے لگا ہے' اس کا اتنا شور مچ گیا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔
"اچھا!" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں نے تو یہ سنا تھا کہ تم بہت زیادہ زخمی ہو گئی ہو اور شاید رمضانی صاحب کو بھی کسی نے غلط نیوز دی تھی اسی لیے انہوں نے تمہیں وہاں سے بلوا لیا اور حشام کو زبردستی وہاں بھیج دیا۔" سلطان نے کہا۔
"کیا مطلب اس کا کہ زبردستی بھیج دیا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔
"ہاں وہ حشام یہاں کسی ضروری کام میں مصروف تھا اس نے انکار بھی کیا کہ وہ اس وقت کوئی اہم رپورٹ فائنل کر رہا ہے' رمضانی صاحب کسی اور کو بھیج دیں لیکن انہوں نے اس کی بات نہیں سنی اور حشام پر زور دیا کہ وہی وہاں جائے' مجبوراً حشام کو ان کی بات ماننی پڑی۔ شاید اس کے نصیب میں یہ تکلیف ہی لکھی تھی اور وہ وہاں چلا گیا۔ کاش وہ وہاں نہ جاتا۔" سلطان نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو ایک لمحہ کے لیے میری اور جاوید کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر ہم نارمل ہو گئے۔
"ارے ہاں وہ جو اپنا حماد ہے ناں اس نے حشام سے کہا" یار تمہاری دوست سرمئی دشمنوں کے نرغے میں ہے وہ شدید زخمی ہو گئی ہے تمہیں فوراً جانا چاہیے اور یہ بات سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔" سلطان نے ایک اچانک بات یاد آنے پر کہا۔
"اچھا تو اسے حماد نے اس طرح کہا تھا۔" جاوید بولا۔
"ہاں یہ میرے سامنے کی بات ہے۔" سلطان نے کہا۔ "بہر حال جو ہوا بہت برا ہوا' اللہ تعالیٰ حشام کو زندگی دے' بہت اچھا بندہ ہے۔ اپنے کام کا ماہر بھی۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"تمہیں پتا ہے کہ حشام کون سی رپورٹ بنا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے تو ایسی کسی رپورٹ کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے حیرانی سے کہا۔
"تم بھی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو' ہمارا شعبہ ہی ایسا ہے یہاں بہت سی باتیں اپنوں سے بھی خفیہ رکھنی پڑتی ہیں۔" سلطان نے کہا اور کسی ضروری کام کا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ میں انکل طلال کو فون کر کے حشام کے بارے میں معلوم کرتی ہوں۔ میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا تو میرا موبائل نہیں تھا' میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ گھر پر انکل طلال سے بات کرنے کے بعد میں اتنی حواس باختہ ہوئی کہ موبائل وہیں چھوڑ دیا اور پرس اٹھا کر چلی آئی۔
"کیا ہوا سرمئی! کیا تلاش کر رہی ہو؟" جاوید نے پوچھا۔
"ارے میں پریشانی میں اپنا سیل فون گھر پر ہی

چھوڑ آئی ہوں۔"
"تو کوئی بات نہیں اگر تمہیں کسی سے بات کرنی ہے تو میرا فون استعمال کر لو۔" جاوید نے اپنا فون جیب سے نکال کر میری جانب بڑھایا۔
پہلے میں نے سوچا کہ جاوید سے کہوں کہ وہ فوراً انکل سے بات کرے لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے جاوید سے فون لے لیا اور انکل طلال کا نمبر ملایا' کافی ساری بیل بجنے کے بعد انکل نے فون ریسیو کیا اور بھرائی ہوئی بھاری آواز میں "ہیلو" کہا۔
"السلام علیکم انکل! میں سرمئی بول رہی ہوں' حشام کا آپریشن ہو گیا..... کیسا ہے وہ؟"
"ہاں سرمئی!" انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ تمام گولیاں اس کے جسم سے نکال لی گئی ہیں لیکن ابھی چھتیس سے اڑتالیس گھنٹے اس کے لیے بہت اہم ہیں۔ ابھی بھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ تم ٹھیک ہو' تمہارے پاؤں کا درد کیسا ہے' میں نے خبر سب سے پہلے تمہیں سنائی تھی لیکن بار بار فون کرنے کے باوجود تم نے فون ریسیو نہیں کیا شاید تم سو گئی تھیں۔" انکل کے لہجے میں مجھے ہلکی سی طنز کی بو محسوس ہوئی۔
"انکل آپ اس وقت کہاں ہیں؟ کوئی آپ کے پاس تو نہیں ہے' مجھے ایک بہت ضروری بات آپ سے کرنی ہے۔" میں نے انکل کے طنزیہ جملے کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا' کیوں کہ جس سچویشن میں وہ اس وقت ہیں اور جو غیروں والی حرکت میں نے کی تھی وہ ایسی بات سوچنے میں حق بجانب تھے۔
"میرے پاس اس وقت تمہاری آنٹی بیٹھی ہیں اور ہم شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے' کیوں خیریت ہے تم کون سی اہم بات کرنا چاہ رہی ہو؟ اس وقت تو میرے لیے سب سے زیادہ اہم میرے حشام کی زندگی ہے۔" اس وقت ان کا لہجہ اکھڑ گیا۔
"میری بات توجہ سے سنیں انکل! میں گھر پر نہیں ہوں اور نہ ہی گھر گئی تھی' میرا سیل فون پریشانی میں گھر پر ہی رہ گیا ہے۔ میں ایک اہم بات کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہوں کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ حشام کسی اتفاقی حادثے کا شکار نہیں ہوا ہے بلکہ اس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے اسے اسٹاپ پر زبردستی بھیجا گیا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" انہوں نے چونک کر تیزی سے کہا۔
"میں آپ سے تنہائی میں تفصیلی بات کروں گی لیکن ابھی نہیں آپ بھی بالکل خاموش رہیں گے' بس اللہ تعالیٰ حشام کو اس مشکل سے نکال لے۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"آمین۔" انہوں نے صدق دل سے کہا۔
"کیا آپ کے علم میں ہے کہ حشام کوئی رپورٹ.....؟"
"بس کرو سرمئی! بعد میں بات کرنا' وہ دیکھو سامنے رمضانی صاحب کی گاڑی آ رہی ہے' پلیز تم فوراً اپنا سر نیچے کر لو۔ انہیں تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہیے۔" جاوید نے خود بھی جھکتے ہوئے کہا۔
"او کے انکل! میں صبح ہوتے ہی اسپتال آؤں گی' آپ کو حشام کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ ہر ایک سے بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ فی الحال ہم اندھیرے میں ہیں' سوائے روشنی کی ایک دو کرنوں کے۔ میں انہی کی روشنی میں اصل حقائق جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔" میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا' معلوم نہیں انہیں میری بات سمجھ میں آئی بھی یا نہیں۔
میں اور جاوید پوری طرح نیچے سر کیے جھکے ہوئے

تھے رمضانی صاحب کی گاڑی پارکنگ میں آئی اور وہ اتر آئے پھر میرے اور جاوید کے کانوں نے بہت اہم بات سنی۔ رمضانی صاحب کسی سے بات کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزرتے چلے گئے اس دوسرے شخص کی بات بھی ہم نے سنی اور اسے آواز کے ذریعے شناخت کرلیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جاوید نے وہ ویڈیو کی کیسٹ میرے حوالے کی اور کہا۔

"سر مئی! اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے' اسے تم سنبھال کر رکھو۔"

میں نے کیسٹ کو سنبھال کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور جاوید سے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ مجھے میرے گھر پہنچا دے پھر میں نے اس سے درخواست کی کہ کیا کل صبح وہ مجھے اسپتال لے جانے کے لیے پک کرسکتا ہے' اس نے خوش دلی سے ہامی بھرلی۔

اور پھر کمزور سے وجود کا بہادر جاوید میری کار کو کسی جیٹ طیارے کی مانند اڑانے لگا' رات کا پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا ہم سڑکیں سنسان ہونے کی وجہ سے جلد ہی گھر پہنچ گئے۔

گھر پہنچی تو وہ تینوں جاگ رہے تھے امی' بابا اور اماں۔ تینوں جائے نماز پر بیٹھے دعائیں کررہے تھے۔

میرے اصرار پر جاوید گھر کے اندر آ گیا' ہمیں دیکھ کر تینوں بے تابی سے کھڑے ہوگئے اور حشام کی خیریت پوچھنے لگے۔ امی نے بھی شکایت کی کہ تمہیں بار بار فون کیا لیکن تم فون کیوں نہیں ریسیو کررہی تھیں ادھر یہ سوچ سوچ کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا کہ اللہ جانے اُدھر کیا ہوا ہے۔

"امی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپریشن تو کامیاب رہا ہے لیکن ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ابھی چھتیس سے اڑتالیس گھنٹے حشام کے لیے بہت اہم ہیں۔ امید ہے اللہ کریم کی ذات سے کہ جس نے اتنا کیا ہے آگے بھی وہ سب اچھا کردے گا۔ حشام ان شاءاللہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ جس کے لیے اتنے زیادہ ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھیں' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے اس یقین اور اعتماد سے کہا جو مجھے اپنے ربّ کی ذات پر تھا۔

"اور ہاں امی میرا موبائل فون میرے پاس نہیں ہے میں جلدی میں یہیں بھول گئی تھی' آپ نے کال کی تو میرے فون کی بیل سنائی نہیں دی آپ کو۔" میں نے کہا۔

"نہیں تو......؟ کہاں چھوڑا تھا تم نے' تلاش کرو جا کر اور ہاں تمہارے پیر کا کیا حال ہے؟" امی نے کہا۔

"میرے پیر کو چھوڑیں یہ ٹھیک ہے بس آپ حشام کے لیے دعا کریں۔" میں یہ کہتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی جہاں جاوید بیٹھا تھا۔

میں نے اسے سوری کیا اور فون تلاش کرنے لگی۔ میرا اسیل فون صوفے کی گدیوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا شاید اسی لیے اس کی بیل کسی کو سنائی نہیں دی' ویسے بھی وہ سب دوسرے کمرے میں تھے۔ میں نے فون میں دیکھا بہت ساری مس کالز تھیں' شمروز بھائی طلال انکل اور گھر کے فون کی۔

"اچھا میں چلتا ہوں صبح آجاؤں گا۔" جاوید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم جاؤ گے کیسے' تمہاری بائیک تو اسپتال کے پارکنگ میں کھڑی ہے تم ایسا کرو کہ میری گاڑی لے جاؤ صبح جلدی آجانا۔" میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جانے لگا۔

اتنے میں اماں ٹرے میں چائے لیے ہوئے

آ گئیں اور بولیں۔

"بیٹا! کب سے پریشان ہو رہے ہو' چائے پی لو۔"

جاوید نے میری جانب دیکھا جیسے اجازت مانگ رہا ہو کہ چائے کی آفر قبول کرلوں یا نہیں۔

"اچھا کیا اماں آپ نے کہ چائے بنالائیں۔" پھر میں نے چونک کر پوچھا۔

"تم نے رات کا کھانا کھایا تھا؟"

"کھانے کا کس کو ہوش تھا' تم میرا چھوڑو انکل اور آنٹی کے بارے میں سوچو۔" جاوید نے خلوص بھرے لہجے میں کہا۔

"کھانا تو بیٹا ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کھایا ہے' کہو تو گرم کرکے لاؤں۔" اماں نے کہا۔

"نہیں نہیں آنٹی! اس کی ضرورت نہیں ہے' بس چائے کافی ہے۔ البتہ صبح لے جانے کے لیے انکل اور آنٹی کے لیے کھانا ضرور دے دیجیے گا۔" جاوید نے کہا۔

"بیٹا! اب تو ذرا ہی دیر میں فجر ہونے والی ہے' تم اب گھر جاؤ گے پھر آؤ گے' میری مانو تو یہیں ذرا دیر کو کمر سیدھی کرلو۔ نماز سے فارغ ہو کر تم لوگ چلے جانا۔ میں کھانا اور چائے وغیرہ سب تیار رکھوں گی۔ ہاں واقعی بچارے ماں باپ کیسے حیران و پریشان بیٹھے ہوں گے۔ اکلوتی اولاد ہے وہ ان کی۔ اللہ سلامت رکھے۔" اماں نے کہا تو مجھے ان کی بات ٹھیک لگی اور میرے بہت اصرار پر جاوید وہیں صوفے پر لیٹ گیا اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

اور اندر آتے ہی جیسے ضبط پر باندھے ہوئے بندھن سارے ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔

میں دیر تک روتی رہی پھر خیال آیا تو جلدی سے وضو کرکے آئی اور جائے نماز پر کھڑی ہوگئی دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر میں نے اپنا سر سجدے میں رکھ دیا اور رو رو کر اور گڑگڑاتے ہوئے حشام کی صحت وسلامتی کی دعا مانگنے لگی۔

مجھے نہیں پتا کہ کتنا وقت گزر گیا' فجر کی اذانیں جب میرے کانوں میں آئیں تو میں نے سر اٹھایا تو امی کو اپنے قریب بیٹھے ہوئے پایا' مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں' میں سجدے سے اٹھی تو انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور محبت سے بھینچ کر بولیں۔

"مجھے یقین ہے اس اللہ کی ذات سے جس نے ایک ظالم شخص سے تمہاری جان بچائی تھی اور آج بھی وہ میری بیٹی کا پیار اس سے جدا نہیں کرے گا' وہ ضرور صحت یاب ہوگا میری جان! اللہ پر پورا بھروسہ رکھو' ان شاءاللہ تم حشام کے ساتھ ایک بہترین اور خوش گوار زندگی گزارو گی۔"

"آپ سچ کہہ رہی ہیں ناں امی!" میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

"بالکل سچ!" انہوں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور میرے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگیں پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں فجر پڑھ کر آتی ہوں' تم بھی پڑھ لو پھر ناشتہ کرکے جانا۔ پتا نہیں کب کا کھایا ہوا ہے۔"

میں نماز کے لیے کھڑی ہو رہی تھی کہ مجھے شمروز بھائی کا خیال آیا اپنے فون پر میں نے ان کی بھی بہت سی مس کالز دیکھی تھیں۔ اس وقت میرے ذہن سے بالکل ہی یہ بات نکل گئی کہ کل میں نے نواب سطوت کو ایک دھماکہ خیز ای میل بھیجی تھی۔ اس لیے سوچا کہ ان کو تو حشام کے بارے میں بتا دوں حالاں کہ میں جانتی تھی کہ وہ اس وقت سو رہے ہوں گے لیکن ابھی کال نہ کرتی تو سارا دن مجھے ٹائم ہی نہیں ملتا' اسی لیے ان کا نمبر ملایا' انہوں نے کافی دیر کے بعد فون اٹھایا

اوران کی آواز سن کر ایک بار پھر مجھے رونا آ گیا۔
شمروز بھائی نے اس ای میل کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا لیکن اس وقت مجھے کسی اور بات میں دلچسپی نہیں تھی' اس لیے ان سے مختصر بات کر کے میں نے فون بند کر دیا اور نماز پڑھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
جاوید جاگ ہی رہا تھا امی اور آنٹی کے اصرار پر ہم نے تھوڑا سا ناشتہ کیا پھر اماں نے کھانے کا ٹفن اور چائے کے تھرماس کے ساتھ پانی کی بوتل اور گلاس وغیرہ سب ایک باسکٹ میں رکھ کر مجھے دے دیئے۔ امی نے تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر میں ان کی آنٹی سے ضرور فون پر بات کرواؤں۔ وہ مجبور تھیں اسپتال نہیں جاسکتی تھیں' معاملہ ہی ایسا تھا کہ امی کا پبلک پلیس پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔
باسکٹ جاوید نے اٹھائی اور ہم باہر آ گئے' چلتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرا پاؤں کافی سوج گیا ہے۔ میں نے ایک نگاہ اپنے سوجے ہوئے پاؤں پر ڈالی اور جلدی سے دوائیں اپنے بیگ میں رکھ لیں' چلتے ہوئے جاوید ہی نے یاد دلایا کہ میں نے وہ ویڈیو کیسٹ تو سنبھال کر رکھ دی ہے تو میں نے ایک بار پھر اپنے سر پر ہاتھ مارا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آئی۔
میں نے وہ کیسٹ ایک محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھی اور باہر آ گئی' جاوید بولا۔
"سرمئی! جب تک ہم اس ویڈیو کو نہایت باریک بینی سے دیکھ نہیں لیتے' تمہیں اس کی بہت حفاظت کرنی ہوگی اور ایک بات بتاؤں تمہیں نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی میرے ویڈیو کیمرے سے کیسٹ ضرور نکالے گا۔ اسی لیے میں نے اصل کیسٹ نکال کر اس کی جگہ دوسری کیسٹ لگا دی تھی۔"
"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو' بس تم مجھے اسپتال چھوڑ کر چلے جانا اور آفس جانے کے بجائے گھر جانا' تھوڑا آرام کرلینا۔ میری خاطر اتنی تکلیف اٹھائی میں تہہ دل سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" میں نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ کہا۔
"کتنی غیروں والی بات کردی تم نے' کیا حشام میرا دوست نہیں ہے۔ مجھے بھی وہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا تمہیں۔" جاوید نے کہا اور میں نے دل میں سوچا کہ تم نے بالکل غلط کہا تمہیں کیا معلوم کہ حشام کی زندگی میرے کے لیے کتنی ضروری ہے۔ میرا تو رواں رواں پور پور اس کی محبت میں گرفتار تھا۔ مجھے تو زندگی میں بابا کے بعد ایک مرد کی محبت ملی تھی' پہلا اور آخری آنے والا شخص میری زندگی میں حشام تھا۔ بس اب اس کے بعد کوئی اور نہیں۔
صبح کا وقت تھا' سورج نے ابھی زمین پر اپنی کرنیں بکھیرنی شروع کی تھیں۔ اسپتال میں زیادہ رش نہیں تھا' میں اور جاوید باسکٹ اٹھائے سیدھے اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے انکل اور آنٹی کو چھوڑا تھا۔ لیکن ہمیں وہ وہاں نہیں ملے' حشام کو آپریشن تھیٹر سے ملحق آئی سی یو میں رکھا ہوا تھا۔ انکل اور آنٹی وہیں بیٹھے تھے' آنٹی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور انکل قدرے فاصلے پر کھڑے ایک ڈاکٹر سے بات کر رہے تھے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بہت دھیمے لہجے میں انکل سے کوئی بات کر رہا تھا اور انکل خاموشی سے سنتے ہوئے آہستہ آہستہ سر ہلا رہے تھے اور خاصے تشویش کے آثار ان کے چہرے پر تھے۔
میں اور جاوید آنٹی کے پاس بیٹھ گئے' میں نے انہیں گلے لگا کر تسلی دی۔ جاوید انکل کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئیں تو ان سے مل کر حشام کی خیریت معلوم کرے' وہ رات بھر اپنے گھر نہیں گیا تھا۔
انکل ڈاکٹر کے جانے کے بعد آئے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ میں نے ابھی بولنے کے لیے لب

کھولے ہی تھے کہ آنٹی بے تابی سے بول اٹھیں۔
"ڈاکٹر آپ کو کیا بتا رہا تھا' میرا بچہ اب کیسا ہے؟"
"اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس کی طبیعت بہتر ہے' اللہ مزید کرم کرے گا۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔
"آپریشن کے بعد حشام کو ہوش آ گیا تھا ناں۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔
"ہاں اسے ہوش آیا تو تھا تب ہی تو ڈاکٹر نے آپریشن کو کامیاب قرار دیا تھا اور اس نے ہوش میں آنے پر صرف ایک ہی نام لیا تھا اور ایک ہی جملہ کئی بار دہرایا تھا۔ انکل نے میری جانب دیکھتے ہوئے پھیکی اور بے جان مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"اچھا انکل میں چلتا ہوں ذرا گھر کا اور آفس کا چکر لگالوں پھر دوبارہ آؤں گا لیکن اگر میری کوئی ضرورت ہو تو میرا نمبر سرمئی کے پاس ہے' آپ بلا تکلف مجھے کال کر دیجیے۔ میں ان شاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا' مجھے حشام کے حوالے سے کسی بھی کام کو کر کے خوشی ہوگی۔" جاوید نے کھڑے ہو کر انکل سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"جیتے رہو بیٹا! اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے' ذرا حشام کی جانب سے اطمینان ہو جائے تو پھر تم سے اطمینان سے بیٹھ کر بات ہوگی۔" انکل نے ایک ہاتھ جاوید سے ملایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔
جاوید کے جانے کے بعد صرف میں انکل اور آنٹی کے پاس رہ گئی آنٹی کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی وہ نہ جانے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالے کل شام سے بیٹھی تھیں۔ ساری رات اسی طرح بیٹھ کر اور دعائیں کرتے ہوئے گزار دی تھی اور انکل مرد ہونے کے باوجود بہت نڈھال دکھائی دے رہے تھے' کل رات جب میں انہیں چھوڑ کر گئی تھی تب مجھے انکل اتنے پریشان دکھائی نہیں دیے تھے' جتنے اس وقت دکھائی دے رہے تھے' پتا نہیں اس کی وجہ ساری رات کا رتجگا اور بے آرامی تھی یا کوئی اور وجہ تھی لیکن پھر وہی میری چھٹی حس مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اس کی وجہ بے آرامی نہیں کچھ اور ہے کیوں کہ جب میں آئی تھی تو انکل سے ڈاکٹر دھیمی آواز میں کوئی بات کر رہا تھا اور انکل متوحش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کو خاموشی سے سن رہے تھے اور اس کے بعد سے وہ مسلسل کسی گہری سوچ میں مبتلا تھے بہرحال جو بات بھی ہے وہ میں ابھی انکل سے معلوم کر ہی لوں گی' فی الحال تو انہیں کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔
"انکل آنٹی آپ دونوں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے' چلیں آئیں آپ دونوں پہلے کچھ کھالیں۔" میں نے باسکٹ اپنی جانب کھسکاتے ہوئے کہا۔
"رہنے دو بیٹا! کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔
پھر میں نے اپنے الفاظ میں دونوں کو بہت تسلیاں دیں اور تھوڑا تھوڑا کھلا دیا' چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے آنٹی سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے گھر جا کر آرام کر لیں۔ میں یہاں انکل کے پاس موجود ہوں لیکن انہوں نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا کہ جب تک وہ حشام سے خود بات نہیں کر لیتیں یہاں سے نہیں جائیں گی اور انکل کے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
تھوڑی دیر کے لیے ہم تینوں بالکل خاموش بیٹھے رہے پھر انکل نے جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر بولے۔
"سرمئی بیٹا! ذرا میری بات سنو؟" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے آنٹی سے قدرے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

”آنٹی میں ابھی آتی ہوں۔ اچھا آپ ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں اور آنکھیں بند کرلیں شاید تھوڑی سی نیند آجائے۔“ میں نے آنٹی سے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم جاؤ اور جا کر سن لو وہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ آنٹی نے نڈھال انداز میں اپنا سر نشست گاہ سے ٹکا لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ کوئی ورد کرنے لگیں۔

میں انکل کے قریب پہنچی تو وہ سر جھکائے سوچ میں گم تھے۔

”جی انکل! آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے۔“ میں نے قریب جا کر آہستہ سے کہا تو انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا‘ ان کی آنکھیں متورم اور سرخ ہو رہی تھیں‘ کہنے لگے۔

”سرمئی! تم نے فون پر مجھ سے کیا کہا تھا؟“

تب میں نے دھیرے دھیرے ساری بات انہیں بتادی۔ یہ بھی کہ اس وقت کی ویڈیو میرے پاس محفوظ ہے لیکن میں نے ابھی اسے دیکھا نہیں ہے۔“ انکل نے بنا ٹوکے میری ساری بات گہری توجہ اور سنجیدگی سے سنی اور بولے۔

”تمہارا شک بالکل صحیح ہے سرمئی بیٹا!“

”جی!“ میں نے چونک کر کہا۔ ”آپ کو صرف میری بات پر یقین ہے یا اس یقین کی کوئی اور وجہ بھی ہے۔“

”تمہارا شک اور تجزیہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن تمہاری بات کا فوری یقین کرنے کی وجہ اور بھی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”وہ کیا انکل؟“ میں نے تیزی سے سوال کیا۔

”یہاں اسپتال میں بھی ڈاکٹر ذیشان کو خریدنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”کیا مطلب......؟ کون ڈاکٹر ذیشان...... وہی جو تھوڑی دیر قبل آپ سے بات کر رہے تھے۔“

”ہاں وہی ڈاکٹر ذیشان اور انہوں نے ابھی مجھ سے یہ بات کہی ہے۔“

”کیا...... کیا بتایا انہوں نے...... کس نے... کس نے ان سے کیا کہا؟“ میں نے بے تابی سے کہا اور ایک نگاہ اس دکھیاری ماں پر ڈالی جو ابھی بھی اللہ کی بارگاہ میں اپنے بیٹے کی سلامتی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”ڈاکٹر ذیشان سے میری پرانی واقفیت ہے‘ انہوں نے ابھی مجھ سے کہا ہے کہ مجھے حشام کے سلسلے میں بہت محتاط رہنا ہوگا اس لیے کہ یہاں بھی اس کی جان کو خطرہ ہے۔ کل جس وقت حشام کو زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا اس کے تھوڑی دیر کے بعد ایک انجان شخص کا فون ان کے پاس آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ”حشام کو زندہ نہیں رہنا چاہیے‘ دوران آپریشن آپ اس کا کام تمام کرسکتے ہیں اور اس کام کے لیے آپ کو منہ مانگی رقم ادا کی جائے گی‘ بولیں آپ اس معمولی کام کے عوض کتنی رقم چاہتے ہیں؟“ ڈاکٹر ذیشان نے اس شخص کی بات کا جواب دیے بنا ہی فون بند کردیا لیکن فوراً ہی دوبارہ فون آیا اور اس شخص نے یہ دھمکی دی کہ وہ اس وقت اسپتال میں موجود ہے اور اگر ڈاکٹر ذیشان اس کام کو کرنے سے انکار کرے گا تو وہ یہ کام کسی دوسرے سے بھی کرواسکتا ہے‘ لیکن اس انکار کی انہیں بہت بھیانک سزا بھگتنا پڑے گی تب ڈاکٹر ذیشان نے جواب دیا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کا کام زندگی بچانا ہے‘ زندگی لینا نہیں اور یہ بھی سارا اختیار اللہ کے پاس ہے‘ وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔“

اس کے بعد ڈاکٹر ذیشان مسلسل حشام کی نگرانی کر رہے ہیں اور خود دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ آئی سی یو میں جن لوگوں کی ڈیوٹیاں ہیں انہیں ابھی تک حشام کے پاس سے لمحہ بھر کے لیے ہٹنے نہیں دیا گیا ہے تاکہ کوئی بھی شخص ان سے رابطہ نہ کرسکے‘ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں چاہوں تو اس معاملے میں پولیس کو انفارم کرسکتا ہوں تاکہ پوری طرح حشام کی حفاظت کی جاسکے ویسے بھی حشام کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کیا جائے‘ کیا پولیس کو انفارم کیا جائے۔“ انکل نے خاصی تشویشناک بات مجھے بتانے کے بعد کہا۔

”جو بات آپ نے بتائی ہے وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ یہاں اسپتال میں کتنے ہی ڈاکٹرز اور نرسیں ہیں اور ہر کوئی ڈاکٹر ذیشان جیسا نہیں ہوتا‘ کوئی بھی بک سکتا ہے‘ کچھ بھی ہوسکتا ہے اور رہی بات پولیس کی وہ تو سب سے زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔ اس لیے اس بات کو تو رہنے دیں‘ ہمارا ہی کوئی بندہ ایسا ہو جو دن رات حشام کے قریب رہ کر اس کی حفاظت کرے۔ آپ کی نگاہ میں ایسا کون ہے؟“ میں نے کہا تو انکل سوچ میں پڑ گئے پھر اچانک ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی اور انہوں نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر سوچ سوچ کر ملانے لگے۔

رابطہ ہونے پر انہوں نے کہا۔ ”کرنل مشتاق بات کر رہے ہیں؟“ پھر سوری رونگ نمبر کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کردی‘ اسی طرح تین چار رانگ نمبر ملانے کے بعد وہ صحیح نمبر ملانے میں کامیاب ہوگئے شاید ان کے ذہن میں کرنل مشتاق کا صحیح نمبر نہیں آ رہا تھا‘ بہرحال رابطہ ہونے پر انہوں نے کہا۔

”کرنل مشتاق آپ کیسے ہیں؟“ دوسری جانب سے چند لمحے خاموشی سے سننے کے بعد وہ بولے۔

”ہاں حشام میرا ہی بیٹا ہے‘ مجھے اس وقت آپ کی اشد ضرورت ہے‘ کیا آپ فوری طور پر میرے پاس اسپتال آسکتے ہیں۔ آپ آئیں تو بہت گمبھیر صورت حال ہے یہاں...... وہی آپ کو بتاؤں گا۔“ پھر شاید انہوں نے آنے کی ہامی بھر لی تھی‘ اس لیے انکل نے شکریہ کہہ کر فون بند کردیا۔

”انکل! کرنل مشتاق کون ہیں اور آپ ان سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کرنل مشتاق سابق فوجی ہیں‘ میں ان سے درخواست کروں گا کہ مجھے حشام کی حفاظت کے لیے کمانڈوز دستہ چاہیے۔“ انکل نے بتایا تو میں خوش ہوگئی۔

”یہ بالکل ٹھیک ہے انکل! حشام کی حالت ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے گھر پر یا کہیں اور رکھا جائے‘ اس لیے مجبوری ہے کہ اسپتال میں ہی حشام کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنا ہوگا۔“

میں منتظر رہی کہ انکل کچھ بولیں گے لیکن وہ گہری سوچ میں گم تھے۔ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ میں جانتی تھی کہ انکل کی سمجھ میں ساری بات آگئی ہے کہ حشام پر یہ حملہ کیوں ہوا اور شاید وہ یہ بات بھی جانتے ہوں کہ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔“

”انکل جب تک حشام بالکل ٹھیک ہو کر گھر نہیں آجاتا‘ ہمیں اس معاملے میں بالکل ہی خاموشی اختیار کرنی ہوگی۔“ میں نے کہا تو انکل خاموش ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد میں اور انکل آئی سی یو میں ڈاکٹر کی اجازت سے ایک ایک کر کے حشام کو دیکھ کر آئے‘ حشام کی آنکھیں بند تھیں۔ ناک میں نلکی لگی ہوئی تھی‘ نہ جانے کون کون سی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اسے اس حالت میں لیٹا دیکھ کر مجھے بہت زور کا چکر آگیا اور میرا سارا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔ ہر لمحے شوخی اور شرارت لیے مجھے چھیڑنے والا‘ بحث کے دوران میرے آگے جھٹ ہتھیار ڈالنے والا میرا ہر لمحے خیال رکھنے والا میرا حشام آج کس حالت میں

بستر پر پڑا ہے۔ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود میری آنکھوں سے سیل رواں جاری ہوگیا اور میرے دل کی ہر دھڑکن آتی جاتی ہر سانس اور جسم کا رواں رواں اپنے ربّ کے آگے فریاد کرنے لگا کہ وہ میرے حشام کو صحت اور سلامتی عطا کردے۔

میں بس چند منٹ وہاں کھڑی رہی پھر وہاں ڈیوٹی پر موجود اسٹاف نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا تو میں باہر نکل آئی۔ انکل دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے ڈھیروں حزن وملال ان کے چہرے پر تھا۔

باہر آتے ہی جیسے ہی انکل نے میری جانب دیکھا میں بھاگ کر ان کے نزدیک آ گئی اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور انکل بنا ایک لفظ کہے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

آنٹی بھی ضد کر رہی تھیں کہ انہیں حشام کو ایک نظر دیکھنا ہے لیکن انکل نے منع کر دیا کہ ابھی اس کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ تم اسے دیکھ سکو اس کے جسم پر مشینیں لگی ہوئی ہیں تم سے وہ منظر برداشت نہیں ہوگا لیکن وہ بہت ضد کرنے لگیں تب انکل اپنے ساتھ انہیں لے گئے اور پھر ایک منٹ بعد ہی ایک نرس کے سہارے انہیں باہر لے آئے وہ حشام کو دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی تھیں۔

میں نے اور انکل نے آنٹی کو سنبھالا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے ان کا چیک اپ کروایا ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا اور کہا کہ انہیں گھر لے جائیں ورنہ انہیں بھی اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑ جائے گا۔

ڈاکٹر کی فوری طور پر ٹریٹمنٹ سے آنٹی کو ہوش تو آ گیا تھا لیکن ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ تب میں نے انکل سے کہا۔

”انکل اگر آپ اجازت دیں تو میں آنٹی کو گھر لے جاتی ہوں وہاں امی اور اماں ہیں دونوں آنٹی کا خیال رکھیں گی۔ آپ کے گھر میں کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔“

”بیٹا! جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔ میں تو یہیں اسپتال میں موجود ہوں میں نے کرنل مشتاق کو یہیں اسپتال میں ملنے کے لیے بلایا ہے کیوں کہ میں حشام کو اسپتال میں تنہا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“ انکل نے گہرے اداس اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے انکل میں آنٹی کو گھر چھوڑ کر آتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن تم جاؤ گی کیسے تمہارا پاؤں؟“

”میں ڈرائیو کرلوں گی انکل ڈونٹ وری! مجھے اب کسی بھی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا۔“ میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تمہارے لیے بھی میں کرنل مشتاق سے بات کروں گا کہ کوئی ایسا بندہ دو جو باہر آتے اور جاتے ہر لمحے تمہارے ساتھ رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ نہ کرے اب حشام کے بعد تم ان لوگوں کا ٹارگٹ ہو۔“ فکرمندی سے کہا۔

”میری آپ فکر نہ کریں انکل میں تو......“

”کیا میں تو...... ہیں کیا میں تو...... یہ تم بچے اپنے آپ کو ماں باپ سے زیادہ بہادر سمجھتے ہو حشام سے بھی میں نے کتنا کہا تھا کہ اپنا بہت خیال رکھے لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی اور ہنس کر ہر بار میری بات ٹال دی۔ آج دیکھ لو اس کا خمیازہ ہم سب بھگت رہے ہیں۔“ انکل نے غصے سے تیز آواز میں کہا پھر رندھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”بیٹا! اس دنیا میں ہمارے زندہ رہنے کے لیے تم لوگ ہی تو ہو۔“

”آئی ایم سوری انکل! آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔“ میں نے شرمندگی سے نگاہیں جھکا کر کہا۔

”بیٹا! ہم بہت کمزور ہیں اب ہمارے بوڑھے جسموں میں کسی آزمائش سے گزرنے کی طاقت نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا اور ایک دم لڑکھڑا گئے میں نے انہیں سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا تو وہ رو پڑے۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور کہا۔

”انکل! حشام کو ابھی ہوش آ جائے گا۔“

میں آنٹی کو لے کر گھر آ گئی وہ ساری دوائیں میں نے امی کے حوالے کیں اور آنٹی کا بہت خیال رکھنے کی ہدایت کے بعد میں دوبارہ اسپتال آ گئی۔

یہاں آئی تو انکل کے پاس ایک بہت ڈیسنٹ پرسنالٹی کے حامل شخص کو بیٹھے ہوئے پایا پچاس پچپن کے قریب ان کی عمر ہوگی سر کے سارے بال سفید تھے لیکن جسم بالکل فٹ اور چاق وچوبند دکھائی دے رہا تھا۔

میری نگاہ ان پر پڑی تو میں دور ہی کھڑی ہوگئی اور میں سمجھ گئی کہ یہی کرنل مشتاق ہیں قریب اس لیے نہیں گئی کہ شاید میری موجودگی وہ پسند نہ کریں اور کھل کر بات نہ کریں لیکن باتیں کرتے کرتے انکل کی نگاہ میرے اوپر پڑی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

میں گئی اور میں نے جاتے ہی کرنل مشتاق کو سلام کیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔

”وعلیکم السلام ع! جیتی رہو۔“

انکل نے شاید ان سے پہلے ہی میرا تعارف کروا دیا تھا اس لیے ان کا تعارف مجھ سے کروایا اور کہا۔

”میں نے کرنل کو ساری سچویشن بتا دی ہے اور تمہارے لیے بھی ایک بندے کا بندوبست کر دیا ہے اگر تم یہاں بیٹھنا چاہتی ہو تو ذرا دیر کو بیٹھو ہم ڈاکٹر ذیشان

سے ایک مختصر سی میٹنگ کر کے ابھی آتے ہیں۔"
"جی انکل! میں بیٹھی ہوں آپ جائیں۔" میں نے کہا اور وہاں رکھے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئی اور حشام کی سلامتی کے لیے "یا سلام" کا ورد کرنے لگی۔
پندرہ بیس منٹ کے بعد انکل اور کرنل مشتاق واپس آ گئے۔ کرنل مشتاق نے انکل سے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔
بعد میں انکل نے مجھے تفصیل بتائی کہ ڈاکٹر ذیشان کے تعاون سے کمانڈوز کی ڈیوٹیاں ڈاکٹر اور وارڈ بوائے کی حیثیت سے کہاں کہاں لگیں گی۔ ایک کمانڈو گارڈ کی حیثیت سے ہر وقت حشام کے ساتھ ہوگا' اس کے علاوہ انکل نے یہ بھی بتایا کہ میرے ساتھ بھی چوبیس گھنٹے ایک کمانڈو رہے گا۔ وہ ہی میرے ڈرائیور کی حیثیت سے میری کار ڈرائیو کرے گا اور رات کو بھی میرے گھر پر ہی ٹھہرے گا۔
"تمہارے گھر ٹھہرنے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا کیوں کہ تمہارا اوپر والا پورشن تو خالی ہی پڑا ہے' رات کو وہ وہیں قیام کرے گا۔" انکل نے کہا۔
"جیسی آپ کی خوشی انکل! میں امی کو یہ بات سمجھا کر بتا دوں گی۔" میں نے کہا۔
"بیٹا ذرا حشام کی جانب سے بے فکری ہو جائے تو میں ساری بات تم سے تفصیل سے کروں گا کہ میں یہ سب کیوں اور کس لیے کر رہا ہوں۔" انکل نے کہا۔
"میں جانتی ہوں انکل!"
"تم کچھ نہیں جانتیں بیٹا!" انکل نے میری بات سن کر تیزی سے کہا۔ "بس اتنا جان لو کہ ہم سب بہت بڑے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"
"جی......؟" میں نے شدید حیرت سے کہا۔
"جی بیٹا!"
"اچھا انکل! یہ بتائیں کہ کرنل مشتاق کی کیا اپنی ایجنسی ہے۔" میں نے پوچھا۔
"ہاں......" انکل نے کہا پھر وہ مجھے کرنل مشتاق کے بارے میں بتانے لگے۔
"کرنل مشتاق اور میرے والد آپس میں بہت اچھے دوست تھے' میرے والد بھی صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے اور کرنل مشتاق کے والد نیوی آفیسر تھے' دونوں میں بے حد دوستی تھی' ہمارے گھروں میں بھی آنا جانا تھا' اسی حوالے سے ہماری دوستی بھی ہوگئی۔ ہم نے اسکول اور کالج تک تعلیم ساتھ ہی حاصل کی۔ ایک مزے کی بات تمہیں بتاؤں کہ ہمیں ایک ہی لڑکی سے محبت ہوگئی ہم انٹر میں تھے' وہ ہمارے ہی کالج میں پڑھتی تھی' لیکن وہ مجھے چھوڑ کر مشتاق کی جانب مائل ہوگئی۔
بعد میں جب ہم نے ایک دوسرے کو اپنے حال دل سنائے تو ہماری محبت کا مرکز وہی لڑکی نکلی اور تمہیں پتا ہے مشتاق نے کیا کیا......؟" انکل نے بہت محبت اور عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔
"نہیں تو...... آپ بتائیں؟" میں نے پوری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔
"مشتاق نے اسی دن اس لڑکی کو چھوڑ دیا اور اسے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ مزید آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ آج سے میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔" اس نے یہ سب اس لیے کیا کہ میں بھی اس میں دلچسپی لے رہا تھا اور وہ مشتاق میں پھر ہم دونوں ہی نے اسے اپنی زندگی سے نکال دیا اور ایک دوسرے کے ساتھ وعدہ کیا کہ جیسے ہی کوئی لڑکی پسند آئے گی اسے فوراً ایک دوسرے سے ملوائیں گے اس لیے جب میں نے تمہاری آنٹی کو دیکھا اور پسند کیا تو فوراً ہی مشتاق سے ملوا دیا۔
پھر مشتاق نے اپنے والد کی خواہش پر پاکستان

آرمی جوائن کر لی اور میں صحافت کے پیشے میں آ گیا۔ میرے والد کا نام آج بھی صحافت کی دنیا میں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے' وہ نہایت بے باک سچے اور نڈر صحافی تھے اور یہی اوصاف اپنانے کی تعلیم انہوں نے مجھے بھی دی تھی۔ آج وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں اللہ انہیں غریق رحمت کرے لیکن ان کے بتائے ہوئے اصول آج بھی میرے ساتھ ہیں اور میں نے یہی تعلیم اپنے بیٹے کو بھی دی تھی کہ بیٹا حق اور سچ کا ساتھ ہمیشہ دینا اور یاد رکھنا حق اور سچ کبھی بکتا نہیں۔"
مشتاق آرمی میں کمانڈو تھا پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اپنی ایک ایجنسی کھول لی' سیکورٹی گارڈز اور بہترین کمانڈوز اس کے پاس تربیت حاصل کرتے ہیں۔
ہماری آج بھی دوستی ویسی ہی قائم ہے لیکن ملاقات اب کم کم ہوتی ہے' سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہیں۔
حشام کی سیکیورٹی کا خیال آیا تو میرے ذہن میں فوراً کرنل مشتاق کا نام آ گیا۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی بتایا ہے کہ تم میری بیٹی ہو اور بہو بننے والی ہو۔ اس لیے اسے تمہاری سیکیورٹی کا بھی خیال رکھنا ہے۔
آج شام تک وہ سارے بندے آ جائیں گے جو اپنے اپنے کاموں میں بہت ماہر ہیں' تا کہ پھر میں بھی ذرا دیر کے لیے آرام کر سکوں۔" انکل نے ساری تفصیلات مجھے بتائیں پھر میں نے کہا۔
"انکل! آپ کی شوگر بھی بہت ہائی ہو رہی ہوگی۔"
"ہونے دو بیٹا! اب کیا کریں؟" انکل نے بے پروا لہجے میں کہا۔
"آپ نے کوئی دوا بھی نہیں لی ہے' آپ کو ہماری ضرورت ہے تو کیا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنے ہم آپ کے لیے ضروری ہیں اتنے ہی آپ لوگ بھی ہمارے لیے ضروری ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ کون سی دوائیں لیتے ہیں میں ابھی یہیں میڈیکل اسٹور سے لے آتی ہوں۔" میں نے محبت سے انکل کے ہاتھوں کو تھام کر کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور دواؤں کے نام بتا دیئے۔
میں اسٹور سے دوائیں لے آئی اور انکل کو اپنے ہاتھوں سے دوا کھلائی' آج میں اپنے آفس بھی نہیں گئی تھی اور نا ہی چھٹی کرنے کا کوئی فون کیا تھا' اس لیے سوچا کہ فون کر کے رمضانی صاحب کو بتا دیتی ہوں' اس لیے میں نے رمضانی صاحب کا نمبر ملایا اور کہا۔
"سر! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ایک دو روز کے لیے چل پھر نہیں سکتی' اس لیے چھٹی مانگ رہی ہوں۔"
"اسپتال میں تو تم بڑی ایکٹیو تھیں' ہم سے یہ کہہ کر گئی تھیں کہ تکلیف بہت ہے گھر جا رہی ہوں' پھر یہاں چینل میں جاوید کے ساتھ کیا کرنے آئی تھیں؟" رمضانی صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں سناٹے میں آ گئی پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔
"سر! میں گھر ہی جا رہی تھی کہ جاوید کو کوئی کام یاد آ گیا اور اس نے کہا کہ ایک منٹ کا کام ہے میں وہ کر لوں پھر تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گا۔ اس میں ایسی کیا بات ہوگئی۔" میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت بھی گھر پر نہیں اسپتال میں ہو' خیر تمہاری مرضی کر لو چھٹی جتنے دن چاہے۔" اتنا کہہ کر رمضانی صاحب نے فون پٹخ دیا۔
میں نے ابھی فون بیگ میں رکھا ہی تھا کہ وہ پھر بجنے لگا میں نے فون نکالا اور نمبر دیکھا تو وہ جاوید کا

تھا۔ میں نے جھٹ ریسیو کا بٹن پش کیا اور یقیناً جاوید کے پاس کوئی اہم نیوز ہوگی۔

''ہاں جاوید بولو۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''حشام کیسا ہے؟ اسے ہوش آیا یا نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ویسا ہی ہے' اسے ابھی ہوش نہیں آیا۔ ہاں بولو کوئی خاص بات؟'' میں اس کے منہ سے کوئی اہم خبر سننا چاہ رہی تھی۔

''خاص بات یہ ہے کہ رات کو میری غیر موجودگی میں میری الماری کھولی گئی اور اس میں سے کیمرے میں موجود ویڈیو کیسٹ نکال لی گئی ہے لیکن جب ان لوگوں نے وہ کیسٹ دیکھی ہوگی تو انہیں پتا چلا ہوگا کہ یہ تو ان کی مطلوبہ کیسٹ نہیں ہے تو انہوں نے میرے سارے کیبن کی اچھی طرح سے تلاشی لے ڈالی ہے' یہاں یہ بات بھی سب کے علم میں ہے کہ میں اور تم رات یہاں آئے تھے۔ اب وہ کیسٹ تمہارے پاس ہے اور تمہیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔'' جاوید نے اتنی بات کر کے فون بند کر دیا۔

پھر میں نے ساری بات انکل کو بتائی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تم وہ کیسٹ کرنل مشتاق کے حوالے کردو۔

''کیوں انکل؟'' میں نے کہا۔

''اس سارے معاملے کو میں اس کے ہینڈ اوور کر رہا ہوں۔ وہی اس معاملے کا کھوج لگائے گا۔'' انکل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

انکل مجھے کچھ نہیں بتا رہے تھے کہ معاملہ کیا ہے' میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان سے تفصیل سے پوچھوں کہ انکل اور حشام ایسے کون سے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ کس کے خلاف رپورٹ بنا رہے تھے' ایسا کون شخص ہے کہ جس کے خلاف انکل کے پاس پکے پکے ثبوت ہیں اور وہ حشام کی جان کے در پے ہو گیا لیکن انکل کی گمبھیر سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے میرے اندر قطعی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں ان سے مزید کرید کرید کر پوچھوں کیوں کہ انہوں نے کہا تھا کہ حشام کی جانب سے بے فکر ہونے کے بعد وہ مجھے سب کچھ خود بتائیں گے۔

میں سارا دن انکل کے ساتھ رہی' ہم بار بار حشام کو جا کر دیکھتے ڈاکٹر سے اس کے بارے میں معلوم کرتے۔ ڈاکٹر نے یہی کہا کہ آپ لوگ دعا کریں کہ یہ جلد ہی ہوش میں جائے' ان کو ہوش آ جائیں گا تو ہی اطمینان ہو سکتا ہے ورنہ یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ کومے میں نہ چلے جائیں۔

شام کو کرنل مشتاق کے ہمراہ ان کی خاص ٹیم آ گئی اور انہوں نے اپنی اپنی ڈیوٹیز سنبھال لیں۔ میرے ساتھ انکل مشتاق نے دو افراد کی ڈیوٹی لگائی' ایک گارڈ کی حیثیت سے گھر کے گیٹ کے اندر موجود تھا' دوسرا میرے ساتھ ڈرائیور کی حیثیت سے رہے گا۔

انکل کو مجھے وہ ویڈیو کیسٹ دینی تھی اس لیے انکل میرے ساتھ ان دونوں گارڈز کے ہمراہ میرے گھر آنے کے لیے میری کار میں بیٹھ گئے اور طلال انکل کو بھی انہوں نے زبردستی آرام کرنے کے لیے گھر بھیج دیا۔

گھر آ کر میں نے انکل کو بھی اندر بلا لیا اور وہ کیسٹ ان کے حوالے کر دی۔ انکل فوراً ہی اپنی گاڑی میں جو ان کا ڈرائیور تھا پیچھے پیچھے لا رہا تھا اس میں بیٹھ کر واپس چلے گئے جب کہ ان دونوں نے فوراً ہی اپنی ڈیوٹیز سنبھال لیں۔ ڈرائیور کی حیثیت سے میرے ساتھ رہنے والے لڑکے کا نام آصف تھا جب کہ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے لڑکے کا نام عثمان تھا۔ دونوں لمبے چوڑے ڈیل ڈول کے ہینڈسم بندے تھے۔

امی اور اماں حسب عادت پریشان ہو رہی تھیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے' میں نے انہیں سمجھایا کہ جو ہو رہا ہے اچھا ہی ہو رہا ہے۔ فی الحال میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لوں۔

میں بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی' لیکن آنٹی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھی انہیں بہت تسلی دی تو وہ میری جانب عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگیں تو میں نے پوچھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟''

''مجھے تم دونوں نے کتنا اکیلا کر دیا ہے۔'' انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''کن دونوں نے......؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''طلال نے اور تم نے۔'' انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آنٹی پلیز......'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''آپ کس قسم کی باتیں سوچ رہی ہیں' اللہ نہ کرے کہ آپ کبھی تنہا ہوں۔ میں حشام اور انکل سب ہی آپ ہی کے تو ہیں۔'' میں نے محبت سے ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

''جب ہی تو تم لوگ مجھ سے ہر بات چھپا رہے ہو' کچھ بھی نہیں بتا رہے۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے وہاں اسپتال میں بھی حشام کی حفاظت اور نگرانی کے لیے طلال نے کرنل مشتاق کو فون کیا اور بندے بلوا لیے' ادھر تمہارے گھر پر بھی حفاظت کے لیے گارڈز تعینات کر دیئے ہیں۔ آخر ان سب کی وجہ کیا ہے؟ کیا تمہاری اور حشام کی جانوں کو کسی سے خطرہ ہے' کیا یہ حملہ میرے حشام پر کسی نے جان بوجھ کر کیا ہے' مجھے کچھ تو بتاؤ۔ میرا دل بہت زیادہ گھبرا رہا ہے۔ بیٹا میری زندگی کا محور تو صرف تم تینوں کی ذات ہے میں کسی ایک کا نقصان بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اللہ کرے تم تینوں کو میری باقی ماندہ عمر بھی لگ جائے۔'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے اور ہمارے ساتھ رکھے۔ دیکھیے گا ان شاء اللہ ہم سب ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور خوش رہیں گے۔ آپ کچھ مت سوچیں اور صرف دعا کریں۔ دیکھیے گا ان شاء اللہ ہمیں جلد ہی حشام کی جانب سے خوش خبری ملے گی۔ رہی بات گارڈز کی تو آنٹی ہماری لائف میں ایسا تو ہوتا ہی ہے اور یہ کوئی حشام پہلا فرد نہیں ہے جس کے ساتھ ایسا ہوا ہے اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کے ساتھ مسائل پیش آئے ہیں۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ حشام پر یہ حملہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے' بس یہی بات سوچ کر کہ حشام کو اسپتال میں کوئی نقصان نہ ہو' گارڈز تعینات کیے گئے ہیں۔'' میں نے آنٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ ایک بار پھر دعاؤں میں مصروف ہو گئیں۔

میں نے نماز عشاء ادا کی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی جھٹ نیند میری آنکھوں میں اتر آئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ اچانک موبائل کی تیز بیل سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا طلال انکل کا فون تھا' میں نے جلدی سے فون ریسیو کیا۔

''سرمئی بیٹا! حشام......'' انکل نے صرف اتنا کہا اور رو پڑے اور فون میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

❁

پچھتاوا

جناب ایڈیٹر نئے افق'
السّلام علیکم!
کچھ لوگ نکاح جیسی سنّت کو اپنے پیسے اپنی خوب صورتی امارت اور بد خصلت کے باعث مذاق بنا لیتے ہیں اور پھر ہزاروں دکھ اور زندگی بھر کی محرومیاں کسی کے مقدر میں ڈال کر دنیا کی رنگینیوں میں گم ہوجاتے ہیں مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قدرت کے اپنے قوانین ہوتے ہیں جب وہ فیصلہ سناتی ہے تو انسان خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے شخص کی ہے جو ایک عورت کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر بھول گیا تھا۔
مجھے یقین ہے یہ کہانی آپ کے معیار پر ضرور پوری اترے گی۔

طاہرہ جبیں تارا
لاہور

"تم یہاں سے جارہی ہو۔ سب کچھ بیچ کر تمہیں تو اپنے گھر سے گاؤں سے بے حد محبت تھی پھر تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ ان گلیوں ان کوچوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو گی جہاں تمہارا بچپن بیتا تم نے زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھے۔"

"ہاں صبا اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ میں شہر جا کر عزیز کے ابو کو تلاش کروں گی۔ اب عزیز بڑا ہورہا ہے۔ اس کو والد کی ضرورت ہے جس طرح ماں کی محبت اولاد کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح باپ کی شفقت اولاد کو تپتی دھوپ سے بچاتی ہے۔ مرے ہوؤں پر صبر آجاتا ہے صبو مگر عزیز کے ابو تو شہر جا کر کھو گئے ہیں۔ میں عزیز کے سامنے سرخرو تو ہوسکوں گی کہ میں نے اس کی خاطر اپنا گاؤں چھوڑا تاکہ شہر جا کر ساجد کو تلاش کرسکوں اور پھر اب میرا گاؤں میں رہا بھی کون ہے؟"

"شبو یہ تو نہ کہو۔ ہم سب تمہارے ہیں۔ ہمارے تمہارے دکھ اور خوشیاں سانجھی ہیں اور پھر لاہور شہر جا کر تم کس کس سے ڈاکٹر صاحب کا پتا پوچھو گی۔ اتنا بڑا شہر وہاں آدمی ایک بار کھو جائے تو پھر نہیں ملتا اور پھر شہر کے بے مروت اور بے وفا لوگ ڈاکٹر بھی تو لاہور سے ہی آیا تھا نا تیری جھولی میں محبت کے چند سکے ڈال کر ایسا غائب ہوا کہ کوئی اتا پتا ہی نہ دیا۔ اسے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو اس کے بیٹے کی ماں بن گئی۔"

"تو ساجد کو برا نہ کہہ۔ نہ جانے شہر جا کر اس پر کیا بیتی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ ہی نہ سکا کہ وہ کس کو پیار کی زنجیر پہنا کر آیا ہے تو فکر نہ کر لگن سچی ہونی چاہیے۔ تلاش کرنے سے تو ربّ بھی مل جاتا ہے وہ تو پھر انسان ہے۔

وہاں میرے رشتے کے چچا بھی تو ہیں وہ بھی میری مدد کریں گے۔ بس تم دعا کرنا کہ میری ہتھیلیاں جو حنا کی خوشبو اور رنگ سے خالی ہیں حنا کے رنگ سے رنگ جائیں میرے بازو جو چوڑیوں کی گنگناتی آوازوں سے محروم ہیں ایک دفعہ پھر اس کی مدھر تانوں سے بج جائیں تو جانتی ہے نا میں نے عہد کیا تھا کہ جب ساجد واپس آئے گا تو پھر ہی میں اپنے ہاتھوں میں مہندی رچاؤں گی اور اپنے بازوؤں کو نیلی پیلی چوڑیوں سے آراستہ کروں گی کہ

ساجد کو مہندی کا رنگ اور خوشبو اور بجتی چوڑیوں کی آواز بہت پسند تھی۔"

"شبو ہماری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی پر دیکھ شبو تو بھی ساجد کی طرح کہیں کھو نہ جانا اپنی خیر خبر دیتی رہنا۔"

"تو فکر نہ کر میں جاتے ہی تجھے فون کروں گی تُو تو میری بچپن کی سہیلی ہے تجھ سے کیسے ناتا توڑ سکتی ہوں۔"

شبو نے نم آنکھوں سے اس گھر اس گاؤں کو الوداع کہہ دیا۔ جہاں اس کا بچپن بیتا جہاں اس کی سکھیاں رہتی تھیں جہاں اس کے ماں باپ کی محبتوں اور چاہتوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

ٹرین میں بیٹھتے ہی اسے بیتے دن یاد آنے لگے۔

●......●......●

وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے بابا اور امی اسے بے حد چاہتے تھے جب اس نے اسکول جانا شروع کیا تو اس کے بابا نے سارے گاؤں میں لڈو بانٹے۔ گاؤں میں مڈل اسکول تھا وہ صبو کے ساتھ اسکول جاتی اور واپسی پر لہلہاتے کھیتوں میں بابا کے پاس چلی جاتی اور دونوں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر اسکول کا کام کرلیتیں۔ بابا اسے کہتے "جا تو گھر چلی جا اور پنکھے کی ہوا میں بیٹھ کر کام کرنا۔" مگر وہ دونوں کہتیں "بابا یہ قدرتی ہوا اس بجلی سے چلنے والے پنکھے کی ہوا سے ٹھنڈی اور خوش بودار ہے۔"

بچپن بیتا شباب میں قدم رکھا۔ اس نے آٹھویں پاس کرکے تعلیم چھوڑ دی۔ نارووال سے آگے ان کا گاؤں تھا اور نارووال میں میٹرک اور سیکنڈری اسکول کالج تھے۔ بابا نے اسے کہا کہ وہ اسے نارووال کے کالج میں داخلہ دلا دیتے ہیں وہ ہوسٹل میں رہ کر کم از کم ایف اے تو کرلے۔ مگر اس نے کہا۔ "نہیں بابا میں نارووال نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ میں آپ لوگوں سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتی۔ یہ لہلہاتے کھیت' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں' صاف و شفاف چشمے اور کنوئیں کا پانی کھلے اور وسیع مکانات یہ سب مجھے دل و جان سے عزیز ہیں۔ انہیں چھوڑ کر شہر کی گرد آلود فضا اور تنگ حبس زدہ مکانوں میں کیسے رہ پاؤں گی۔ بس مجھے اور تعلیم حاصل نہیں کرنی اس نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کردی۔

اس کے بابا کھیتوں میں گئے ہوئے تھے وہ گھر کا کام کررہی تھی کہ اچانک اس کی امی چھت سے گر گئیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ وہ صبو کو امی کے پاس چھوڑ کر گاؤں کی واحد ڈسپنسری کی طرف بھاگی کیونکہ ڈاکٹر اجمل اکثر اس کے بابا کے پاس آتا رہتا تھا۔ وہ اسے چچا کہتی تھی۔ وہاں چچا اجمل کے بجائے کسی اجنبی نوجوان کو دیکھا تو گھبرا گئی۔

"بی بی کیا بات ہے؟"

"مجھے ڈاکٹر اجمل سے ملنا ہے وہ کہاں ہیں۔ میری امی چھت سے گر کر بے ہوش ہوگئی ہیں۔"

"میں بھی ڈاکٹر ہوں ڈاکٹر اجمل کی ٹرانسفر ہوگئی ہے وہ لوگوں سے ملنے گئے ہیں میں ان کی جگہ آیا ہوں۔ آپ چلیں میرے ساتھ میں آپ کی امی کو دیکھتا ہوں۔"

"بازو فریکچر ہوگیا ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر روز پٹی کرنی پڑے گی۔ ایک مہینے کے بعد ٹھیک ہوجائیں گی۔"

وہ ہر روز امی کو دیکھنے آتا رہا۔ وہ امی کی پٹی کرتا تو وہ اسے دیکھتی رہتی پتا نہیں کیسی کشش تھی اس میں۔

"صوبیہ جو نیا ڈاکٹر آیا ہے مجھے بڑا اچھا لگتا ہے

اور پتا ہے وہ مجھے کہہ رہا تھا کہ میں گاؤں کی تو لگتی ہی نہیں شہری لڑکی لگتی ہوں۔ بہت طریقے سلیقے سے کھانا بنا کر اسے دیتی ہوں۔ پتا ہے بابا کے ساتھ اس نے کئی دفعہ ہمارے گھر کھانا کھایا ہے اور بابا کو کہہ رہا تھا کہ شبو کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔ بابا نے اسے کہا ہے کہ ہم کھانا ڈسپنسری بھیج دیا کریں گے۔"

"ارے چھوڑ شبو یہ شہری لوگ بڑے مطلب پرست اور خود غرض ہوتے ہیں اسے گھر کا کھانا چاہیے تو بس اس نے تعریف کردی اور بابا نے بھی فضول میں کھانا دینے کی ہامی بھرلی۔"

"بس تو افسانے اور کہانیاں پڑھ پڑھ کر ایسی باتیں کرنے لگی ہے۔ مت پڑھا کر جھوٹی کہانیاں۔"

"یہ کہانیاں جھوٹی نہیں ہوتیں شبو۔ ہمارے ارد گرد کی سچائیاں ہوتی ہیں جنہیں لکھنے والے ایسے انداز میں لکھتے ہیں کہ ہم ان سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کی راہ متعین کریں۔"

"بس، بس تیری باتیں میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔ تو بھی کہانیوں کی زبان ہی بولنے لگی ہے۔ سن کل جب میں خود ہی ڈسپنسری کھانا دینے گئی تو ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ شبو تیرے مہندی سے سجے ہاتھ اور چوڑیوں کی مدھر تان مجھے سونے نہیں دیتی۔ بس اب میں تیرے بابا سے بات کرتا ہوں۔"

"اللہ کرے کہ تیری آنکھوں کی چمک اور تیرے لبوں کی ہنسی ہمیشہ قائم رہے۔ ڈاکٹر مجھے دھوکا نہ دینا۔"

اور ڈاکٹر ساجد نے بابا سے کہا۔

"بابا میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ میرے والدین کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں اب آپ ہی میرے سب کچھ ہیں۔"

بابا نے کہا۔ "ڈاکٹر تم شہری لوگ ہو اور ہم دیہاتی۔ میری بیٹی صرف مڈل پاس ہے کیا تم اس کے ساتھ گزارا کر لو گے۔"

"بابا مجھے گاؤں کی سادگی اور خلوص نے بہت متاثر کیا ہے اور پھر آپ کے حسن سلوک نے تو مجھے خرید ہی لیا ہے۔ آپ کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس آپ ہاں کردیں۔"

اور پھر اس کی شادی ساجد سے ہوگئی۔ وہ بے حد خوش تھی اور اس کی سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں کہ اتنا ہینڈسم شخص اس کا شریک سفر تھا۔ ساجد بھی اسے پا کر بہت خوش تھا۔ چھ ماہ پلک جھپکتے گزر گئے پھر ساجد کی لاہور ٹرانسفر ہوگئی۔

وہ بہت روئی بابا بھی پریشان تھے۔

"بابا آپ فکر نہ کریں شبو آپ کے پاس میری امانت ہے۔ ابھی میں جا رہا ہوں لیکن میں جاتے ہی مکان کا بندوبست کر کے اس کو لے جاؤں گا۔ پلیز شبو بابا امی مجھ پر یقین رکھیں میں جلد ہی اپنی شبو کو لے جاؤں گا۔" وہ اسے وعدے کی سنہری زنجیر میں قید کر کے چلا گیا۔

ایک مہینہ تو کیا کئی مہینے گزر گئے۔ جب مہینے سال میں بدلے تو مایوسی نے بسیرا کر لیا کیونکہ ساجد نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ گزرے وقت نے ثابت کردیا کہ شہر کے لوگ بے وفا اور مطلب پرست ہوتے ہیں وہ اس کے بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کی سہیلیاں جو کبھی اس پر رشک کرتی تھیں اب اس پر ترس کھاتیں۔ اس کی ماں اس کی اجڑی مانگ نہ دیکھ سکی اور شہر خموشاں میں جاسوئی۔

اور چند برسوں کے بعد اس کے بابا نے بھی اسے بے آسرا چھوڑ دیا اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ تنہا رہ گئی اور وہ کبھی شہر جانے کے تصور سے ہی نالاں تھی اپنا سب کچھ بیچ کر شہر جانے پر راضی ہوگئی اسے ساجد کو ڈھونڈنا تھا اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنانا تھا۔ جو اب آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یوں وہ محبتوں، خلوص اور چاہتوں کو چھوڑ کر لاہور کی گرد آلود فضا کی رہائشی بننے پر راضی ہوگئی۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ ٹرین ایک جھٹکے سے رکی اور وہ ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل آئی۔

ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اس نے اسٹیشن پر قدم رکھا۔ اس کا چچا اسے لینے آیا ہوا تھا۔ دوسرے دن اس نے ساجد کی تلاش شروع کردی۔ مگر اتنے بڑے شہر میں محض نام اور ایک پرانی تصویر کے بل بوتے پر کسی شخص کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا اور پھر وہ ہار گئی۔ ہر روز اسپتالوں اور پرائیویٹ کلینک کے چکر لگاتے لگاتے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ساجد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"بیٹے میری خواہش ہے میں تمہیں ڈاکٹر بناؤں اور ایک بہت اچھا انسان بھی۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک اچھا ڈاکٹر تو تھا مگر اچھا انسان ثابت نہ ہوسکا۔"

"امی مجھے آپ کی خواہشوں کو پورا کرنا ہے کیونکہ اپنی خواہشوں سے بڑھ کر مجھے آپ کی خواہش عزیز ہے۔"

اور پھر اس نے دن رات محنت شروع کردی۔ سلائی کڑھائی کا کام وہ جانتی تھی کچھ پیسے اس نے بینک میں جمع کرائے اور باقی پیسوں سے اس نے ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ یوں زندگی کا سلسلہ چل نکلا۔ عزیز نے بھی اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کردیے آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا دونوں ماں بیٹے کو انتظار تھا۔ عزیز ایک کامیاب ڈاکٹر بن گیا۔

●......●......●

"مومل اب میں نے اپنی ماں کے خوابوں کو تعبیر دے دی ہے۔"

"مگر میرے خوابوں کی تعبیر تو تم ہو بتاؤ میری تعبیر کب ملے گی۔"

"تم امی کو ہمارے گھر بھیجو۔ میں نے تمہارے بارے میں امی کو بتا رکھا ہے۔"

"امی میں نے مومل کے بارے میں آپ کو بتایا تھا کہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے آپ اس کے گھر جائیں گی وہ ڈاکٹر بن گئی ہے۔"

"ہاں بیٹا میں جانتی ہوں وہ ڈاکٹر بن گئی ہے۔ میرے بیٹے کی پسند ہے تو بہت پیاری ہوگی۔"

"پتا نہیں وہ خوب صورت ہے یا نہیں پر امی اسے دیکھ کر ایک تقدس اور پاکیزگی کا خیال آتا ہے حوروں کا سا تقدس ہے اس کے چہرے پر ابھی اس کی ہاؤس جاب اسٹارٹ ہوئی ہے۔"

"بس آج شام تم مجھے ان کے گھر چھوڑ دینا۔"

●......●......●

"آیئے آنٹی آپ عزیز کی امی ہیں نا آپ بیٹھیں میں امی کو بھیجتی ہوں۔"

"تم مومل ہو نا میرے بیٹے کی پسند واقعی حوروں جیسی ہے۔" مومل کے لبوں پر حیا آلود مسکان سج گئی۔

"پلیز آپ بیٹھیں میں امی کو بلاتی ہوں۔"

"پہلے میں اپنی بیٹی کو تو جی بھر کر دیکھ لوں۔"

اور پھر اچانک ان کی نگاہ سامنے پڑی اور اس تصویر کو دیکھ کر وہ پتھر کی عورت بن گئیں۔

"کیا بات ہے آنٹی؟ آنٹی کیا ہوا؟ آپ......"

آپ......؟"

"یہ تصویر کس کی ہے؟" بہ مشکل ان کے لبوں سے نکلا۔

"آنٹی یہ میرے ابو کی تصویر ہے۔ میرے ابو ڈاکٹر ہیں ابھی تھوڑی دیر تک وہ بھی آجاتے ہیں۔"

"نہیں......نہیں یہ......یہ کیسے......؟ اف خدایا! نہیں......نہیں......" یہ کہہ کر وہ بھاگی۔

"آنٹی پلیز بات تو سنیں۔" مگر وہ تو کوئی بات سنے بغیر گیٹ پار کر چکی تھیں۔

●......●......●

"امی آپ جب سے موحل کے گھر سے آئی ہیں کچھ نہیں بتا رہیں آخر ہوا کیا؟ کیا آپ کو موحل اچھی نہیں لگی۔"

"بیٹے آپ موحل کو بھول جاؤ۔ وہ بہت اچھی ہے مگر ہم ان لوگوں کے قابل نہیں ہیں ویسے بھی ہم آج ہی یہ شہر چھوڑ دیں گے اور گاؤں چلے جائیں گے۔ گاؤں والوں کو ایک اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور میرا بیٹا ایک بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔"

"مگر کیوں امی۔ ہم یہ شہر کیوں چھوڑیں۔"

"اس کیوں کا جواب میرے پاس نہیں ہے بیٹے۔"

"امی میں نے ہمیشہ آپ کی خواہشوں کو مقدم رکھا ہے اور اب موحل میری آرزو میری زندگی ہے پلیز امی مجھے میری زندگی سے محروم نہ کریں۔ موحل میں کس چیز کی کمی ہے۔ سلیقہ مند، شریف اور باکردار ہے۔ کیا آپ کو ایسی ہی بہو کی خواہش نہیں ہے۔ آپ کیوں اسے ٹھکرا رہی ہیں۔"

"عزیز بیٹا! وہ بہت اچھی ہے۔ مجھے اب وہ اتنی عزیز ہے جتنے تم مگر تمہاری شادی اس سے ممکن نہیں تم انہونی چاہ رہے ہو۔ جو میرے بس میں نہیں ہے۔"

"امی ابھی تو ہم گاؤں نہیں جاسکتے چند دن ٹھہر جائیں پھر میں کچھ سوچتا ہوں۔"

"تم موحل سے بات نہیں کرو گے میں اس شرط پر چند دن اس شہر نامراد میں ٹھہروں گی۔"

"ابھی میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کرتا۔"

●......●......●

"موحل امی نہیں مان رہیں۔ انہوں نے کبھی میری کوئی خواہش رد نہیں کی تم سے ملے بغیر وہ تمہیں بہو مان چکی تھیں مگر تمہارے گھر سے آنے کے بعد وہ کسی صورت تیار نہیں تمہارے گھر کیا ہوا تھا۔"

"عزیز میں کیا کہوں؟ آنٹی ہمارے گھر آئیں مجھے بے تحاشا پیار کیا مگر ابو کی تصویر دیکھتے ہی "نہیں، نہیں" کر کے چلی گئیں۔ میں نہیں جانتی ایسا کیوں ہوا۔ لیکن آنٹی کا رویہ دیکھ کر اتنا تو میں سمجھ گئی ہوں کہ ابو کے ساتھ آنٹی کا کوئی لنک ہے۔ کیا تعلق ہے یہ الجھن تو میں بھی سلجھانا چاہتی ہوں مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔"

"او کے موحل تم ایک کام کرو تم آنٹی اور انکل کے ساتھ آج شام ہمارے گھر آؤ تاکہ اس الجھی کہانی کو سلجھا سکیں۔ کیونکہ میں تمہارے بنا نہیں جی سکتا۔"

"عزیز میں نے بھی تمہارے ساتھ کے خواب دیکھے ہیں۔ تمہارے علاوہ میری زندگی میں کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہوسکتا ہے آنٹی اور ابو میں کوئی دشمنی کا سلسلہ ہو اللہ کرے ہم دونوں کی وجہ سے اس دشمنی کا خاتمہ ہوجائے۔"

شام کو موحل اپنی امی اور ابو کے ساتھ چلی آئی۔

"امی دیکھیں کون آیا ہے؟"

اور وہ موحل کے ساتھ ساجد کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وقت نے صرف بالوں میں سفیدی کر دی تھی۔ خوشحالی اور خوش نصیبی نے اس میں کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا۔ وہی پچیس سال پہلے والا ساجد نظر آرہا تھا بس اس وقت جوان تھا اب مڈل ایج تھا۔ جبکہ وہ خود سرتاپا بدل گئی تھی۔ وہ چہرہ جہاں گلابیاں کھلتی تھیں۔ اب زردی مائل اور جھریوں زدہ تھا۔ دکھوں اور غموں نے جوانی کو چاٹ کر بڑھاپے کی چادر اوڑھا دی تھی۔ وقت دونوں پر ایک جیسا گزرا مگر حالات کی تلخی نے ایک کی پہچان ختم کر دی۔ جسے وہ انتظار کی سولی پر لٹکا آیا تھا۔ وہ 18 سال کی پر شباب لڑکی تھی مگر آج اس کے سامنے دکھوں اور غموں کی ایسی تصویر تھی جس نے اپنی پوری زندگی بیٹے کی پرورش اور شوہر کے انتظار میں گزار دی۔ اس لیے وہ اسے پہچان ہی نہ سکا کہ وہ اس کے ماضی کی بھول شبنم ہے شبو، جسے وہ زندگی کہتا تھا۔

اور شبو نے اسے اس لیے پہچان لیا کہ ساجد اس بھول کو فراموش کر کے نئی دنیا بسا کر مست ہوگیا۔ خوشی اور خوشحالی نے اس کے چہرے کو ذرا بھی تو نہ بدلا۔ عمر کے گزرنے کی ایک ہلکی سی جھلک کن پٹیوں اور بالوں کی سفیدی کی صورت میں نظر آئی۔

"امی پلیز انکل اور آنٹی ہیں انہیں بیٹھنے کے لیے تو کہیں۔"

"عزیز ساجد......!" اس نے ساجد پر زور دیتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم موحل کو فون نہیں کرو گے مگر تم نے......!"

"اور موحل تم اپنے والدین کو لے کر چلی جاؤ کیونکہ میرے پاس میرے بیٹے کے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"آنٹی پلیز مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ ابو سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔ آپ ابو کی تصویر دیکھ کر بغیر کسی سے ملے ہمارے گھر سے چلی آئیں۔"

اس نے ساجد علی کی طرف دیکھا کہ شاید اسے ماضی کی شبو یاد آجائے مگر وہاں تو صرف حیرانی کا تاثر تھا۔ پہچان کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی آنکھیں کہہ اٹھیں ساجد علی مجھے غور سے دیکھو شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔

اور ساجد علی نے غور سے دیکھا کچھ ایسا تھا اس سامنے کھڑی عورت میں کہ وہ بے اختیار دیکھتا چلا گیا۔

"شبو......شبنم......تم......!"

"ہاں ساجد علی میں شبو، جسے تم انتظار کی سولی پر لٹکا کر جیتے جی مار آئے تھے۔ مگر اس ربّ کی ذات نے مجھے زندہ رکھا ہر آزمائش کے باوجود۔ تم نے تو نئی دنیا بسا لی مگر میں، میں......!"

"ابو یہ کون ہیں؟"

"ہاں ساجد علی اپنی بیٹی کو بتاؤ کہ تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے کیونکہ میں نے تو ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو یہاں سے دور لے جاؤں گی کیونکہ میں انہیں کسی نئے رشتے سے آشنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"ابو پلیز بتائیں یہ کون ہیں؟"

"موموبہ تمہاری امی ہیں، عزیز......عزیز میرا بیٹا ہے۔"

اور ان دونوں پر تو گویا چھت گر پڑی اس انکشاف سے۔

"موحل تم میری بہن ہو خدایا میں کیسے اپنی بہن کا سامنا کروں گا۔"

"عزیز میرا بھائی اف خدایا یہ کیا ہوگیا۔ میں اپنے بھائی......!"

عزیز ایک دم بھاگا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"عزیز میری جان دروازہ کھولو کیوں دروازہ بند کرلیا ہے۔ ہم...... ہم یہاں سے چلے جائیں گے آج اسی وقت۔"

"امی ابو کے کیے کی سزا پہلے آپ کو ملی اور اب مجھے۔ موموميری بہن ہے؟ یہ انکشاف میرے لیے جان لیوا ہے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں مومل کا سامنا کرسکوں۔ میرے لیے یہ احساس ہی سوہان روح ہے کہ میں نے اپنی ہی بہن سے شادی کی آرزو کی۔ جانے لوگ شادیاں کرکے چھپاتے کیوں ہیں ان کے قصور کی سزا اولاد کو جھیلنا پڑتی ہے۔ امی پلیز مجھے معاف کردیں میں آپ کو بے آسرا کررہا ہوں مگر اس مقدس انکشاف کے بعد میرے اندر جینے کا حوصلہ نہیں رہا۔ اس نے تیزی سے دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا مگر عزیز خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے تیز دھار چھری سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔

عزیز...... عزی...... یہ تم نے کیا کیا......؟ کن گناہوں کی سزا دی تو نے......" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"یہ میرا بیٹا میرا آسرا کیسی بھول ہوئی مجھ سے مجھے معاف کردو۔"

"عزیز سچ کہتا ہے ابو آپ کی بھول کی سزا ہم سب کو لے ڈوبی۔ میرے لیے بھی اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہے کہ میں، میں نے نہیں ابو، میں تو...... میں تو شرم ناک احساس کو لفظوں میں بھی بیان نہیں کرسکتی تو پھر اس اذیت ناک احساس کے ساتھ زندہ کیسے رہ سکتی ہوں۔ پل پل مرنا بہت مشکل ہے۔ پل پل مرنے سے بہتر ہے میں بھی......!" عزیز کی طرح اس نے تیز دھار چھری اٹھا کر اپنی شہہ رگ کاٹ لی۔

"ساجد، ساجد دیکھو یہ کیا ہوگیا۔ تم کیوں آئے میرے گھر آگ لگادی تم نے۔ جب میں تمہیں تلاش کرتی رہی اس وقت ملے نہیں اور اب کیوں ملے میں عزیز کے بغیر کیسے جیوں گی۔ یہ لو چھری مار دو، مار دو مجھے......!" کہتے کہتے وہ عزیز کے اوپر گری اور پھر اٹھ نہ سکی۔

"ساجد علی تم نے کیا کیا، ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔ موموميری مومو میری اکلوتی بیٹی۔ تم مجھے بتاتے تو سہی۔ میں، اسے خود لے آتی اپنے گھر۔ وہ تو تمہاری پہلی بیوی تھی سوکن تو میں بنی۔ میری مومو اور یہ عزیز اور یہ عورت۔" وہ روتے روتے گری اور بے ہوش ہوگئی۔

ساجد علی تنہا کھڑا رہ گیا۔ میری بھول میری غلطی، میں قاتل ہوں ان سب کا۔ ہاں، ہاں میں نے قتل کیا ہے وہ کپڑے پھاڑتا چیختا چلاتا گھر سے نکل گیا۔

ساجد آج بھی گلیوں میں پھرتا ہے۔ کبھی رونے لگتا ہے کبھی قہقہے لگاتا ہے۔ زندگی اس کے لیے سزا بن گئی ہے۔ جانے کب اس کی سزا ختم ہوگی۔ کئی لوگ ایسا کرتے ہیں شادی کرکے بھول جاتے ہیں اور پھر نئی دنیا بسا لیتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ دنیا گول ہے اور ان کی اپنی ہی اولاد نئے نئے تعلق نئے نئے رشتے قائم کرکے ایک دوسرے کے ساتھ تو......؟ مقدس رشتے اگر آلودہ ہوگئے تو......؟

• نکاح جیسی سنت کو لوگوں نے مذاق کیوں بنا لیا ہے کہ یہ مرد حضرات جہاں جاتے ہیں نکاح کی داستان چھوڑ آتے ہیں اور دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اس داستان کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

⌘

قرابت

برادرم عمران احمد
السّلام علیکم!
طویل عرصہ بعد ایک سچی کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ کہانی موجودہ حالات کے پس منظر میں ہے ہم ایک طرف انسانیت سے دور ہوتے جا رہے ہیں تو دوسری طرف کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے نام پر خود کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی عظیم خاتون کی کہانی ہے جس نے پڑوس کی بیٹی کی خاطر اپنے ہاتھ خود اپنے ہی خون سے رنگ لیے تھے۔
امید ہے قارئین کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
لقمان علی
لاہور

خواب دیکھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ ہر عمر میں آدمی خواب دیکھتا ہے لہٰذا میں بھی اس وقت بڑا ہی سہانا خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے بُری طرح جھنجوڑ کر خوابوں کی دنیا سے واپس لانے کی کوشش کررہا ہے۔ میں فوراً ہی اس دنیا سے واپس آ گیا تھا۔ میں نے اپنی نیند سے بوجھل پلکیں اوپر اٹھائیں، میری آنکھوں میں نیند کا خمار پرانی شراب کے خمار کی طرح چھایا ہوا تھا۔ میری بیوی رضیہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھانے چاہے تو فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس کی منجمد آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا، چہرہ دُھلی ہوئی چادر کی طرف سفید ہورہا تھا۔ اس کا خوف سے بُرا عالم تھا۔ میں رضیہ کی یہ حالت دیکھ کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا تھا۔

"خیریت تو ہے......؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" رضیہ نے میرے پاس بیٹھ کر لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "محلے میں قتل ہوگیا ہے ایک قیامت آئی ہوئی ہے۔"

"قتل ہوگیا ہے۔" میں ایک دم سے اپنی جگہ سے اچھل گیا اور سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ "کس کا قتل ہوگیا ہے؟"

"رشید کا......؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"رشید کو قتل کردیا گیا ہے۔"

محلے میں تین چار رشید تھے۔ معلوم نہیں وہ کس رشید کی بات کررہی تھی۔ وہ اس قدر حواس باختہ تھی کہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کرپا رہی تھی۔ مجھے دریافت کرنا پڑا۔

"کون سے رشید کو......؟"

"نجو خالہ کے بیٹے رشید کو۔"

"اس رشید کو......؟"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ نجو خالہ کے بیٹے رشید کو قتل کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا، محلے میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو رشید کو قتل کرنا تو درکنار اس پر ہاتھ تک اٹھا سکے، ہر کوئی اس سے ڈرتا تھا۔ سبھی خوف کھاتے تھے۔ ہر کسی کو اپنی جان اور عزت و آبرو پیاری تھی، جس شخص کو پولیس کی پشت پناہی حاصل ہو

اس کا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک نمبری بدمعاش، غنڈہ اور منشیات فروش، چور، ڈکیت بھی تھا۔ اس میں اتنی برائیاں تھیں کہ ان کا شمار آسانی سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے محلے میں ایک مکان کرائے پر لے کر اسے منی سینما ہاؤس بنا دیا تھا۔ وی سی آر پر مخرب اخلاق فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ جب اس نے بے ہودہ فلمیں دکھانے کا سلسلہ شروع کیا تب سے محلے کے لڑکے بھی متاثر ہو رہے تھے۔ والدین پریشان تھے، کچھ لوگوں نے تھانے میں جا کر اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی۔

پولیس والوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی البتہ رپورٹ لکھوانے والوں کی شامت ضرور آگئی تھی۔ رشید نے ان لوگوں کو ہر طرح سے پریشان کیا اور ان میں خوف و ہراس پھیلایا تھا۔ ان لوگوں کو اس وقت سکون ملا تھا جب انہوں نے تھانے جا کر رپورٹ واپس لے لی تھی۔ رپورٹ واپس لینے کے لیے انہیں پولیس کو ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ رشید کے محلے میں قتل ہوجانے کا مطلب یہ تھا کہ اسے محلے کے کسی شخص نے قتل کیا تھا گویا اس نے اہل محلّہ پر بہت بڑا احسان کیا تھا، محلے والے اس سے نہ صرف نالاں تھے بلکہ عاجز آچکے تھے، آخر ان کی دعاؤں نے قبولیت پالی تھی۔

رشید کے قتل کی خبر سن کر میرے دل کو جتنی خوشی ہوئی تھی اتنی خوشی شاید مجھے کسی موقع پر نہ ہوئی ہوگی۔ اس خوشی کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں تھے میں نے سوچا آج کا دن محلے والوں کے لیے خوشی کا دن ہے۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ محلے والے بھی میری طرح ہی سوچ رہے ہوں گے، خاص کر وہ لوگ جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں اور خوب صورت عورتیں تھیں۔ رشید کی موت سے محلے میں جو غلاظت تھی وہ آج صاف ہوگئی تھی۔ ہر سڑک، ہر گلی اور ہر مکان صاف ستھرا ہوگیا تھا۔

"کیا آپ اس کی عبرت ناک موت کا منظر دیکھنے نہیں جائیں گے؟" رضیہ نے میرا شانہ ہلایا۔ "جو دیکھو اس کی لاش دیکھنے جارہا ہے۔ صبح ہی سے محلے میں چہل پہل شروع ہوگئی ہے۔"

"تم خوش ہونے کی بجائے اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کردیں۔ "کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ اس محلے سے برسوں کے بعد نجاست دور ہوگئی ہے، پہلی بار چین وسکون نصیب ہوا۔"

"خوشی تو مجھے بھی ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "مجھے تو نجو خالہ کا رہ رہ کر خیال آرہا ہے۔ رشید جیسا بھی تھا ان کا بیٹا تھا۔ رشید کے اس لرزہ خیز قتل کی خبر سن کر ان کے دل پر قیامت گزر گئی ہوگی۔"

"انہیں اپنے بیٹے کی موت کا اتنا غم نہیں ہوا ہوگا جتنا ہونا چاہیے۔ وہ کون سا سعادت مند اور نیک صفت بیٹا تھا۔ انہیں تو اس بیٹے کو دودھ بھی نہیں بخشنا چاہیے۔" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"آپ اس کی ماں اور ایک ممتا کو سمجھ نہیں سکتے۔" رضیہ نے تکرار کی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ کچھ پتا چلا کہ رشید کو کس نے قتل کیا ہے؟" میں نے موضوع بدلا۔

"جی ہاں!" رضیہ نے افسردگی سے ایک گہری سانس لی۔ "باقری صاحب نے......"

"باقری صاحب نے......؟" میں اچھل پڑا۔

"باقری صاحب نے رشید کو قتل کیا ہے، وہی اس کے قاتل ہیں۔" رضیہ نے بتایا۔

"اتنی جلدی کیسے پتا چل گیا کہ رشید کو باقری

صاحب نے قتل کیا ہے؟"

"وہ ایسے کہ رشید کا قتل باقری صاحب کے مکان کے اندر ہوا ہے۔" رضیہ کہنے لگی۔ "اس کی لاش ان کے گھر کے صحن میں پڑی ہوئی ہے۔ شاہدہ بھابی گئی تھیں، انہوں نے ہی آکر مجھے ساری تفصیل بتائی ہے۔ باقری صاحب کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

باقری صاحب تین چار دن پہلے ہی سعودی عرب سے لوٹے تھے۔ وہ ایک سال کے بعد واپس آئے تھے۔ رشید نے ان کا سامان سوزوکی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا، شاید وہ چوری کے ارادے سے گھر کے اندر داخل ہوا ہوگا پھر باقری صاحب نے اسے دیکھ کر گولی کا نشانہ بنا دیا ہوگا۔

"چوری کی واردات موت کا بہانہ بن گئی۔" میں نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا سامان چرا کے لے جارہا تھا؟"

"وہ سامان نہیں بلکہ فیروزہ کو اٹھا کر لے جارہا تھا۔" رضیہ بولی۔ "رشید پچھلی گلی سے دیوار پر چڑھا، صحن میں اتر کے اس نے پہلے تو باہر کا دروازہ کھولا پھر اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ان کی بیٹی حبس اور گرمی کی وجہ سے دروازہ کھلا رکھے سو رہی تھی۔ اس نے فیروزہ کے سینے پر خنجر کی نوک رکھ کے نیند سے بیدار کیا۔ وہ جاگی تو اسے اشارے سے چپ چاپ اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ فیروزہ دہشت زدہ سی ہوکر اٹھ بیٹھی، اس کا خوف سے برا عالم تھا، کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ وہ غریب مرتی کیا نہ کرتی۔ خنجر دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے تھے اور جسم پر لرزہ طاری ہوگیا تھا، اسے پس وپیش کرتا دیکھ کر رشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر سے گھسیٹا پھر اس نے اس بدمعاش کے حکم کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس کے ساتھ ہولی۔ وہ اس قدر بدحواس تھی کہ اسے اپنا کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا تاہم وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اسے اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے کچھ مہلت درکار تھی، جس وقت وہ دونوں صحن میں پہنچے رشید نے چشم زدن میں اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ موقع پا کر چیخنے لگی رشید نے جب اسے کندھے پر ڈال کر بھاگنا چاہا تو فیروزہ نے اس کے بال اور چہرے کو نوچنا کھسوٹنا شروع کردیا۔ اس اثناء میں باقری صاحب اور گھر والے شور سن کر جاگ گئے۔ باقری صاحب الماری سے اپنا پستول نکال کر صحن میں آئے۔ انہوں نے رشید کو للکارا مگر رشید نے کوئی توجہ نہیں دی نا ہی فیروزہ کو نیچے اتارا، بجائے اس کے دروازے کی طرف بھاگنے لگا، یہ دیکھ کر باقری صاحب سے برداشت نہ ہوا، انہوں نے پستول سے پے در پے دو فائر کیے دونوں گولیاں رشید کی پیٹھ میں اتر گئیں اور وہ جہنم رسید ہوگیا۔"

"قتل کی واردات کتنی دیر پہلے ہوئی ہے؟"

"رات تین بجے۔" رضیہ نے کہا۔ "شاہدہ بھابی باقری صاحب کے گھر میں موجود عورتوں سے یہ واقعہ سن کر آئی ہیں۔"

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو صبح کے پانچ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ میں دس منٹ کے بعد باقری صاحب کے ہاں جانے کے لیے نکلا تو محلے کے لڑکوں اور مردوں کو اپنی عورتوں کے ساتھ باقری صاحب کے مکان کی طرف جاتے دیکھا مجھے ایسا لگا جیسے لوگ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ کی طرف جارہے ہوں، میں بھی ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تو میرے پڑوسی مسعود احمد بھی میرے ساتھ آملے۔ کچھ دور گئے تھے کہ کچھ لوگ باقری صاحب کے مکان سے واپس آرہے تھے۔ ان میں شیخ صاحب بھی تھے، ہم نے انہیں روک کر پوچھا۔

"کیا رشید کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہے؟"

"جی ہاں!" شیخ صاحب نے جواب دیا۔ "پولیس باقری صاحب کو تو تھانے لے کر چلی گئی ہے لیکن لاش ابھی تک نہیں اٹھائی ہے۔ سنا ہے انسپکٹر موقع واردات کا معائنہ کرے گا تو اٹھائی جائے گی۔"

"رشید کی ماں کچھ دیر پہلے ہی پہنچی ہیں' ان کا صدمے سے برا حال ہے۔"

"یقین نہیں آتا ہے کہ باقری صاحب جیسا شخص گولی بھی چلا سکتا ہے۔" میں بولا۔

"ان کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ جو بھی سن رہا ہے اسے یقین نہیں آرہا۔" شیخ صاحب توقف کرکے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگے تو مسعود احمد نے درمیان میں پوچھا۔

"کس بات کا یقین نہیں آرہا ہے؟"

"باقری صاحب کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے رشید کو قتل نہیں کیا ہے۔" شیخ صاحب نے بتایا۔

"باقری صاحب نے قتل نہیں کیا ہے تو پھر ان کی بیوی' بیٹی یا پھر ان کے کسی لڑکے نے کیا ہوگا۔" شیخ صاحب نے بتایا۔

"ان میں سے کسی نے قتل نہیں کیا ہے۔" شیخ صاحب کہنے لگے۔ "بیوی ویسے ہی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ لڑکے چھوٹے ہیں' فیروزہ سے چھوٹی لڑکی وہ بھی بارہ تیرہ سال کی ہے۔ یہ لوگ قتل کرنے سے رہے' لے دے کر باقری صاحب ہی رہ جاتے ہیں۔ باقری صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے گھر والوں کی آنکھ گولیاں چلنے سے کھلی تھیں' وہ دروازہ کھول کر باہر آئے تو رشید کی لاش خون میں لت پت اور فیروزہ صحن کے فرش پر بے ہوش پڑی تھی' رشید کی لاش کے پاس پستول تھا' یہ پستول باقری صاحب ہی کا تھا' اگر اس کے پاس پستول ہوتا بھی تو وہ رشید پر گولی نہیں چلا سکتی تھی۔ اس لیے کہ اسے جگا کر رومال سونگھا کر بے ہوش کر دیا تھا' کلوروفام والا رومال موقع واردات پر رشید کی جیب سے مل گیا ہے۔ لہٰذا فیروزہ پر شک نہیں کیا جا سکتا ہے' لے دے کے باقری صاحب ہی رہ جاتے ہیں لیکن ان کا جرم سے انکار کرنا میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"عجیب سی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "پستول باقری صاحب کا' باقری صاحب کے گھر رشید کی لاش پڑی ہے پھر بھی قتل سے انکار کر رہے ہیں۔"

شیخ صاحب اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ مسعود احمد نے چلتے چلتے تبصرہ کیا۔

"دراصل باقری صاحب اپنے آپ کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ باقری صاحب نے اگر پولیس کو یہ بیان دیا ہے تو انہوں نے بچکانہ حرکت کی ہے اگر انہوں نے رشید کو قتل نہیں کیا ہے تو پھر کس نے کیا ہوگا؟ بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ ان میں سے کسی نے رشید کو قتل نہیں کیا ہے تو پھر ان کا یہ پستول کس کے پاس تھا اور اس شخص کو رشید کو قتل کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی پھر یہ کہ ان کا پستول نادیدہ قاتل کے پاس گیا کیسے؟"

"جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اب تک متضاد باتیں سن چکا ہوں۔"

ہم دونوں باقری صاحب کے مکان کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ کوئی دس برس سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہے تھے۔ میں باقری صاحب اور فیروزہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ لوگ یہاں کوئی تیس برس سے آباد تھے۔ وہ کوئی دس برس سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہے تھے۔ وہ سال میں ایک بار اپنے وطن آتے تھے اور دو مہینے کی چھٹیاں بیوی بچوں کے ساتھ گزار کر واپس چلے جاتے تھے۔ گزشتہ سال چھٹیوں پر آئے تھے اور وہ

اپنی بیٹی فیروزہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے کر گئے تھے۔ باقری صاحب کی دو لڑکیاں تھیں اور لڑکے تین تھے۔ لڑکے دونوں بہنوں سے چھوٹے تھے۔ فیروزہ سب سے بڑی لڑکی تھی۔ فیروزہ بہت حسین و جمیل تھی۔ اسے دیکھ کر یہ دھوکا ہوتا تھا جیسے وہ قصہ کہانیوں کی شہزادی ہو' وہ جتنی حسین تھی اس سے کہیں زیادہ خوب سیرت بھی تھی۔ اس جیسی حسین لڑکی پورے محلے میں تو کیا شہر میں نہ ہوگی۔ اس کی صورت اور سیرت کا چرچا محلے میں بہت تھا اس وجہ سے محلے کے بہت سے لڑکے اسے پانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ ان میں رشید بھی تھا۔ رشید کی ماں اپنے بیٹے کے کرتوتوں سے خوب واقف تھی اور اس کی ماں کو اپنی حیثیت کا اچھی طرح سے اندازہ تھا اور پھر رشید پڑھا لکھا بھی نہیں تھا جب کہ فیروزہ نے بی اے پاس کیا تھا۔ رشید کی ماں نجو خالہ سلائی کڑھائی کا کام کرکے گزر اوقات کرتی تھی۔ وہ کس منہ سے اپنے اوباش بیٹے کے لیے فیروزہ کا رشتہ مانگتیں۔ نجو خالہ کا باقری صاحب کے ہاں برسوں سے آنا جانا تھا' وہ سلائی کا کام ان کے ہاں سے بھی لے جاتی تھی اور ان کی بیٹیوں کو قرآن شریف بھی پڑھایا تھا۔ نجو خالہ اپنے بیٹے کا رشتہ لے جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں تو رشید نے اپنے ایک دوست کی ماں کو باقری صاحب کے ہاں بھیجا تھا۔ باقری صاحب کی بیوی نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ اس جواب نے رشید کو چراغ پا کر دیا۔ اس نے اس انکار کو اپنی بے عزتی پر محمول کیا' ایک روز اس نے دن دہاڑے برسرعام فیروزہ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فیروزہ کی جرأت او ربہادری کی وجہ سے ان کی یہ کوشش ناکام ہوگئی تھی اس روز پتا چلا کہ فیروزہ خوب صورت' خوب سیرت ہی نہیں ایک بہادر لڑکی بھی ہے۔ اس واقعے کے کوئی دو مہینے بعد فیروزہ کی شادی ہوگئی تھی۔ اگر فیروزہ کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو اس بات کا امکان تھا کہ وہ فیروزہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ فیروزہ کو اغواء کرکے اس سے زبردستی اپنا نکاح پڑھوالے۔ اس طرح فیروزہ کے گھر والے فیروزہ کو اس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوجائیں گے' وہ اس گھر کا داماد بن جائے گا بہرکیف اس کا منصوبہ ناکام ہوگیا تھا۔ ادھر فیروزہ کی شادی کے بعد اس کے گھر والوں کو متوقع اذیت سے نجات مل گئی تھی۔

بیٹا جتنا چھٹا ہوا اور دس نمبری بدمعاش تھا اس کی ماں نجو خالہ اتنی ہی شریف' سیدھی سادی اور محنتی عورت تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کا ہر فرد ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ عزت و احترام نجو خالہ کو یونہی نہیں مل گیا تھا۔ نجو خالہ نے یہ سب کچھ اپنے مثالی کردار سے حاصل کیا تھا۔ وہ سلائی کڑھائی کرکے نہ صرف اپنا گزارا کرتی تھیں بلکہ جو لوگ غریب اور ضرورت مند ہوتے تھے وہ ان کی بڑی فراخ دلی سے مدد بھی کرتی تھیں۔ بڑی خود دار عورت تھیں' میں نے اپنی زندگی میں ایسی پُرخلوص اور جذبے والی عورت نہیں دیکھی تھی' میرے ہاں تو ان کا کچھ زیادہ ہی آنا جانا تھا۔

وہ اپنے ناخلف بیٹے سے جتنی نالاں تھیں شاید ہی محلے میں کوئی ہوگا۔ وہ کسی کے منہ سے اپنے بیٹے کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ رشید کو بیٹا کہتے ہوئے وہ شرم محسوس کرتی تھیں' اس کے باوجود بھی وہ اپنے اوباش بیٹے کو کسی وجہ سے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھیں۔ ایک بات اور تھی وہ یہ کہ رشید کسی قیمت پر یہ گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ وہ اپنی ماں سے کہتا تھا کہ یہ گھر چھوڑ کر چلی جائے وہ تو اپنی ماں

کی موت کے انتظار میں تھا۔ کب ماں مرے اور وہ کب اس مکان پر قبضہ کرے گا۔ مکان ان کے نام تھا۔ ان کے باپ نے انہیں جہیز میں دیا ہوا تھا۔ وہ ایک صحت منداور چاق و چوبند عورت تھیں۔ اس لیے ان کے جلد مر جانے کا امکان نہیں تھا۔

میں اور مسعود احمد' باقری صاحب کے مکان کے سامنے پہنچے تو اندر ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ اندر عورتیں بھری ہوئی تھیں' یہ کہرام رشید کی موت پر نہیں تھا بلکہ باقری صاحب کی گرفتاری کی وجہ سے تھا۔ محلے کی لڑکیاں اور عورتیں آجا رہی تھیں' ہم دونوں باقری صاحب کے مکان کے پچھلے حصے کی طرف گئے۔ مکان کے عقبی دروازے کے باہر اور گلی میں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ گلی میں اپنے اپنے مکانوں کے عقبی دروازے پر مرد' لڑکیاں اور عورتیں کھڑی ہوئی چہ مگوئیاں کر رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے خوف و ہراس صاف ظاہر تھا گلی میں چلنے سے دشواری ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے ہجوم کو باقری صاحب کے مکان سے چند گز کے فاصلے پر روک رکھا تھا میں اور مسعود احمد بھیڑ کو چیرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح آگے پہنچ گئے۔ باقری صاحب کے مکان کے دروازے کھلے ہوئے تھے صحن کا اندرونی منظر صاف نظر آرہا تھا وسیع و عریض صحن کے بیچوں بیچ رشید کی لاش چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ نجو خالہ دو تین عورتوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں اور اپنے بیٹے کی لاش کی طرف دیکھ دیکھ کر روئے جا رہی تھیں۔ مجھے رضیہ کی یاد آئی اس نے کہا تھا رشید جیسا بھی تھا نجو خالہ کا بیٹا تھا۔ مجھے ایسا لگا وہ اپنے اوباش رشید کی موت پر نہیں بلکہ اپنے بیٹے کی موت پر رو رہی ہیں۔ وہ اس وقت نجو خالہ نہیں تھیں بلکہ ایک ماں تھیں صرف ماں......!

رشید کی لاش پولیس کی کارروائی اور پوسٹ مارٹم کے بعد نجو خالہ کے حوالے کر دی گئی۔ محلے والوں نے نجو خالہ کے اخلاق اور ان کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے ان کی بات مان کر اس اوباش بیٹے کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا تھا' میں تو کچھ زیادہ سرگرم رہا تھا۔ رشید کی تدفین کے بعد محلے والے ان کے ہاں پہنچے تھے کچھ دیر کے بعد میں اور میری بیوی نجو خالہ کے پاس رہ گئے تھے۔ گھر پر ایک عجیب سی اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رضیہ بولی۔

"نجو خالہ! آپ ہمارے ساتھ گھر چلیں' کچھ دنوں تک ہمارے ہاں رہیں۔ اکیلی گھر میں رہیں گی تو جی گھبرائے گا۔ ہمارے ہاں آپ کا دل بہل جائے گا۔"

وہ دل گرفتہ لہجے میں بولیں۔

"بیٹے! میں پہلے کب اکیلی نہیں تھی۔ کل بھی اکیلی تھی' آج بھی اکیلی ہوں۔ وہ گھر میں رہتا ہی کب تھا دن میں کسی وقت آتا تھا چند گھنٹے سو کر چلا جاتا تھا' مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اس کے زندہ ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا' رشید کے مرنے کے بعد بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔"

☆☆☆

دوسرے دن صبح نو بجے نجو خالہ میرے ہاں آئیں تو میں نے انہیں نشست گاہ میں بٹھایا' ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے جیسے وہ رات بھر اور اپنے بیٹے کی موت پر آنسو بہاتی رہی ہوں' رضیہ نے انہیں زبردستی ناشتا کرایا۔ انہوں نے چند لقمے زہر مار کیے' چائے پی اور مجھ سے بولیں۔

"بیٹے! میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو گے؟"

"پولیس اسٹیشن!" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ پولیس اسٹیشن جا کر کیا کریں گی؟"

"انسپکٹر صاحب نے میرا بیان لینے کے لیے مجھے تھانے بلایا ہے۔"

"کیسا بیان؟" مجھے نجو خالہ کی بات سن کر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ "اب انسپکٹر کو بیان کی کیا ضرورت پڑ گئی' ایک سیدھا سادہ سا قتل کا کیس ہے' جو فوراً ہی حل ہو گیا تھا۔ قاتل حوالات میں بند ہے۔ اب مقتول کی ماں سے بیان لے کر تھانے والے کیا کریں گے' آپ گھر بیٹھیں میں پوچھ کر آتا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم بیٹے!" وہ بولیں۔ "یہ تو تھانے چل کر ہی پتا چلے گا۔ صبح صبح تھانے سے ایک آدمی گھر پر آیا تھا' اس نے مجھ سے کہا کہ انسپکٹر صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ کچھ دیر کے لیے تھانے آجائیں' وہ نہ بھی آتا تو میں خود بھی تمہیں ساتھ لے کر تھانے جانے والی تھی۔ میں رات ہی سے تھانے جانے کا سوچ رہی تھی۔"

"آپ کس لیے خود تھانے جانا چاہتی ہیں؟"

"باقری صاحب سے ملنے کے لیے۔"

"باقری صاحب سے ملنے کے لیے؟" میں نے اور رضیہ نے حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ "آپ اپنے بیٹے کے قاتل سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہیں...... وہ کس لیے؟"

"یہ تو میں تھانے چل کر ہی بتا سکتی ہوں۔" وہ بے قراری سے بولیں۔ "جلدی چلو بیٹے! پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اڑ کر تھانے پہنچ جاؤں۔"

"تو پھر چلیے......"

میں نجو خالہ کو ساتھ لے کر تھانے کی طرف چل پڑا۔ میں نے ان کے چہرے پر جو بے قراری دیکھی تھی اس سے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ باقری صاحب سے کچھ کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہیں۔ ساری رات ان کے وجود میں جیسے ممتا کا آتش فشاں دہکتا رہا ہو اور اب وہ لاوا بہنے کے لیے بے قرار ہو۔ وہ نفرت جو نجو خالہ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے تھی اس کی جگہ شاید ممتا نے لے لی تھی' وہ ممتا باقری صاحب سے کچھ کہنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔

تھانہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دونوں دس منٹ میں تھانے پہنچ گئے تھے پھر ہم دونوں انسپکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں باقری صاحب بھی موجود تھے' وہ انسپکٹر کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ باقری صاحب کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی تھی ان کا زرد اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میرے دل پر چوٹ لگی۔ وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے' اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک بے حد شریف آدمی تھے۔ ایسے نیک نفس آدمی اس معاشرے میں خال خال نظر آتے ہیں۔ ایک شریف آدمی غیرت مند بھی ہوتا ہے۔ کوئی غیرت مند باپ' یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی شادی شدہ جوان بیٹی کو ایک بدمعاش اٹھا کر لے جائے۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی کچھ کرتا جو انہوں نے کیا تھا۔ انہوں نے تو صرف دو گولیاں رشید کے جسم میں اتار دی تھیں اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو اس مردود کا پورا جسم گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیتا' اس کی کھوپڑی میں جانے کتنے سوراخ کر دیتا تاکہ رشید جیسے اوباش شخص سبق سیکھ سکیں۔

باقری صاحب نے مجھے دیکھا تو ان کا دل بھر آیا ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ میں نے ان کے خاندان کے لوگوں اور لڑکوں کو تھانے میں دیکھا تھا۔ وہ باہر بیٹھے تھے انہیں شاید باقری صاحب سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ میں نے ان کے پاس جا کر انہیں تسلی دی۔

"باقری صاحب! خدا پر بھروسا رکھیں' اس نے

چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
”معلوم نہیں مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔“ ان کی آواز بھرا رہی تھی۔ ”خدا گواہ ہے میں نے رشید کو قتل نہیں کیا۔“
نجو خالہ بھی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں اور باقری صاحب سے بولیں۔
”باقری صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو یہ منحوس دن دیکھنا پڑا۔ خدا بھی مجھے معاف کرے، میں نے آپ کو اتنی تکلیف اور اذیت اس لیے پہنچائی کہ اپنے بیٹے کی تدفین ٹھیک سے کرا سکوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی تدفین بھی نہ ہو سکے اور اس کی لاش اسپتال والوں کو چیر پھاڑ کے لیے دے دی جائے۔“
”آپ دونوں کس ضمن میں یہاں تشریف لائے ہیں؟“ انسپکٹر نے تند و تیز لہجے میں ہم دونوں سے کہا۔ اسے ہمارا اس طرح اندر آنا اور اس سے اجازت لیے بغیر باقری صاحب سے بات کرنا بڑا ناگوار لگ رہا تھا۔
”آپ نے نجو خالہ کو بلایا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”یہ آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئی ہیں۔“
”میں نے تو انہیں نہیں بلایا تھا۔“ انسپکٹر حیرت سے بولا۔
”میں انہیں اسی بہانے سے یہاں لائی ہوں۔“ نجو خالہ نے فوراً ہی کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں اپنے جرم کا اقرار کرنے آئی ہوں۔“
”کون سے جرم کا؟“ انسپکٹر نے چونک کر پوچھا۔
”اپنے بیٹے کے قتل کا۔“ نجو خالہ نے بڑے سکون اور اعتماد سے جواب دیا۔
نجو خالہ کی بات سن کر میں اور باقری صاحب اچھل پڑے تھے۔ ہم دونوں کو سماعت کے فتور کا احساس ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کی طرف تحیر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔ انسپکٹر پر کوئی شدید ردعمل نہیں ہوا تھا۔ انسپکٹر نے نجو خالہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ان کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔
”تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟“ انسپکٹر نے ان کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔ ”کہیں بیٹے کی موت کے صدمے سے تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔“
”مجھے اس کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا ہے۔ صدمہ صرف اس بات کا ہے کہ رشید میرا بیٹا کیوں تھا۔“ وہ ایک سانس میں بول گئیں۔ ”میں اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوں، میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“
”کہیں تم باقری صاحب کو بچانے کے لیے قتل کا الزام اپنے سر تو نہیں لے رہی ہو؟“
”میں باقری صاحب کو واقعی بچانا چاہتی ہوں۔ اس لیے کہ یہ بے گناہ آدمی ہیں، اصل مجرم تو میں ہوں انسپکٹر صاحب! آخر آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہے ہیں؟“
”اس لیے کہ قانون ثبوت مانگتا ہے، زبانی ثبوت نہیں۔ اسے ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے، سارے شواہد باقری صاحب کے خلاف جا رہے ہیں لیکن یہ ہیں کہ اپنے جرم کا اقرار کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔“
”ان کے خلاف کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“
”سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ تمہارے بیٹے کی لاش جو خون میں لت پت پڑی تھی وہ کسی سڑک پر یا تمہارے گھر کے صحن میں نہیں پڑی تھی۔ باقری صاحب کے گھر کے صحن میں پڑی تھی۔ پستول بھی لاش کے پاس ہی پڑا ہوا ملا ہے، یہ پستول باقری صاحب کا تھا انہوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ

پستول ان کا اپنا ہے، ان کے پاس لائسنس بھی ہے۔“
”کیا یہ سچ ہے کہ پستول پر پستول چلانے والے کے ہاتھ کے نشان آ جاتے ہیں۔“ نجو خالہ نے پوچھا۔
”بالکل سچ ہے۔“
”کیا آپ کو یہ پتا چلا کہ اس پستول پر کس کے ہاتھ کے نشان ہیں؟“
”ابھی اس کی رپورٹ نہیں آئی ہے۔“
”رپورٹ نہیں آئی ہے تو آپ رپورٹ منگوا کر دیکھ لیں اس پستول پر باقری صاحب کی انگلیوں کے نہیں میری انگلیوں کے نشان ہوں گے اس لیے کہ ان کا پستول میرے پاس تھا۔ میرے قبضے میں تھا، گولیاں میں نے چلائی تھیں اگر میرے ہاتھ نہ کانپتے اور میری طاقت جواب نہ دیتی تو میرے ہاتھ سے پستول نہ گرتا۔ پستول نہ گرتا تو اس پستول کی ساری گولیاں ایک ایک کر کے اپنے اوباش بیٹے کے سینے میں اتار دیتی۔“
”میں کس طرح یقین کر لوں کہ ایک ماں......“ انسپکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مشکوک نظروں سے نجو خالہ کی طرف دیکھا۔
”اگر فیروزہ کی زخم خوردہ ماں میرے آگے اپنی ممتا کی جھولی نہ پھیلاتی تو شاید میں اپنی ممتا کو قتل نہ کرتی۔“ نجو خالہ کہنے لگیں۔ ”فیروزہ کی ماں نے مجھ سے ایک بار نہیں کئی بار کہا تھا کہ خدا کے لیے اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، فیروزہ کی شادی ہونے کے بعد بھی تمہارے بیٹے نے میری بچی کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ وہ میری بچی کے سسرال کے چکر لگاتا رہتا ہے، خوف و ہراس پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو بار بار سمجھایا کہ وہ اس معصوم لڑکی پر ترس کھائے، اسے پریشان نہ کرے۔ دو دن پہلے کی بات ہے رشید گھر پر تھا، دوپہر کا وقت تھا میں ایک گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے کے لیے گئی تو پتا چلا کہ ان کے گھر لاہور سے مہمان آئے ہوئے ہیں، میں گھر واپس آئی۔ باہر کا دروازہ کھلا دیکھ کر اور باتوں کا شور سن کر میں ٹھٹک کے رہ گئی، مجھے کچھ شک ہوا کہیں رشید نے جوئے کی محفل نہ جمائی ہو، میں اندر بے آواز داخل ہوئی، میں اس کمرے کے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی جس میں سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رشید اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔ یار! فیروزہ اپنے باپ سے ملنے آئی ہوئی ہے، سنا ہے دو ایک دن میں واپس چلی جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار وہ آئی ہے تو ایک رات میرے ہاں بھی مہمان رہے۔“
”کیا اسے پھر سے اغواء کرنے کی کوشش کرو گے؟“ اس کے کسی دوست نے پوچھا تھا۔
”اسے اغواء ہی کرنا پڑے گا۔“ رشید نے جواب دیا تھا۔ ”دن دہاڑے نہیں رات کے وقت۔ میرے سینے میں اس روز سے اسے پانے کی آگ بھڑک رہی ہے، جس روز سے اس کے گھر والوں نے میرا رشتہ نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اب میں اسے ساری زندگی کے لیے حاصل نہیں کر سکتا لیکن ایک رات کے لیے تو حاصل کر سکتا ہوں۔“
”اسے کیسے اغواء کرو گے استاد! وہ تو گھر سے ایک بار بھی نہیں نکلتی ہے۔“
”میں رات کے وقت ان کے گھر میں اتر کر اسے اٹھا لوں گا۔“ رشید نے کہا۔ ”کل رات میں اس کے گھر میں اترا تھا، وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ کمرے میں سو رہی تھی، اس کا شوہر ساتھ ٹھہرا ہوا نہیں ہے۔ میں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل بھی ہو گیا تھا، اسے جی بھر کے دیکھا بھی تھا پھر میں اس کے کمرے کی چٹخنی کھول کر باہر آ گیا تھا۔“
”کمال ہے یار! پھر اسے اٹھا کر کیوں نہیں لائے،

کیسا سنہرا موقع تھا۔"

"میں ریہرسل کرنے گیا تھا۔" رشید بولا۔ "اور پھر میرے ذہن میں کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں آج کی رات اسے اٹھا کر لاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آج رات ایک شاندار پروگرام بناؤں۔ یہ رات اس کے لیے ناقابل فراموش بن جائے۔ تم لوگ سب سے پہلے مجھے کلوروفارم کا انتظام کر کے دو پھر وڈیو کیمرے اور روشنی کا انتظام کرو۔ یہ سب رات گیارہ بارہ بجے منی سینما ہاؤس میں بالکل تیار رہے، میں اسے بے ہوش کر کے اٹھا کے لے آؤں گا۔ ہم اس کی فلم تیار کر کے چلائیں گے، اس فلم کا ٹکٹ پچاس روپے ہوگا، تم دیکھنا ہر ہفتہ کھڑکی توڑ ہفتہ ہوگا۔"

"اگر تمہاری ماں کو پتا چل گیا تو......؟"

"تم میری ماں کی فکر مت کرو، اسے ہوا بھی نہیں لگے گی، اگر اس نے کچھ کہا تو میں اسے سیدھا کر کے رکھ دوں گا۔"

پھر میں وہاں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی، میں اس پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ میں نے اس کی اور اس کے دوستوں کی باتیں سن لی ہیں۔ میں نے فیروزہ کے گھر کی راہ لی۔ سارا راستہ میرا دماغ بھی سنسناتا رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رشید اتنا گھناؤنا منصوبہ بھی بنا سکتا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔ میں نے کیسی اولاد کو جنم دیا۔ میرے پیٹ سے کیا ایک خبیث ہی کو پیدا ہونا تھا۔ میں اپنی نظروں میں خود گر گئی پھر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر گزرنے والا جیسے مجھ پر لعن طعن کر رہا ہو۔ میں فیروزہ کے ہاں پہنچی۔ فیروزہ نے دروازہ کھولا تھا، اس کا چہرہ دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل پر چابک مارا ہو۔ اس بچی کو میں نے گودوں میں کھلایا تھا۔ قرآن شریف پڑھایا تھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ میں نے اس سے صرف اتنا پوچھا تھا کیا ہوا میری بچی! اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی پھر اس کی ماں آ گئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میرے دل میں بجھی ہوئی چھری اترنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتی وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا پھر وہ رونے اور میرے آگے اپنی ممتا کی جھولی پھیلا کر گڑگڑانے لگی وہ روتے ہوئے بولی۔

"تمہارے بیٹے نے اب کے قسم کھائی ہے کہ وہ فیروزہ کو سسرال باعزت جانے نہیں دے گا۔"

اتنا کہہ کر نجو خالہ خاموش ہو گئیں۔ شاید وہ اپنی سانس درست کر رہی تھیں۔

"اگر آج کی رات رشید کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ چپ تو نہیں بیٹھے گا۔ وہ کسی اور دن اپنی حسرت پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔" نجو خالہ نے کہا۔ "کیوں نہ سانپ کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا جائے لیکن کیسے؟" میں سوچنے لگی۔ مجھے سوچوں میں دیکھ کر فیروزہ کی ماں اپنی جگہ سے اٹھی، الماری تک گئی۔ اس نے الماری کھولی اور کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی باہر نکال لی۔ نوٹوں کی گڈی کے ساتھ ایک پستول نکل کر فرش پر گرا جسے اس نے جلدی سے اٹھا کر کپڑوں میں چھپا دیا تھا۔ وہ نوٹوں کی گڈی مجھے دیتی ہوئی بولی تھی۔

"یہ تم اپنے بیٹے کو دے دو، پورے دس ہزار روپے ہیں۔ اس سے کہو اب وہ میری بیٹی فیروزہ کا پیچھا چھوڑ دے۔ ہم پر رحم کرے۔"

وہ پستول دیکھ کر میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا، میں نے فیروزہ کی ماں سے کہا۔

"نہیں بیٹی! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل سے رشید فیروزہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ سمجھو کہ سدا کے لیے راستے کا کانٹا نکل گیا۔ اب تم اطمینان سے رہو۔ تم میرے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر لے آؤ۔"

فیروزہ کی ماں نے جیسے ہی میری بات سنی، اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ الماری بند کیے بغیر کمرے سے نکلی۔ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے گئی تھی۔ اس کا دمکتا چہرہ دیکھ کر میرے دل کو کتنی خوشی ہوئی، میں بتا نہیں سکتی۔ میں نے کپڑوں کے نیچے سے پستول نکال کر اپنے کپڑوں میں چھپا لیا تھا پھر چائے پی کر گھر آئی، گھر پر رشید تھا اور نہ اس کے دوست، وہ گھناؤنا منصوبہ بنا کر جا چکے تھے۔ میں نے پستول دیکھا ضرور تھا لیکن اسے چلانا نہیں جانتی تھی، میں نے بڑی دیر تک پستول کو پکڑنے اور چلانے کی مشق کی تھی، جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں پستول چلا سکتی ہوں، نشانہ لے سکتی ہوں تو میں رشید کی تلاش میں نکلی تاکہ اسے اس کے ارادوں سے باز رکھ سکوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے مذموم ارادے سے باز نہیں آیا تو اسے وہیں گولی مار دوں گی۔ میں اسے باقری صاحب کے گھر جانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی، میں نے اسے بہت تلاش کیا وہ نہیں ملا پھر میں رات کے ایک بجے اپنے گھر سے چوروں کی طرح نکلی۔ باقری صاحب کے مکان کے عقبی حصے کی طرف آئی۔ اس مکان کے چبوترے پر بیٹھ گئی جو باقری صاحب کے مکان کے قریب تھا۔ میں اس چبوترے پر بیٹھ کے دروازے پر نظر رکھ سکتی تھی۔ رات اندھیری تھی اس تاریکی نے مجھے چھپا لیا تھا۔ میں وہاں بیٹھی ہوئی جاگتی رہی پھر جیسے میری آنکھ جھپک سی گئی۔ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا باقری صاحب کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یہ دیکھ کر میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ کہیں رشید فیروزہ کو اغواء کر کے تو نہیں لے گیا اگر ایسا ہوا تو کل میں فیروزہ کی ماں کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میں ایک دم سے ہڑبڑا کے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی مکان کی طرف بڑھی۔ اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ رشید فیروزہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے فیروزہ کے کمرے سے نکل رہا ہے۔ میں صحن میں پہنچی تو وہ بھی اس وقت تک صحن میں پہنچ چکا تھا، وہ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور حقارت سے پھیل گئیں، میں نے کہا۔

"تم فیروزہ کو جس طرح لائے ہو اسی طرح لے جا کر چھوڑ دو۔" وہ میری بات ان سنی کر کے باہر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس خیال سے کہ باتوں کے شور سے گھر کے لوگ نہ جاگ جائیں پھر میں نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کا نشانہ لیا، پے در پے دو فائر کر دیئے اس کے ہاتھ سے فیروزہ اور میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ پستول چلنے کا شور سن کر کوئی اپنے گھر سے نہیں نکلا تھا شاید لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے پھر میں گھر پہنچی تو صدمے سے غش کھا گئی تھی۔"

نجو خالہ کی کہانی اور ان کا اعتراف جرم سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ باقری صاحب کی جذباتی کیفیت مجھ سے جدا نہیں تھی، وہ اپنی ڈبڈباتی آنکھوں سے اس عظیم عورت کو دیکھ رہے تھے، جس نے ان کی بیٹی کا گھر بچانے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا تھا، بیٹا جیسا بھی تھا ان کا بیٹا تھا۔

نفرت

ایک نوجوان کا المیہ وہ پر امن اور قانون سے محبت کرنے والا شہری تھا۔ اسے قدرت کے رنگوں سے محبت تھی۔ وہ معاشرے میں پھیلی دہشت گردی اور جرائم کے باوجود امن' محبت اور خوشحالی کے خواب دیکھا کرتا مگر قانون کے نام پر لاقانونیت کا مظاہرہ کرنے والے چند وردی پوش محض سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی کوشش پر اسے دہشت گرد بنانے پر تلے ہوئے تھے۔
ایک ایسی تحریر جس کے کردار آپ کو اپنے ارد گرد سانس لیتے نظر آئیں گے۔
سال رواں کی خاص کہانی جو آپ کی روح کے تاروں کو جھنجوڑ دے گی۔

ملک میں ہونے والے خودکش حملوں اور بم دھماکوں سے لوگوں کے دلوں میں ڈر اور خوف اس قدر بیٹھ گیا تھا کہ وہ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے اور کسی انتہائی ضروری کام کے لیے بھی گھر سے نکلنے سے پہلے سو بار سوچتے تھے' بازاروں کی رونقیں ختم ہو گئی تھیں' کاروباری حضرات دن بھر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھ کر گھروں کو لوٹ جاتے' مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بھی کم ہو کر رہ گئی تھی۔ عوام عجیب قسم کے تناؤ کا شکار تھے اور دن بدن مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

آئے دن ہونے والے دھماکوں میں معصوم انسان شہید ہو رہے تھے' بازار' مارکیٹیں' اسپتال' سرکاری ادارے' مدارس' مذہبی اجتماع۔ یہاں تک کہ عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں رہی تھیں۔ حکومت ان حملہ آوروں اور دہشت گردوں کے سامنے بے بس دکھائی دینے لگی تھی' مگر جب حالات زیادہ بگڑنے لگے تو حکومتی اراکین سر جوڑ کر بیٹھ گئے' حملہ آوروں کے لیے گھیرا تنگ کیا جانے لگا اور ہر شہر کے داخلی و خارجی راستوں پر پولیس ناکے لگا دیے گئے تو کچھ حد تک خودکش حملوں اور بم دھماکوں پر قابو پا لیا گیا' عوام نے سکھ کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ کاروبار زندگی معمول پر آنے لگے۔

❁❁❁

ایم بی اے کے بعد عمر کو بھی اس کے باپ نے اپنے ساتھ ہی فیکٹری میں بطور مارکیٹنگ منیجر ذمہ داریاں سونپ دی تھیں' مگر ملک میں ہونے والے آئے روز کے دھماکوں نے ان کے کاروبار کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا' جس کی وجہ سے اسے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع نہیں مل سکا تھا' جب حالات کچھ بہتر ہونے لگے تو عرفان میاں نے اسے فیکٹری میں بننے والے پارٹس کی مارکیٹنگ کے لیے' کچھ سیمپل دے کر دوسرے شہر بھیج دیا۔

عمر ہاتھ میں پارٹس کے سیمپلوں سے بھرا بیگ لیے گھر سے نکلا تو بہت خوش تھا' وہ مارکیٹنگ کے لیے پہلی بار اپنے شہر سے باہر کہیں جا رہا تھا اس لیے عرفان میاں اسے بار بار ضروری ہدایات دے رہے تھے' تاکہ اسے کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے' گو کہ جن لوگوں کے پاس وہ جا رہا تھا' عرفان میاں نے انہیں پہلے سے ہی اطلاع کر دی تھی مگر پھر بھی وہ اسے بچوں کی طرح سمجھا رہے تھے' انہی کے کہنے پر عمر صبح جلدی ہی گھر سے نکل گیا تھا تاکہ واپسی پر زیادہ رات نہ ہو جائے۔

اسے پہلے سے معلوم تھا کہ کہاں کہاں اور کس کس کے پاس جانا ہے' اس لیے گاڑی سے اترتے ہی اس نے رکشہ لیا اور سیدھا اسپئیر پارٹس کی مارکیٹ میں جا پہنچا۔ وہاں وہ جس کسی کے پاس بھی گیا' وہ اسے یوں ملا جیسے پہلے سے ہی جانتا ہو۔ عمر کو اپنے پاپا پر فخر محسوس ہونے لگا تھا کہ انہوں نے کس طرح ایک ایک کو فون کر کے اس کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا' اسی لیے اسے اپنی بات سمجھانے میں کہیں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

وہ دن بھر ایک دکان سے نکل کر دوسری دکان پر جاتا رہا' کسی نے بھی اسے چائے پانی پلائے بغیر اپنے ہاں سے اٹھنے نہیں دیا تھا' اس کا خیال تھا کہ اب وہ جس دکان پر جا رہا ہے' وہاں سے فارغ ہوتے ہی وہ کہیں اچھی سی جگہ دیکھ کر سکون سے کھانا کھائے گا اور پھر کچھ دیر آرام کے بعد دوبارہ اپنے کام پر لگ جائے گا' مگر وہ جن کے پاس بیٹھا تھا انہوں نے نہ صرف ایک بڑا آرڈر دیا بلکہ زبردستی اسے اپنے ساتھ ہی کھانے پر بھی بٹھا لیا۔

عمر اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا' اس نے اپنے پاپا کی سوچ سے کہیں زیادہ آرڈرز لے لیے تھے' شام ڈھلنے لگی تھی' اس کا خیال تھا کہ وہ ایک دو جگہ اور جائے گا اور پھر واپسی کی راہ لے گا۔ وہ جس دکان پر بیٹھا تھا' اس کا مالک اس سے بہت اچھے موڈ میں بات کر رہا تھا' اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی' دکاندار نے فون اٹھایا تو بہت خوشگوار موڈ میں تھا' مگر دوسری جانب سے فون کرنے والے نے' نہ جانے ایسی کون سی بات سنا دی تھی کہ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

"سب ٹھیک تو ہے ناں؟" فون سننے کے بعد دکاندار کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر عمر نے دریافت کیا۔

"اس ملک میں سب ٹھیک کہاں ہو سکتا ہے....." دکاندار نے لمبی سانس لے کر چھوڑتے ہوئے کہا۔

دکاندار کی بات نے عمر کو مزید پریشان کر دیا تھا' مگر ابھی تک کوئی بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی' اس لیے بولا' "ہوا کیا ہے؟"

"ابھی ابھی امام بارگاہ میں دھماکہ ہوا ہے۔ کاروبار کیا خاک ہونا ہے۔" عمر کا سوال سن کر دکاندار نے جواب دیا اور پھر دراز میں سے ریموٹ نکال کر ٹیلی وژن لگا دیا۔

ٹیلی وژن پر اس جگہ کے دل ہلا دینے والے مناظر دکھائے جا رہے تھے جہاں کچھ ہی دیر قبل خودکش دھماکہ ہوا تھا' ہر طرف انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے اور جگہ جگہ خون ہی خون نظر آ رہا تھا' بہت سی ایمبولینسیں زخمیوں کو لے کر اسپتالوں کی طرف دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں' عمر پریشانی کے عالم میں تمام مناظر دیکھ رہا تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا' اس نے موبائل دیکھا تو اس کے پاپا کا فون تھا۔

"جی پاپا!"

"تم کہاں ہو؟"

"میں فی الحال تو مارکیٹ میں ہی ہوں۔"

"تم ٹھیک تو ہو ناں؟" عرفان میاں نے دھماکے کی خبر سنتے ہی بیٹے کی خیریت معلوم کی۔

"آپ پریشان نہ ہوں پاپا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"وہاں پر دھماکہ ہوا ہے..... تم بس جلدی سے نکل پڑو۔"

"جی پاپا! میں بھی ٹیلی وژن پر دیکھ رہا ہوں۔ ویسے آپ سب لوگ تو ٹھیک ہیں ناں؟"

"تم ہماری فکر نہ کرو' ہم سب ٹھیک ہیں۔ تمہاری ماما تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی ہے اس لیے اب تم بلا تاخیر وہاں سے چل پڑو۔"

"آپ پریشان نہ ہوں پاپا! میں ویسے بھی تھوڑی دیر میں یہاں سے نکلنے ہی والا تھا' آپ ماما کو تسلی دیں' میں ابھی نکل پڑتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! اللہ حافظ۔"

فون بند ہوتے ہی عمر نے اپنا بیگ اٹھالیا اور اٹھ کھڑا ہوا‘ فون سنتے ہوئے بھی اس کی نظر مسلسل ٹیلی وژن پر ہی لگی رہی تھی‘ وہی مناظر بار بار دکھائے جا رہے تھے‘ دکاندار بھی عمر کے اٹھنے کے انتظار میں تھا‘ اس کے نکلتے ہی اس نے بھی ملازم کو دکان بند کرنے کو کہہ دیا تھا۔ وہ دکان سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جہاں کچھ دیر پہلے تک گہما گہمی تھی‘ دھماکے کی خبر سنتے ہی وہاں سناٹا چھا گیا تھا‘ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں‘ جو اکا دکا کھلی بھی تھیں وہ بھی شٹر گرا رہے تھے۔

عمر اس شہر میں پہلی بار آیا تھا‘ ہر طرف خاموشی دیکھ کر اسے خوف آنے لگا تھا‘ اس کی نگاہیں کسی رکشہ‘ ٹیکسی کی تلاش میں تھیں مگر اسے کوئی رکشہ یا ٹیکسی دکھائی نہیں دے رہا تھا‘ وہ بس اسٹینڈ تک پہنچنے کے لیے کسی سواری کی تلاش میں ایک طرف کو چل پڑا‘ مارکیٹ سے نکل کر کچھ قدم چلنے کے بعد ہی وہ بڑی سڑک پر آ گیا تھا جہاں ٹریفک قدرے کم تھی مگر اسے رکشہ باآسانی مل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے سواری کی تلاش میں نہ جانے اور کتنی دیر تک ادھر اُدھر بھٹکنا پڑے گا‘ مگر جب وہ رکشے میں بیٹھ کر بس اسٹینڈ کی طرف چلا تو اس کی جان میں جان آئی۔

بس اسٹینڈ پر بھی سواریاں نہ ہونے کے برابر تھیں‘ لاہور جانے کے لیے گاڑی کھڑی تھی مگر اس میں چند سواریاں بیٹھی تھیں‘ عمر بھی ٹکٹ لے کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا‘ تھوڑی دیر بعد ایک ایک دو دو سواریاں آ کر گاڑی میں سوار ہو رہی تھیں‘ عمر کو گاڑی میں بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ ہونے کو تھا مگر ابھی تک گاڑی میں بہت سی سیٹیں خالی تھیں‘ گاڑی میں بیٹھی ہوئی سواریوں کے صبر کے پیمانے بھی لبریز ہونے لگے تھے اور وہ ہلکی ہلکی آواز میں احتجاج بھی کرنے لگے تھے‘ مگر گاڑی والوں پر کسی احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا اور وہ گاڑی کو سواریوں سے بھر کر ہی اسٹینڈ سے نکالنے کے موڈ میں تھے۔

جب سواریوں کا احتجاج بڑھنے لگا تو ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ ریس دینے لگا‘ ڈرائیور کے اس عمل سے سواریوں میں پیدا ہونے والی بے چینی قدرے کم ہو گئی تھی‘ خدا خدا کر کے گاڑی کی تمام سیٹیں پوری ہوئیں اور گاڑی اپنے سفر پر نکل پڑی۔

گاڑی نے ابھی تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اسے پولیس ناکے پر روک لیا گیا‘ گاڑی کے رکنے پر ایک پولیس اہلکار اندر آ گیا اور گاڑی میں بیٹھی ہوئی سواریوں کو بغور دیکھنے لگا‘ پھر اس نے چار سواریوں کو اپنے سامان سمیت نیچے اترنے کا حکم دیا اور خود بھی نیچے اتر گیا‘ جن سواریوں کو نیچے اترنے کا حکم ہوا تھا‘ ان میں عمر بھی شامل تھا۔

عمر نے اپنا بیگ لیا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا‘ اس کے ساتھ جن دیگر تین نوجوانوں کو اتارا گیا تھا‘ ان سب کی مکمل جسمانی تلاشی لی گئی اور ان کے سامان کا مکمل جائزہ لیا گیا‘ اس کارروائی میں کافی وقت لگ گیا تھا‘ جب ناکے پر کھڑے پولیس اہلکاروں کی اچھی طرح تسلی ہو گئی تو انہوں نے گاڑی سے اتاری جانے والی سواریوں کو گاڑی میں بیٹھنے اور گاڑی کو جانے کی اجازت دے دی۔

ایک بار پھر گاڑی چل پڑی اور سفر طے ہونے لگا مگر ابھی گاڑی نے اچھی طرح سپیڈ بھی نہیں پکڑی تھی کہ ایک بار پھر انہیں ایک اور پولیس ناکے پر روک لیا گیا۔ اس ناکے پر بھی وہی پچھلے ناکے جیسا ہی سلوک کیا گیا اور وہاں بھی عمر سمیت انہی سواریوں کو اتارا گیا تھا جنہیں پچھلے ناکے والوں نے اتارا تھا‘ وہی عمل پھر سے دہرایا گیا‘ اسی طرح ان کی جسمانی تلاشی لی گئی‘ سامان چیک کیا گیا اور پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔

گاڑی چند کلو میٹر اور آگے گئی ہو گی کہ ایک اور ناکے پر پھر انہی چار سواریوں کی‘ سامان سمیت مکمل تلاشی لی گئی‘ جن کی پچھلے دو ناکوں پر تلاشی لی گئی تھی۔

گاڑی چلی تو عمر کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا‘ وہ اس بات پر بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ بار بار بھری گاڑی میں سے صرف انہی چاروں کو ہی کیوں اتارا جا رہا تھا‘ ان کے علاوہ بھی سواریوں سے گاڑی بھری ہوئی تھی پھر ان چاروں کو ہی اتار کر تلاشی کیوں لی جا رہی تھی‘ آخر کار وہ جس نتیجے پر پہنچا وہ انتہائی تکلیف دہ اور ہلا دینے والا تھا‘ کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ گاڑی میں سے ہر ناکے پر ان چاروں کو بار بار صرف اس بناء پر اتارا جا رہا تھا کہ ان چاروں نے ہی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔

وہ اس معاملے پر دیر تک غور کرتا رہا‘ اس کا دل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا کہ ایک اسلامی ملک میں محض داڑھی رکھنے کی وجہ سے شک کی نظروں سے دیکھا جا رہا تھا‘ مگر اس کی اس بات کی تصدیق اگلے ہی ناکے پر ہو گئی جب پھر سے انہی چاروں کو گاڑی سے اتارا گیا‘ جن کے چہروں پر داڑھی تھی‘ ایک دو بار تو اتفاق ہو سکتا تھا مگر ہر ناکے پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا‘ پھر اس کا شک یقین میں بدلنے کے لیے کانوں میں پڑنے والی وہ آواز ہی کافی تھی‘ جب ایک پولیس اہلکار دوسرے سے کہہ رہا تھا ”جس شخص نے امام بارگاہ میں بم بلاسٹ کیا تھا اس کا خاکہ جاری کر دیا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی۔“

لاہور تک کا چند گھنٹوں کا سفر بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا‘ ادھر عمر کے والدین اور بھائی الگ پریشان ہو رہے تھے اور بار بار موبائل پر فون کر کے اس کی خیریت کی خبر لے رہے تھے‘ ان کی ہر فون کال پر وہ انہیں تسلی دے دیتا کہ دھماکوں کی وجہ سے راستے میں جگہ جگہ پولیس کے ناکے لگے ہوئے ہیں جہاں تلاشی کے لیے بار بار رکنے کی وجہ سے انہیں دیر ہو رہی ہے۔

عمر کے ساتھ جن تین نوجوانوں کو ہر ناکے پر اتار کر جس طرح تلاشی لی جا رہی تھی اس کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھی دیگر سواریاں بھی انہیں شک کی نظر سے دیکھنے لگی تھیں اور سوچنے لگی تھیں کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے‘ جس کی وجہ سے انہیں بھی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا اور دوسری سواریوں کے ساتھ عمر بھی یادگار پاکستان کے سامنے گاڑی سے اتر گیا۔ لاہور کی حدود میں داخل ہوتے ہی عمر نے اپنے لاہور پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی‘ عمر کے پاپا چاہتے تھے کہ وہ عمر کے چھوٹے بھائی علی کو اسے لانے کے لیے بھیج دیں تاکہ اسے مزید کوئی پریشانی نہ ہو‘ مگر عمر اس کے لیے تیار نہ ہوا اور کہا کہ وہ خود ہی کوئی رکشہ ٹیکسی لے کر گھر پہنچ جائے گا۔

گاڑی سے اترتے ہی سب لوگ رکشوں‘ ویگنوں اور کاروں میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے‘ عمر بھی اپنا بیگ ہاتھ میں لیے کسی سواری کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگا‘ وہ تینوں نوجوان جنہیں راستے میں عمر کے ساتھ بار بار اتارا جاتا رہا تھا‘ عمر کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تینوں ہی گاڑی میں پاس پاس ہی بیٹھے تھے اس لیے آپس میں باتیں کرتے رہے تھے‘ عمر چونکہ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اس لیے راستے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہو پائی تھی‘ یوں بھی وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے‘ آپس میں کیا بات کرتے۔

ان میں سے ایک نوجوان نے اپنا دایاں ہاتھ عمر کی طرف بڑھا دیا اور بولا ”السلام علیکم ! مجھے ظفر کہتے ہیں۔“

”وعلیکم السلام ! عمر۔“ عمر نے ظفر کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور اپنا تعارف کروایا۔

ابھی تک دوسرے دونوں نوجوان ایک طرف کھڑے تھے‘ عمر اور ظفر کا آپس میں تعارف ہوا تو وہ بھی قریب آ گئے اور عمر سے ہاتھ ملایا‘ ان میں سے ایک کا نام خالد اور دوسرے کا نام قاسم تھا۔

”راستے میں کس قدر پریشان کیا پولیس نے؟“ ظفر نے عمر سے بات کی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ عمر کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی‘ اس لیے اس نے ظفر کی بات کا مختصر جواب دیا۔

”تم نے ایک بات نوٹ کی کہ ہر جگہ مسافروں سے بھری گاڑی میں سے بار بار صرف ہم چاروں کو ہی اتارا جاتا رہا۔“

”میں نے تو اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔“

”میں بتا دیتا ہوں تمہیں..... وہ اس لیے کہ گاڑی میں بیٹھی چالیس پینتالیس سواریوں میں سے صرف ہم چار ہی ایسے تھے جنہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی اور اس داڑھی کی وجہ سے ہی بار بار ہماری تلاشی لی جا رہی تھی۔“ ظفر نے بات کی‘ اب تک عمر سے وہی بات کر رہا تھا جبکہ خالد اور قاسم خاموش کھڑے تھے۔

”یہ محض اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔“ عمر نے انہیں ٹالنے کے لیے بات کی‘ جبکہ راستے میں ہی ذرا سے غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ انہیں گاڑی سے بار بار اتارے جانے کا اصل سبب ان کے چہروں پر رکھی جانے والی داڑھی ہی تھی۔

”ایسے اتفاق بار بار نہیں ہوا کرتے۔“

”ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا..... وہ لوگ اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے اور انہیں جو بہتر طریقہ دکھائی دے رہا تھا وہ کر رہے تھے۔“ عمر نے بات کی اور اس ڈر سے کہ اب وہ کوئی مزید بات نہ کر دے فوراً بولا ”میرا خیال ہے اس معاملے میں ہمیں اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیے۔ رات کافی ہو چکی ہے ہمیں جلدی سے اپنے اپنے گھر پہنچنا چاہیے۔“

عمر کا خیال تھا کہ اس کے اس جواب سے وہ کوئی مزید بات نہیں کرے گا مگر وہ فوراً بول پڑا..... ”جانا کہاں ہے تم نے؟“

ظفر کا یہ سوال عمر کو اچھا نہیں لگا تھا‘ مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بتایا ”مجھے ماڈل ٹاؤن جانا ہے۔“

”اور ہم نے کلمہ چوک تک جانا ہے۔ ایک ہی گاڑی کروا لیتے ہیں‘ ہم کلمہ چوک اتر جائیں گے اور تم آگے ماڈل ٹاؤن چلے جانا۔“

ظفر کی بات سن کر عمر کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی مگر چہرے پر اب بھی وہی مسکراہٹ سجی تھی‘ عجیب چیکو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو کسی بھی طرح جان چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے‘ ان کے بعد بھی کئی گاڑیاں وہاں آ کر رکی تھیں اور ان سے اترنے والے مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے مگر وہ اب تک دل پر جبر کیے وہیں کھڑا تھا‘ آخر کار اس نے دوٹوک لہجے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بولا ”تم لوگوں کو جیسے جانا ہے چلے جاؤ‘ میں خود ہی رکشہ لے کر چلا جاؤں گا۔“ عمر نے بات کی اور پھر ان کا جواب سنے بغیر وہاں کھڑے ایک رکشے والے سے ماڈل ٹاؤن جانے کے لیے بات کرنے لگا۔

رکشے والے نے ماڈل ٹاؤن جانے کے زیادہ پیسے مانگے تھے مگر عمر نے اس سے کوئی بحث نہ کی اور

خاموشی سے رکشے میں بیٹھ گیا‘ رکشہ چلا تو اس نے سکھ کا سانس لیا اور اپنا موبائل نکال کر علی کا نمبر ملانے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے پاپا کا نمبر نہیں ملایا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک سو چکے ہوں گے اور انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں تھا۔ علی نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا اور بولا ”عمر تم ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے؟“

”بس ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں‘ رکشے میں بیٹھا ہوں‘ دروازے پر پہنچ کر تمہیں مس کال کر دوں گا تم دروازہ کھول دینا تاکہ ماما‘ پاپا کی نیند خراب نہ ہو۔“

”ابھی وہ سوئے کہاں ہیں..... تمہارے انتظار میں پریشان بیٹھے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم انہیں بتا دو..... فکر نہ کریں بس میں تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچ رہا ہوں۔“

رات کافی بیت چکی تھی‘ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی اس لیے رکشے والا اسے اڑاتا ہوا لے جا رہا تھا‘ جس سپیڈ سے رکشے والا رکشہ چلا رہا تھا‘ اسے دیکھ کر عمر کو امید تھی کہ اگلے چند منٹ میں وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہو گا مگر اس کی امید پر اس وقت پانی پھر گیا جب اسے ایک پولیس ناکے پر روک لیا گیا‘ ناکے پر کھڑے پولیس والے کا اشارہ پاتے ہی رکشے والے نے فوراً رکشہ روک دیا۔

رکشہ رکتے ہی ایک سپاہی ہاتھ میں ٹارچ لیے ان کے پاس آ گیا‘ ٹارچ کی روشنی عمر کے چہرے پر پڑی تو سپاہی نے اسے رکشے سے نیچے اترنے کو کہہ دیا‘ سپاہی کے کہنے پر وہ رکشے سے باہر نکل آیا‘ عمر کے رکشے سے اترتے ہی سپاہی اس کی تلاشی لینے لگا اور بولا ”اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟“

سپاہی نے سیدھا سا سوال کیا تھا مگر عمر ایک ہی دن میں پولیس کے سپاہیوں کو اتنی بار اپنی جسمانی تلاشی دے چکا تھا کہ اسے سپاہی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کسی خنجر کی طرح سیدھے دل پر لگے اور وہ تلخ لہجے میں بولا ”تمہیں اس سے مطلب؟ میں کہیں سے بھی آ رہا ہوں تم اپنا کام کرو‘ تلاشی لو اور جان چھوڑو۔“

کسی پولیس والے کو اس قسم کی بدتمیزی کہاں ہضم ہوتی ہے‘ عمر کی بات نے سپاہی کی آنکھوں میں شعلے بھر دیے تھے اور وہ منہ سے انگارے برسانے لگا تھا ”اتنی آسانی سے تو اب میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔ تم نے قانون کو مذاق سمجھ رکھا ہے؟ لیکن قانون سے پنگا لینے کا مطلب تم شاید نہیں جانتے‘ ایک بار ہمارے شکنجے میں آ گئے ناں‘ تو ساری تیزیاں ختم ہو جائیں گی۔“

انہیں الجھتا دیکھ کر ناکے پر کھڑا اے ایس آئی بھی ان کے پاس آ گیا اور سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کیا بات ہے اشفاق؟“

”او سر جی یہ باؤ کچھ زیادہ ہی تیکھا ہے۔“

”کیا کہتا ہے باؤ؟“

”سر جی میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟ مگر یہ الٹا ہی جواب دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں جہاں کہیں سے بھی آ رہا ہوں..... تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔“

”اوئے داڑھیوں والے ہوتے ہی بڑے تیز ہیں..... تم اس کے سامان کی بھی اچھی طرح تلاشی لو کیا پتا کہیں واردات ہی ڈال کر آ رہا ہو۔“

اے ایس آئی کی بات نے عمر کو ہلا کر رکھ دیا تھا‘ وہ چیخا ”جس طرح چاہے تسلی کرو‘ مگر داڑھی کے متعلق کچھ مت کہو۔“

”زیادہ چیخو مت..... مجھے معلوم ہے تم جیسے داڑھی والے چہروں کے پیچھے کتنے مکروہ چہرے چھپے ہوتے ہیں۔“

عمر کچھ بولنا چاہتا تھا کہ اچانک کسی گاڑی کی تیز لائیٹس اس کے چہرے پر پڑیں' کوئی ٹیکسی ان کے پاس آکر رکی تھی' گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند ہوئیں تو اس نے دیکھا' ظفر' خالد اور قاسم ٹیکسی میں سے نکل رہے تھے' عمر کے علاوہ اے ایس آئی اور سپاہی بھی انہی کو آتا دیکھنے لگے تھے۔

"کیا بات ہے عمر! سب ٹھیک تو ہے ناں؟ تم تو ہم سے کچھ دیر پہلے وہاں سے چلے تھے۔" ظفر نے قریب آتے ہی سوال کیا۔

ان تینوں سے عمر کا کوئی خاص تعلق یا رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی ان کے آنے سے اسے حوصلہ ملا تھا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ ظفر کی بات کا کوئی جواب دیتا' اے ایس آئی بول پڑا۔ "لو بھئی اشفاق' مولوی کے حمائتی بھی آگئے ہیں۔"

"سر جی! مجھے تو یہ سارے ہی دہشت گرد لگ رہے ہیں۔" سپاہی نے اپنے افسر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اے ایس آئی اور سپاہی نے اس قدر طنزیہ انداز میں بات کی تھی کہ عمر بھڑک اٹھا "تمیز سے بات کریں..... ہم کوئی للو پنجو نہیں ہیں' پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے گھروں سے ہیں۔"

"اب اور زیادہ بک بک کی تو تمہاری یہ داڑھی کھینچ کر تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔" اے ایس آئی نے عمر کی داڑھی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔

اے ایس آئی کا عمر کی داڑھی کو غصے میں ہاتھ لگانا تھا کہ ظفر' خالد اور قاسم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اے ایس آئی پر جھپٹ پڑے۔ قاسم نے اسے گریبان سے پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر عمر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ انہیں دست و گریباں ہوتے دیکھ کر ناکے پر کھڑے دیگر پولیس اہلکار بھی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے دوڑے چلے آئے اور ان چاروں کو حراست میں لے لیا گیا۔

وہ انہیں تھانے لے جانے لگے تو عمر منت سماجت کرنے لگا جبکہ ظفر' خالد اور قاسم خود کو حق پر سمجھ رہے تھے' اس لیے انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی' یوں بھی جس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے وہ پولیس والوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے یا ان کے پاؤں پڑتے' اس کا کوئی اثر ہونے والا نہیں تھا۔ انہیں تھانے لے جایا گیا اور ان کی جیبوں سے نقدی' موبائل فون اور دیگر کاغذات وغیرہ اپنے قبضے میں لے کر لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ تھانے جاتے ہوئے راستے میں پولیس والوں کی نظروں سے بچ کر خالد نے انتہائی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے گھر والوں کو اپنے پکڑے جانے اور تھانے لے جانے کی خبر دے دی تھی جبکہ کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر پایا تھا۔

❁❁❁

عمر کے گھر نہ پہنچنے پر اس کے اہل خانہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی' وہ کچھ دیر تک اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ عمر کسی بھی لمحے پہنچ جائے گا' لیکن جب کافی دیر گزر گئی اور عمر گھر نہ پہنچا تو وہ عمر سے رابطہ کرنے کے لیے اس کے موبائل فون کا نمبر ملانے لگے' مگر تب تک اس کا موبائل فون پولیس والوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا' موبائل فون ملانے پر بیل ہوتی تھی مگر موبائل فون الماری میں پڑا ہونے کی وجہ سے اٹینڈ نہیں کیا جا رہا تھا' جس کی وجہ سے ان کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

عرفان میاں اور علی' عمر کے نہ آنے پر بہت پریشان تھے' جبکہ عمر کی ماما نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان سب کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خیالات جنم لینے لگے تھے' وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد عمر کے موبائل نمبر پر فون کرنے لگتے مگر اس طرف سے کوئی جواب نہ پا کر خاموش ہو کر بیٹھ جاتے۔

ماما آنسو بہاتے ہوئے دیر تک انہیں خاموشی سے بیٹھی دیکھتی رہی' جب اس کے صبر کے سبھی پیمانے لبریز ہو گئے تو وہ چیخ پڑی "باپ بیٹا دونوں کس اطلاع کے آنے کے انتظار میں بیٹھے ہو؟ اگر اس کا فون نہیں مل رہا تو کہیں باہر نکل کر دیکھتے کیوں نہیں؟"

"اس وقت کہاں جائیں؟ فون پر بھی بیل تو ہوتی ہے' مگر وہ اٹینڈ نہیں کر رہا۔"

"جب تک وہ فون نہیں اٹھائے گا تو کیا تب تک تم دونوں یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے گھر میں بیٹھے رہو گے؟"

"رات کے دو بج رہے ہیں' اس وقت کہاں جائیں؟" عرفان میاں نے بے بسی کے عالم میں بات کی۔

"جہاں چاہے جاؤ' مگر اسی وقت میرا بیٹا ڈھونڈ کر لاؤ۔" ماں نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"پاپا! ایسا کرتے ہیں' قریب قریب کے ہسپتالوں میں جا کر چیک کر لیتے ہیں..... خدانخواستہ بھائی کے ساتھ کوئی حادثہ ہی پیش نہ آ گیا ہو۔" ماما کی حالت دیکھ کر علی نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا۔

علی کی بات سن کر عرفان میاں نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولے "چلو یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

"چلیں پاپا پھر اور دیر نہ کریں' پہلے ہی عمر کے انتظار میں ہم نے بہت دیر کر دی ہے۔"

علی کی بات سنتے ہی عرفان میاں اٹھ کھڑے ہوئے' علی نے بھی جلدی سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر کی طرف چل پڑا۔ انہیں جاتے دیکھ کر ماما بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

ماما کی بات سن کر عرفان میاں سمجھانے کے انداز میں پیار سے بولے "تم ہمارے ساتھ جا کر کیا کرو گی؟"

"گھر میں بیٹھ کر بھی کیا کروں گی؟"

"تم گھر میں بیٹھ کر عمر کی خیریت کے لیے دعا کرو۔"

"دعا تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی کی جا سکتی ہے۔"

ماما کی بات سن کر عرفان میاں جان گئے تھے کہ اب وہ کسی بھی طرح ٹلنے والی نہیں ہے اس لیے بولے "ٹھیک ہے' سرونٹ کوارٹر میں سے اخلاق اور اس کی بیوی کو بلا لو تا کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھ سکیں۔"

خاوند کی بات سنتے ہی ماما نے جلدی سے اخلاق اور اس کی بیوی پروین کو بلانے کے لیے سرونٹ کوارٹر میں بجنے والی بیل کا بٹن اوپر تلے دو تین بار دبا دیا' اگلے ہی لمحے اخلاق آنکھیں ملتا ہوا حاضر ہو گیا' ابھی وہ آ کر رکا ہی تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے پروین بھی آ گئی' اتنی رات گئے ان کو بلایا جانا خطرے سے خالی نہیں تھا' اس لیے وہ دونوں گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے' وہاں آتے ہی انہیں ماما آنکھوں میں آنسو لیے جبکہ عرفان میاں اور علی اترے ہوئے چہروں کے ساتھ کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے دکھائی دیے تو ان کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

"صاحب جی! سب خیر تو ہے ناں؟" اخلاق نے پریشانی کے عالم میں عرفان میاں سے دریافت کیا۔

"عمر ابھی تک گھر نہیں پہنچا' ہم اس کے بارے میں جاننے کے لیے جا رہے ہیں' تم گیٹ بند کر لینا۔"

عرفان میاں کے جواب سے اخلاق کی تسلی نہیں ہوئی تھی اس لیے بولا ”آپ عمر کے موبائل پہ فون کر کے پوچھ لیں کہ وہ کہاں ہے۔“

”کئی بار فون کیا ہے مگر وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا‘ ہم جا رہے ہیں‘ تم لوگ بھی دعا کرنا کہ وہ خیریت سے گھر واپس آئے۔“

”آمین!“ اخلاق اور پروین نے ایک ساتھ کہا۔

عرفان میاں‘ ماما اور علی گھر سے روانہ ہونے لگے تو اخلاق اور پروین بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیے‘ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو اخلاق نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ علی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا‘ عرفان میاں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے تھے جبکہ ماما نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر خود کو گرا دیا تھا۔

وہ آبادی سے نکل کر ماڈل ٹاؤن موڑ سے ہوتے ہوئے فیروز پور روڈ پر نکل آئے تھے‘ وہ سڑک‘ جہاں دن کے وقت کلمہ چوک کا اشارہ بند ہوتے ہی گاڑیوں‘ بسوں‘ ویگنوں‘ رکشوں‘ اور موٹر سائیکلوں کی لمبی قطاریں لگ جاتی تھیں‘ ویران و سنسان دکھائی دے رہی تھی‘ گھر سے نکلنے سے اب تک وہ تینوں ہی خاموش تھے مگر ان کی نگاہیں عمر کو تلاش کر رہی تھیں۔

”پہلے کس طرف چلیں پاپا؟“ علی کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

علی کی بات سن کر عرفان میاں کچھ سوچنے لگے‘ پھر بولے۔ ”جب آخری بار عمر سے تمہاری بات ہوئی تھی‘ تو اس نے کیا کہا تھا؟“

”اس کی بات سے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا‘ جیسے وہ یہیں کہیں قریب ہی تھا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچ رہا ہے۔“

”ہوں..... تو تم ایسا کرو پہلے مسلم ٹاؤن موڑ کی طرف چلو‘ وہاں نہر کے پل پہ ہی ریسکیو 1122 والوں کا آفس ہے‘ خدانہ کرے اگر کوئی حادثہ ہوا ہوگا تو ان سے انفارمیشن مل جائے گی۔“

باپ کی بات سنتے ہوئے علی نے گاڑی کی سپیڈ انتہائی کم کی ہوئی تھی‘ جب بات مکمل ہوئی تو اس نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی اور نہر پہ پہنچنے کے بعد یوٹرن لے کر ریسکیو 1122 کے دفتر کے سامنے گاڑی روک دی‘ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں وہاں آئے تھے‘ وہاں ڈیوٹی پر موجود عملے نے ان سے بھرپور تعاون کیا اور انہیں اپنے رجسٹر میں سے دیکھ کر بتایا کہ پچھلے کچھ گھنٹوں سے اب تک فیروز پور روڈ پر ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا جس کی اطلاع انہیں دی گئی ہو۔

ریسکیو 1122 کے ہاں سے انہیں اس بات کی خبر مل گئی تھی کہ شام کے بعد سے فیروز پور روڈ پر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا مگر اس کے باوجود ماں کی مامتا کو تسلی ہوئی تھی نہ باپ کے بے قرار دل کو قرار آیا تھا‘ اس لیے وہاں سے نکل کر وہ لبرٹی چوک کے قریب واقع یوسی ایچ چلے گئے‘ مگر انہیں وہاں سے بھی مایوس لوٹنا پڑا‘ پھر انہوں نے جناح ہسپتال کا رخ کیا‘ وہاں بھی انہوں نے ایمرجنسی سے معلومات حاصل کرنے کے علاوہ‘ ایمرجنسی وارڈ میں ایک ایک بیڈ پہ جا کر عمر کو تلاش کیا‘ مگر وہ وہاں بھی نہ تھا۔

جناح اسپتال کے بعد اب اتفاق اور جنرل ہسپتال میں جانا باقی رہ گیا تھا‘ ان کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے ان کی غیر موجودگی میں عمر گھر پہنچ گیا ہو‘ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہاں جانے سے پہلے گھر فون کر کے تسلی کر لی جائے۔ علی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے عرفان میاں نے اس امید پر گھر کا نمبر ملایا کہ شاید کوئی اچھی خبر مل جائے۔ اخلاق اور پروین اس گھر کے پرانے ملازم تھے‘ پریشانی کے عالم میں وہ بھی ٹیلی فون کے پاس ہی اس آس پر بیٹھے مسلسل جاگ رہے تھے کہ نہ جانے کب ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھے اور عمر کی کوئی اطلاع مل جائے‘ فون کی پہلی ہی گھنٹی پر اخلاق نے فون اٹھا لیا تھا اور عرفان میاں کے پوچھنے پر عمر کے گھر نہ پہنچنے کی خبر دے دی۔

گھر فون کرنے سے قبل دل میں امید کی جو کرن پھوٹی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی‘ اس لیے انہوں نے گاڑی کا رخ پہلے اتفاق پھر جنرل ہسپتال کی طرف کر دیا‘ مگر پہلے کی طرح وہاں سے بھی عمر کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا‘ اس لیے مایوس ہو کر وہ واپس گھر کی طرف چل پڑے‘ وہ گھر پہنچے تو مسجدوں میں فجر کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ رات پریشانی کے عالم میں جاگتے اور عمر کی تلاش میں مختلف ہسپتالوں کے چکر کاٹتے ہوئے کٹ گئی تھی مگر انہیں عمر کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

❁❁❁

ان چاروں کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر پولیس اہلکار خود سکھ کی نیند جا سوئے تھے۔ وہ تھانے کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا‘ جس میں وہ چاروں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے‘ عمر‘ ان کے اس رویے سے ناخوش تھا‘ جس کی وجہ سے ان کے ساتھ اسے بھی جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی‘ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ وہاں نہ آتے تو شاید نوبت تھانے تک نہ پہنچتی۔

لاک اپ میں بند ہونے کے بعد کچھ دیر تک عمر خاموش بیٹھا رہا پھر منہ سے زہر اگلنے لگا ”تمہیں ضرورت کیا تھی میرے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی‘ نہ کوئی جان نہ پہچان‘ چلے آئے حمائتی بن کر لڑنے۔“

”ہم نے جو کچھ بھی کیا‘ ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں اور رہ گئی بات جان پہچان کی‘ تو اب کر لیتے ہیں۔“ ان تینوں نے اس کی بات کا برا منانے کی بجائے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم کس قسم کے لوگ ہو‘ اپنی بیوقوفی پر شرمندہ ہونے کی بجائے مسکرا رہے ہو۔“

”ہم اسٹوڈنٹ ہیں پیارے بھائی‘ ہم سے کوئی بھی غلط بات برداشت نہیں ہوتی اور جہاں مذہب کی بات آجائے‘ وہاں تو ہم چپ رہ ہی نہیں سکتے۔“

ان کے جواب نے عمر کے تن بدن میں چنگاریاں بھر دی تھیں‘ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس نے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہ کیا اور خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ان چاروں کی رات بے سکونی کی نذر ہو گئی تھی‘ صبح ہوئی تو تھانیدار کے آنے پر اسے ان چاروں کے بارے میں اطلاع کر دی گئی‘ تھانیدار نے ان چاروں کو ہی اپنے کمرے میں بلا لیا اور رات کو ہونے والے واقعے کی تفصیلات معلوم کیں باتوں کے دوران مختلف سوالات کرتے ہوئے تھانیدار ان کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا رہا‘ پھر انہیں واپس لاک اپ میں بھیج دیا۔

ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد تھانیدار نے اے ایس آئی کو بلا لیا اور پوچھا۔ ”ان چاروں کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“

”وہ دہشت گرد ہیں جناب!“

”نہیں..... دہشت گرد نہیں..... جذباتی ہیں۔“ تھانیدار نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

”آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

”میں نے دنیا دیکھی ہے‘ دہشت گرد اور جذباتی پن کے فرق کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”پھر ان کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟“

”میں تو کہتا ہوں‘ ان کے ساتھ کافی ہو گئی ہے رات بھر لاک اپ میں بند بھی رہے ہیں‘ اب انہیں چھوڑ دینا چاہیے۔“

"لیکن سر! میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا' انہوں نے مجھ پر نہیں قانون پر ہاتھ اٹھایا ہے' اور ایسے لوگ کسی بھی رعایت کے حقدار نہیں ہوتے۔"

"تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے' لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس بات کو بڑھانے کی بجائے انہیں چھوڑ دینے میں ہی بہتری ہے' ویسے بھی دن چڑھ آیا ہے ان کے گھر والے انہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے' اور پھر کہیں نہ کہیں سے ان کے لیے سفارشیں آنے لگیں گی' پھر بھی تو ہمیں ان کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ کے کہنے پر میں انہیں چھوڑ دیتا ہوں لیکن ایک بات آپ کو میری بھی ماننی پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"انہیں چھوڑنے سے پہلے ان چاروں کی داڑھی' مونچھیں اور سر کے بال منڈوانے کی اجازت دینی ہو گی مجھے۔"

"تم اس معاملے میں مجھے نہ ہی گھسیٹو تو بہتر ہے۔ اپنے طور پر تم جیسا کرنا چاہتے ہو وہ کرو' مگر انہیں یہاں سے نکال دو اور یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تمہارے اس فیصلے میں' میں تمہارے ساتھ نہیں۔"

تھانیدار کی بات سن کر اے ایس آئی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا' جہاں کچھ اجنبی لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے تھے' انہیں دیکھتے ہی اے ایس آئی نے انتہائی احترام سے سوال کیا "جی فرمایئے۔"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بچے رات سے آپ کے لاک اپ میں بند ہیں۔ ہم انہیں کے لیے آئے تھے۔" اے ایس آئی کے سامنے بیٹھے ہوئے معززین میں سے ایک نے اپنا مدعا بیان کیا۔

اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی بات سن کر اے ایس آئی کو اپنے دل میں تھانیدار کے تجربے کی داد دینا پڑی' وہ کچھ دیر کے لیے کسی سوچ میں پڑ گیا پھر چہرے پر مسکراہٹ سجا کر جھوٹ بولنے لگا "وہ رات بھر یہاں ضرور تھے مگر اب سے تھوڑی دیر پہلے ہم نے انہیں بے قصور جان کر چھوڑ دیا۔ اب تک تو وہ اپنے اپنے گھروں میں پہنچ چکے ہوں گے۔"

اے ایس آئی کے منہ سے اپنے بچوں کی رہائی کا سن کر آنے والے معززین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔

ان لوگوں کے جاتے ہی اے ایس آئی تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا اور ایک سپاہی کے ذریعے نائی کو بلوا کر زبردستی ان چاروں کی داڑھی' مونچھیں اور سر کے بال صاف کروا دیے۔ اس دوران وہ چاروں چیختے چلاتے اور پولیس کو برا بھلا کہتے رہے مگر کسی پر کوئی اثر نہ ہوا' اے ایس آئی اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا' اس کے دل کی تمنا پوری ہو گئی تھی' اس لیے اس نے ان چاروں کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔

❁❁❁

رات بھر جاگتے رہنے سے عمر کے پاپا اور بھائی کی صوفوں پر بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی تھی' اخلاق اور پروین بھی وہیں قالین پر ہی سو گئے تھے' مگر ماں فجر کی نماز کے بعد سے اب تک جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھا کر ربّ سے بیٹے کی بخیریت واپسی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔

دروازے پر بیل ہوئی تو سب نے آنکھیں کھول دیں اور تیزی سے باہر کی طرف دوڑ پڑے' ماما ان سب سے پیچھے تھی اور اس کے منہ سے "یا اللہ خیر..... یا اللہ خیر۔" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دروازہ کھلا تو سامنے عمر کھڑا تھا' مگر عرفان میاں اور علی' پہلی نظر میں اسے پہچان نہ سکے' عمر آگے بڑھا اور اپنے پاپا اور

بھائی کے گلے لگ کر بلک پڑا' اسے روتا دیکھ کر عرفان میاں اور علی بھی رونے لگے تھے' ماما بھی بیٹے کو سینے سے لگا کر خوب روئی' پاس کھڑے دونوں ملازم بھی ایک طرف کھڑے آنسو بہا رہے تھے۔

وہ بھی' کچھ دیر تک وہیں کھڑے روتے رہے پھر اپنے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ وہاں آتے ہی ماما نے کہا۔ "میں پہلے شکرانے کے نفل پڑھ آؤں پھر بیٹھ کر بات کرتی ہوں۔"

"تم رات بھر کہاں رہے.....؟ اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟" ماما کے جاتے ہی عرفان میاں نے عمر سے دریافت کیا۔

باپ کی بات سن کر عمر ایک بار پھر بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں' آخر معاملہ کیا ہے؟" عرفان میاں سے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اور وہ حقائق جاننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

باپ کے کہنے پر عمر نے ہمت کی اور شروع سے آخر تک اپنی تمام تر روداد بیان کرنے لگا' اس دوران ماما بھی نوافل سے فارغ ہو کر واپس وہاں آ بیٹھی تھی اور بیٹے کی باتیں سن کر مسلسل آنسو بہائے جا رہی تھی۔

عمر کی بات سن کر عرفان میاں توبہ توبہ کر اٹھے اور بولے۔ "اس طرح کا سلوک تو مسلمانوں سے غیر مذہب کے لوگ بھی نہیں کرتے' میں جب امریکا میں تھا تو نائن الیون کے واقعے کے بعد وہاں رہنے والے مسلمان محض ڈر اور خوف کے مارے خود اپنی داڑھیاں صاف کرنے لگے تھے مگر کسی نے بھی انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں' میں نے امریکا چھوڑ کر یہاں آنا گوارا کر لیا لیکن الحمدللہ اپنے چہرے سے سنت نبوی کو ختم نہیں کیا..... آج اس پولیس والے نے جو حرکت کی ہے' میں اس کی رپورٹ اوپر تک کروں گا۔"

"جانے دیں پاپا! جو ہونا تھا وہ ہو گیا' اسلام ہمیں بدلے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی درگزر اور معاف کر دینے کا درس دیتا ہے' آپ بھی کول ڈاؤن ہو جائیں پلیز۔"

"ایسے لوگوں کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔"

"جزا و سزا کا کام اوپر والے کے اختیار میں ہے پاپا! ہم کون ہوتے ہیں اس طرح کے فیصلے کرنے والے۔"

عمر کی باتیں سن کر عرفان میاں کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے' انہوں نے ٹشو سے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور بولے "تمہاری باتیں سن کر آج مجھے اس بات پر فخر محسوس ہونے لگا ہے کہ میں نے تم لوگوں کو ہمیشہ سے جو رزقِ حلال کما کر کھلایا تھا اس کا اثر تمہارے خون میں دوڑ رہا ہے' جو لفظوں کی شکل میں تمہارے منہ سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔"

"تھینک یو پاپا! آپ بھی اس کائنات کے سب سے پیارے پاپا ہیں۔"

"تھینک یو بیٹا جی۔"

"یو آر ویلکم پاپا! آپ سب لوگ بھی رات بھر میری وجہ سے بے آرام رہے ہوں گے..... اب میں آ گیا ہوں ناں..... بس اب آپ سب آرام کریں۔"

عمر نے بات کی تو ماما فوراً بول پڑی "نہیں ابھی نہیں۔ رات سے کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ بس آپ لوگ منہ ہاتھ دھو لیں' میں پانچ منٹ میں ناشتہ لگواتی ہوں۔ ناشتے کے بعد جب تک چاہیں سکون سے سوئیں۔"

سب نے ماما کی بات کی تائید کی اور اپنے اپنے واش روم میں گھس گئے' ان کے واپس آنے تک ٹیبل پر ناشتہ رکھا جا چکا تھا' سب نے مل کر ناشتہ کیا اور پھر

لمبی تان کر سو گئے۔

✿✿✿

عمر نے اپنی ٹنڈ کو چھپانے کے لیے سر پہ ٹوپی رکھ لی تھی اور گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا تا کہ اسے کسی قسم کے سوالوں اور شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چند ہی دنوں میں پھر سے اس کے چہرے پر پہلے ہی کی طرح داڑھی بھی اگ آئی تھی اور وہ اپنے معمولات زندگی ادا کرنے لگا تھا۔

عرفان میاں، عمر اور علی فیکٹری جانے کے لیے تیار کھڑے تھے، عرفان میاں نے اپنی عادت کے مطابق فیکٹری جانے سے پہلے خبریں سننے کے لیے ٹی وی لگا رکھا تھا انہوں نے ٹی وی بند کرنے کے لیے ریموٹ ہاتھ میں پکڑا ہی تھا کہ انہیں یکے بعد دیگرے دو زوردار دھماکوں کی آواز سنائی دی، دھماکوں کی شدت سے گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بھی ہلنے لگے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دھماکے ان کے قریب ہی کہیں ہوئے تھے، دھماکوں کی آواز سے ڈر کر ماما اور پروین بھی کچن سے نکل کر ان کے پاس ہی آ کھڑی ہوئی تھیں۔

عرفان میاں، عمر اور علی فوراً ہی ایک دوسرے کے پیچھے گھر سے باہر نکل آئے تا کہ دھماکے کے متعلق کچھ جان سکیں، ان کے باہر آنے سے پہلے ہی آس پاس کے گھروں سے نکل کر بہت سے لوگ گلی میں آ کھڑے ہوئے تھے، ہر کوئی پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے سے دھماکوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر ابھی تک کسی کو بھی صحیح صورت حال کے بارے میں علم نہیں تھا، پھر ایک ایک کر کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں واپس جانے لگے تا کہ وہ ٹی وی کے ذریعے دھماکوں کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں۔

وہ تینوں واپس ٹی وی لاؤنج میں آ کھڑے ہوئے تھے، ابھی وہ پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ٹیلی وژن پر بریکنگ نیوز فلیش ہونے لگیں، عرفان میاں یہ جاننے کے لیے کہ بریکنگ نیوز کیا ہیں، ریموٹ ہاتھ میں لیے صوفے پر بیٹھ گئے، عمر اور علی بھی ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور ان سب کی نظریں ٹیلی وژن کی اسکرین پر لگی ہوئی تھیں، ٹیلی وژن پر سب سے پہلے جو اطلاع دی گئی تھی اس کے مطابق لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں زوردار دھماکوں کی آوازیں سنائی دی تھیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ یہ دھماکے کس نوعیت کے تھے۔

عرفان میاں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید کوئی دوسرا نیوز چینل دھماکوں کے متعلق اس سے آگے کی کوئی خبر دے رہا ہو کئی دوسرے نیوز چینل لگا کر دیکھے مگر سب پر ایک جیسی ہی خبر چل رہی تھی، پھر کچھ ہی دیر بعد ٹیلی وژن اسکرین پر دھماکوں کے بارے میں تفصیلات دکھائی جانے لگیں، خبروں کے مطابق دہشت گردوں نے لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں تھانے کی عمارت میں دو بم پھینکے تھے، جس سے تھانے کی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی اور بڑی تعداد میں ہلاکتوں کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔

"بہت برا ہوا۔" عرفان میاں نے اداس لہجے میں بات کی۔

"اتنا برا بھی نہیں ہوا پاپا! اچھا ہے اس دھرتی سے کچھ بوجھ کم ہوا۔" علی نے جذباتی ہو کر کہا۔

"بری بات ہے بیٹا! ایسے نہیں کہتے۔" عرفان میاں، علی کو سمجھانے لگے "شاید تم اس لیے ایسا کہہ رہے ہو کیونکہ تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ کسی ایک آدمی کے مرنے سے اس کے ساتھ جڑے ہوئے کتنے لوگ زندہ لاش بن کر رہ جاتے ہیں،

مرنے والا تو منوں مٹی کے نیچے جا سوتا ہے مگر اس کے لواحقین روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔" بات کرتے ہوئے عرفان میاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اس لیے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

پاپا کی حالت دیکھ کر علی کو اپنے کہے ہوئے الفاظ پر شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی اس لیے فوراً بولا "آئی ایم سوری پاپا۔"

"اٹ از اوکے..... مگر آئندہ کبھی ایسی بات مت کرنا۔"

"جی پاپا!" علی نے کسی سمجھدار بیٹے کی طرح گردن جھکا کر آہستہ سے کہا۔

عرفان میاں اور علی باتوں میں لگ گئے تھے جبکہ ماما اور عمر کی نظریں مسلسل ٹی وی پر لگی ہوئی تھیں۔ بات ختم ہوتے ہی وہ دونوں بھی ٹی وی پر نظریں جما کر بیٹھ گئے تھے اب میڈیا کے لوگ اپنے اپنے کیمروں کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ چکے تھے اور وہاں کھڑے کھڑے اپنے اپنے چینل کو فیڈ بیک دے رہے تھے، مرنے والوں کی تعداد بارہ جبکہ زخمیوں کی تعداد پندرہ بتائی جا رہی تھی زخمیوں کو فوری طور پر قریبی ہسپتالوں میں منتقل کیا جا رہا تھا، پورے علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور دہشت گردوں کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مار ٹیمیں روانہ کی جا رہی تھیں۔

"پاپا! یہ تو وہی تھانہ ہے جہاں اس رات پولیس والے انہیں پکڑ کر لے گئے تھے۔" ٹی وی دیکھتے ہوئے عمر کی آواز عرفان میاں کے کانوں میں پڑی۔

"کیا کہا؟" عرفان میاں نے بات سن لی تھی پھر بھی اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"ہاں پاپا! ابھی ابھی جو اے ایس آئی کیمرہ مین سے بات کر رہا تھا نا..... اسی کی وجہ سے تو اس روز بات بڑھی تھی۔" عمر نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

"میرے خیال میں علاقے میں جس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان کی وجہ سے آج ہمیں فیکٹری نہیں جانا چاہئے۔ جگہ جگہ پولیس ناکوں پر چیکنگ کی وجہ سے خوامخواہ بدمزگی ہو گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ گھر میں ہی رہا جائے۔"

"ٹھیک ہے پاپا! ویسے بھی کافی دنوں سے بریک نہیں ملا، چلو اسی بہانے کچھ وقت آرام کرنے کو مل جائے گا۔" عمر نے بات کی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

علی بھی عمر کے اٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا تھا، کچھ دیر تک عرفان میاں اور ماما ٹی وی دیکھتے رہے، بار بار وہی فوٹیج دکھائے جا رہے تھے اس لیے انہوں نے ٹی وی بند کر دیا اور وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک سبھی اہل خانہ بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر اپنے اپنے بیڈروم میں جا کر سو گئے تھے۔ وہ ابھی گہری نیند کے مزے لے رہے تھے جب کوئی ڈور بیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھانا بھول گیا تھا، ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی، سبھی گھر والے اپنے بیڈ چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے، ہر فرد یہ سوچ رہا تھا کہ آیا بیل خود بخود بج اٹھی تھی یا کسی پر بیل بجانے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔

علی نے گیٹ کھولا، وہاں کچھ پولیس والے کھڑے تھے جو عمر کو بلانے کا کہہ رہے تھے، ان کی بات سن کر علی واپس آیا تو گھر کے دیگر افراد ٹی وی لاؤنج میں یہ جاننے کے لیے بے چین کھڑے تھے کہ اتنی رات گئے ان کے دروازے پر کون آ کھڑا ہوا تھا۔

"باہر کون تھا؟" علی کو دیکھتے ہی عرفان میاں نے سوال کیا۔

"کچھ پولیس والے ہیں۔"

"پولیس والے......! وہ اس وقت یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"
"وہ عمر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"
"کس لیے؟"
"پتا نہیں پاپا! بس وہ کہہ رہے ہیں کہ عمر کو باہر بھیجو۔"
"تم نے ان سے پوچھنا تو تھا کہ وہ عمر کو کس لیے بلا رہے ہیں۔"
"یہ میں نے نہیں پوچھا۔"
"چلو میں دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔" عرفان میاں نے یہ کہا اور علی کو ساتھ لیے باہر آ گئے۔

گیٹ کے باہر دو سپاہی ایک حولدار اور ایک سب انسپکٹر کھڑے تھے۔ عرفان میاں نے باری باری ان سب سے ہاتھ ملایا اور پھر سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "خیر تو ہے انسپکٹر صاحب..... اس وقت کیسے آنا ہوا؟"
"ہم عمر کو لینے آئے ہیں۔"
"مگر کیوں؟"
"آج تھانے میں جو بم دھماکا ہوا ہے اس کے بارے میں اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔"
"مگر بم دھماکے سے اس کا کیا تعلق؟"
"ہو سکتا ہے جیسا آپ کہہ رہے ہیں ایسا ہی ہو مگر اس وقت عمر کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"
"عجیب زبردستی ہے۔"
"بزرگو! آپ اسے زبردستی ہی سمجھ لیں، لیکن ہم اسے لینے آئے ہیں تو لے کر ہی جائیں گے۔" سب انسپکٹر نے سخت لہجے میں بات کی۔
"میں بھی دیکھتا ہوں تم لوگ اسے کیسے لے کر جاتے ہو۔" عرفان میاں چیخے۔

دونوں طرف سے ہی سخت الفاظ کا تبادلہ ہونے لگا تھا، قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی، علی فوراً بول پڑا۔ "آپ ان سے کیوں الجھ رہے ہیں پاپا! کچھ نہیں ہوگا آپ عمر کو ان کے ساتھ جانے دیں، جب وہ کسی معاملے میں ملوث ہی نہیں تو یہ کیا کرلیں گے۔"

علی کی بات عرفان میاں کے دل کو لگی تھی اس لیے انہوں نے مزید کوئی بات نہ کی اور عمر کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لیے رضامند ہوگئے۔

گھر سے رخصت ہونے سے پہلے کتنی ہی بار ماں نے روتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا، کتنی ہی بار باپ اور بھائی نے اسے گلے لگا کر تسلیاں دی تھیں، عمر کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے، وہ بے یقینی کے عالم میں باری باری سب کے چہروں کو یوں بغور دیکھ رہا تھا جیسے وہ چہرے اب اسے پھر کبھی دکھائی نہیں دیں گے، پھر وہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر خاموشی سے چل پڑا تھا۔

پولیس والے عمر کو لے کر جانے لگے تو عرفان میاں نے اپنی گاڑی، پولیس کی گاڑی کے پیچھے لگا لی تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ پولیس والے تفتیش کے لیے اسے کہاں لے جا رہے تھے، علی بھی ان کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا، ان دونوں کی نظریں مسلسل پولیس کی گاڑی پر ہی لگی ہوئی تھیں، وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے، یہ ماڈل ٹاؤن کا ہی علاقہ تھا، پولیس کی گاڑی ایک گھر کے سامنے جا کر رک گئی تھی، انہیں رکتا دیکھ کر عرفان میاں نے بھی ان سے کچھ فاصلے پر ہی اپنی گاڑی کو بریک لگا دی۔

جہاں وہ لوگ آ کر رکے تھے، وہاں پولیس کے دو سپاہی ہاتھوں میں اسلحہ لیے ڈیوٹی دے رہے تھے لیکن پریشان کر دینے والی بات یہ تھی کہ وہاں کسی پولیس اسٹیشن کا کوئی بورڈ لگا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پولیس اہل کار، عمر کو لے کر عمارت کے اندر چلے گئے تھے، کچھ دیر تک عرفان میاں اور علی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے، پھر انہوں نے اچھی طرح سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تاکہ وہ دوبارہ آئیں تو انہیں وہاں پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے، اب وہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا، اس لیے وہ بجھے دل کے ساتھ واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

پولیس کا تفتیشی مرکز تھا جہاں عمر کو لایا گیا تھا، پولیس کے جو اہل کار اسے گھر سے لے کر آئے تھے، وہ اسے ایک کمرے میں لے گئے جہاں سب انسپکٹر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے والی کرسی پر عمر کو بٹھا دیا، دونوں سپاہی اسی کمرے میں پڑے بنچ پر بیٹھ گئے تھے جبکہ حولدار، ان کے ساتھ وہاں نہیں آیا تھا۔

بیٹھتے ہی سب انسپکٹر بولا "ہاں بھئی عمر..... سب کچھ خود ہی بتا دو گے، یا مجھے پوچھنا پڑے گا؟"
"آپ مجھ سے کس بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"
"لو بھئی اب اسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ہم اس سے کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔" انسپکٹر، سپاہیوں کی طرف دیکھ کر یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ عمر کے منہ پر مارتے ہوئے دھاڑا "الو کا پٹھا، کسی حرامی کی اولاد..... ایسے میسنا بن کر بیٹھا ہے، جیسے کچھ جانتا ہی نہیں، ڈ میں کہتا ہوں خود ہی بک پڑو، نہیں تو تم جیسوں کی زبان کھلوانے کے مجھے بہت سے طریقے آتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے عمر کے منہ پر اچانک تھپڑ مارا تھا، اس لیے وہ سنبھل نہیں پایا تھا، درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ خاموشی سے اپنا گال سہلانے لگا تھا، اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر سب انسپکٹر نے میز پر پڑی چھڑی اٹھا لی اور غصے میں اس پر برساتے ہوئے چیخا "بولو..... بولو..... بولو......

بولتے کیوں نہیں..... بولو۔"

چھڑی عمر کے جسم کے مختلف حصوں پر برس رہی تھی اور وہ بری طرح تڑپتے ہوئے کہہ رہا تھا "میں نے کچھ نہیں کیا..... خدا کے لیے مجھے معاف کردو میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالنے کے بعد سب انسپکٹر نے چھڑی ایک طرف پھینک دی اور سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے لے جاؤ یہاں سے۔ کل پھر اسے میرے پاس لانا، تب تک شائد اس کی عقل بھی ٹھکانے آجائے۔"

اپنے افسر کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے عمر کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے لے جا کر ایک کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرے میں آتے ہی عمر کو ایک اور جھٹکا لگا، کیونکہ ظفر، خالد اور قاسم پہلے سے ہی اس کمرے میں موجود تھے۔

"ویلکم بھائی ویلکم! ہم تو کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے، کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اب کسی بھی لمحے تم بھی یہاں آنے والے ہو۔" عمر کو دیکھتے ہی ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عمر نے ظفر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اے ایس آئی کے کہنے پر عمر سے پہلے، ان تینوں کو بھی تھانے میں بم بلاسٹ کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے لایا گیا تھا اور اس کمرے میں بھیجے جانے سے قبل ان کے ساتھ بھی عمر جیسا ہی سلوک کیا گیا تھا، پولیس کے ہاتھوں ڈنڈوں سے پٹائی ہونے کے بعد ان کے بدن بھی بری طرح دکھ رہے تھے مگر وہ اپنے جسم میں ہونے والے درد کی شدت سے توجہ ہٹانے کے لیے خود کو باتوں میں لگانے کی کوشش میں تھے۔

"اب اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو.....؟ اب تو جہاں کہیں بھی اس طرح کا کوئی واقع رونما ہوگا، لوگ ہمیں مہمان بنا کر یہاں لاتے رہیں گے۔" قاسم نے بات کرنے کے لیے عمر کو چھیڑا۔

"ایک شخص سے بدلہ لینے کے لیے تم لوگوں نے کتنے بے گناہوں کی جان لے لی۔ جب بات ختم ہوگئی تھی تو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" عمر نے کہا۔

"او میاں! پولیس والوں کی طرح تم بھی یہی سمجھ رہے ہو کہ تھانے میں بلاسٹ ہم نے کیا ہے۔" عمر کی بات سن کر خالد کہہ رہا تھا "یہاں پہ وہی مثال فٹ آتی ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی، بم بلاسٹ کرنے والے کر کے چلے گئے اور اس الزام میں پکڑ کر ہمیں لے آئے۔"

"اگر ہمیں یہ کام کرنا ہوتا تو اب تک وہ اے ایس آئی دندناتا نہ پھر رہا ہوتا، اس کی لاش کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہوتے۔" ظفر نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بات کی۔

وہ تینوں ہی خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں تھے اس لیے عمر نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

❁❁❁

عمر کو چھوڑ کر گھر واپس آنے کے بعد عرفان میاں اور علی ایک پل کے لیے بھی سکون سے نہیں بیٹھے تھے اور بے چینی سے صبح ہونے کا انتظار کر رہے تھے، جبکہ ماما مسلسل روئے جا رہی تھی۔

ان کے گھر کی پچھلی ہی گلی میں ڈی آئی جی صاحب کی رہائش تھی، جن سے عرفان میاں کی اچھی سلام دعا تھی، جیسے ہی صبح کی روشنی پھیلنے لگی تو عرفان میاں نے ڈی آئی جی صاحب کا موبائل نمبر ملایا، مگر ان کا موبائل فون آف جا رہا تھا، پھر انہوں نے ان کے گھر کا نمبر ملایا تو پتا چلا کہ صاحب ابھی سو رہے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب سے فون پر بات نہ ہونے کی وجہ سے عرفان میاں کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی، انہوں نے بمشکل تھوڑی دیر انتظار کیا پھر علی کو ساتھ لیے ڈی آئی جی صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے۔

ڈی آئی جی صاحب کے ہاں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انتظار کرنے کو کہہ دیا گیا تھا۔ باپ بیٹا ڈرائنگ روم کے اندر کھلنے والے دروازے پر نظریں جمائے ڈی آئی جی صاحب کے انتظار میں بیٹھے تھے، انتظار کا ایک ایک پل صدیوں پر بھاری تھا، کچھ دیر بعد ہی ڈی آئی جی صاحب وہاں تشریف لے آئے، انہیں دیکھ کر باپ بیٹا دونوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بیٹھیں بیٹھیں..... پلیز۔" عرفان میاں اور علی کو اٹھتے دیکھ کر ڈی آئی جی صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر بیٹھتے ہوئے بولے "عرفان میاں، سب خیر تو ہے؟"

"خیر ہوتی تو میں اتنی صبح صبح آ کر آپ کو تنگ کیوں کرتا۔"

"بتائیں عرفان میاں کیا بات ہے؟" ڈی آئی جی صاحب نے پیار سے دریافت کیا۔

ڈی آئی جی صاحب کے پوچھنے پر جب عرفان میاں نے تمام تفصیلات بیان کر دیں تو انہوں نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور بولے "تو یہ بات ہے، میں طویل عرصے سے آپ کو اور آپ کے دونوں بیٹوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، آپ لوگوں کی شرافت کی قسم تو میں بھی اٹھانے کو تیار ہوں۔ بہر حال آپ سکون سے گھر جا کر بیٹھیں اور بیٹے کے لیے دعا کریں، میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں، آپ بے فکر ہو کر یہاں سے جائیں، خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈی آئی جی صاحب نے تسلی دی تو وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔

وہ گھر پہنچے تو ماما گیٹ پر ہی ان کے انتظار میں کھڑی تھی، انہیں دیکھتے ہی فوراً بولی "کیا کہا ڈی آئی جی صاحب نے؟"

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر چلو، وہاں آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" عرفان میاں نے کہا۔

وہ تینوں ایک ساتھ ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے اور پھر عرفان میاں نے ڈی آئی جی صاحب سے ہونے والی تمام گفتگو ماما کو سنا دی۔

صبح سے دوپہر اور پھر دوپہر سے شام ہوگئی تھی مگر عمر کے بارے میں ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی، پروین ان تینوں کے لیے پہلے ناشتہ اور پھر دوپہر کا کھانا لے کر آئی تھی مگر ان تینوں نے ہی انکار کر دیا تھا، ان میں سے کسی نے بھی پانی کا ایک قطرہ تک حلق سے نہیں اتارا تھا۔ ماما نے خاوند اور بیٹے کو ایک دو بار عمر کے لیے کھانا لے جانے کے لیے کہا تھا مگر کوئی اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوا تھا۔

وہ تینوں ہی منہ لٹکائے بیٹھے تھے، جب ڈی آئی جی صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور عمر گھر پہنچ گیا، اس کی حالت اس مسافر کی سی ہو رہی تھی جو طویل مسافت کے بعد گھر پہنچا ہو اور اس کا جسم تھکن سے چور چور ہو چکا ہو، وہ تینوں اسے دیکھتے ہی یوں گلے لگ کر ملے جیسے وہ کئی برسوں کی جدائی کے بعد پہلی بار ملے ہوں۔

❁❁❁

ابھی پچھلے زخم بھرنے بھی نہ پائے تھے، جب لاہور کے در و دیوار ایف آئی اے کی بلڈنگ میں ہونے والے بم دھماکوں سے لرز اٹھے اور ایک بار پھر پولیس والے عمر کو پکڑ کر لے گئے، وقت نے انہیں

عجیب آزمائش میں ڈال دیا تھا' عمر پھر سے سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے رہائی دلانے کے لیے باپ بیٹا ایک بار پھر ڈی آئی جی صاحب کے سامنے روئے پیٹے اور کسی نہ کسی طرح ڈی آئی جی صاحب کی کوششوں سے عمر کو پولیس کے نرغے سے چھڑا کر گھر لے آئے۔

پولیس والوں نے ایک ہی دن میں مار مار کر اس کی حالت اس قدر بگاڑ دی تھی کہ وہ کئی دن تک بیڈ سے ہی اٹھ نہ سکا۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا' ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی' اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف ظفر تھا۔ "اب کیسی حالت ہے ہمارے بھائی کی؟"

"تم نے مجھے فون کس لیے کیا ہے؟" عمر نے تلخ لہجے میں بات کی۔

"جب ایک تعلق بن ہی گیا ہے تو فون کرنے میں کیا حرج ہے بھائی۔"

"میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں اور نہ ہی مجھے آئندہ کبھی فون کرنا۔"

"تم کہتے ہو تو نہیں کروں گا پیارے..... مگر میرا ایک مشورہ سن لو۔"

"کیسا مشورہ"

"تم بھی ہماری طرح ضمانت قبل از گرفتاری کروا کے رکھو کیونکہ اب یہ پولیس والے کسی بھی صورت میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والے نہیں۔" ظفر نے بات کی اور فون بند کر دیا۔

ظفر کے فون نے عمر کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی' پھر وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا مگر سو نہ سکا۔

❁❁❁

کسی شخص کو قرآن پاک کے کچھ ادھ جلے اوراق ملے تھے' قریب ہی عیسائیوں کی بستی تھی' اس لیے خیال تھا کہ یہ گھناؤنی حرکت انہی کی ہے' مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی اور وہ مشتعل ہو کر سڑکوں پر نکل آئے تھے' لوگ جذبات میں آ کر عیسائیوں کے خلاف نعرے بازی کے ساتھ ساتھ توڑ پھوڑ بھی کرنے لگے تھے' ٹائر جلائے جا رہے تھے اور بسیں نذر آتش کی جا رہی تھیں۔

چھٹی کا دن تھا' گھر کے دیگر افراد کسی سلسلے میں گھر سے باہر گئے ہوئے تھے' عمر اکیلا بیٹھا یہ سب مناظر ٹی وی پر دیکھ کر کڑھ رہا تھا' اسی دوران کسی نے ڈور بیل بجائی' عمر نے باہر جا کر دیکھا تو دروازے پر خالد موجود تھا' قریب ہی ایک کار کھڑی تھی جس میں ڈرائیونگ سیٹ پر ظفر اور پچھلی سیٹ پر قاسم بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھ کر عمر کا دماغ گھوم گیا اور غصے کی حالت میں بولا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"غصے کیوں ہوتے ہو؟ آؤ گاڑی میں بیٹھ کر سکون سے بات کر لیتے ہیں۔"

"مگر میں بات کیوں کروں؟"

"تمہارے فائدے کی ہی بات ہے اگر نہیں سنو گے' تو پھر بھی سننی پڑے گی۔"

خالد کی بات سن کر عمر الجھ کر رہ گیا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر وہ کیا کرے' مجبوراً وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا' قاسم اور خالد اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

عمر کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ظفر بولا "پیارے بھائی! تم سوچ تو رہے ہو گے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"ہاں..... میں خالد سے بھی یہی پوچھ رہا تھا۔"

"دراصل خدا تمہارے ذریعے ایک بہت بڑا کام لینا چاہ رہا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں..... کون سا کام؟"

"قران پاک کے اوراق جلائے جانے کے بارے میں تو تم نے بھی سن ہی لیا ہو گا؟"

"ہاں..... میں ابھی ٹیلی وژن پر دیکھ رہا تھا۔"

"اور تمہیں یہ بھی پتا چل گیا ہو گا کہ یہ کام عیسائیوں نے کیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو' مگر دل نہیں مانتا۔"

"تمہارا دل مانے یا نہ مانے ..... مگر..... ایسا..... ہی..... ہوا..... ہے۔" ظفر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چیخا۔

"مگر یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں' جس طرح انہوں نے قرآن کے اوراق جلائے ہیں' اسی طرح تم ان کی بستی جلا ڈالو' حساب بھی برابر ہو جائے گا اور خدا بھی خوش ہو گا اور یہ تو تم جانتے ہی ہو' جن سے خدا خوش ہو جائے' جنت انہیں کا نصیب ہوتی ہے۔"

"لیکن تم لوگ مجھے یہ کام کرنے کا کیوں کہہ رہے ہو؟ خود کیوں نہیں جنت کما لیتے۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے' مگر اتنا سوچ لو' انکار کی صورت میں جنت میں جانے کا موقع تو تم گنوا ہی بیٹھو گے' ساتھ ہی تھانے میں بم بلاسٹ کرنے کے جرم میں گرفتار ہو کر جیل بھی بھیج دیے جاؤ گے۔"

"جب میں نے بم بلاسٹ کیا ہی نہیں تو پھر کیوں پکڑا جاؤں گا؟"

"لیکن جب ہم خود جا کر یہ بات تسلیم کریں گے کہ وہ بلاسٹ ہم نے کیے تھے اور تم ہمارے ساتھ تھے' تو کون پاگل ہو گا جو ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا؟"

ظفر کی بات نے عمر کو لاجواب کر دیا تھا اس لیے وہ خاموش تھا' ظفر کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں

پڑی۔ ”ہم نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا اب سوچنا تمہارا کام ہے۔ کل کسی وقت فون کر کے ہم تم سے تمہارا فیصلہ معلوم کر لیں گے کہ تمہیں جنت چاہیے یا جیل۔“

باتوں کے دوران خالد اور قاسم خاموش بیٹھے رہے تھے جیسے ہی ظفر کی بات مکمل ہوئی خالد گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور عمر کو بھی گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ عمر مزید کوئی بات کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اس کے نکلتے ہی وہ تینوں فوراً وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد عمر واپس ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھا ٹی وی ابھی تک چل رہا تھا اس نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر کے وہیں صوفے سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے ماما پاپا اور بھائی بھی واپس آگئے تھے وہ انہیں سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا مگر بتا نہیں پا رہا تھا وہ کسی سے کچھ کہے بغیر پریشانی کے عالم میں ہی اپنے بیڈ پر جا لیٹا تھا اس کی وہ رات بے چینی کے عالم میں جاگتے ہوئے گزری تھی اگلے روز وہ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے فیکٹری بھی نہیں گیا تھا۔ رات بھر سوچتے رہنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں کی بات مان لینے میں ہی بہتری ہے اور اب وہ ان کے فون کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

ڈر اور خوف کے مارے عمر صحیح طرح سے ناشتہ بھی نہیں کر پایا تھا بیٹے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر ماما یہی سمجھی تھی کہ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہو رہی ہے اسی لیے انہوں نے عمر کو گرم گرم دودھ کا گلاس لا کر دیا تھا تا کہ اسے کچھ انرجی ملے اور اس کی طبیعت بحال ہو ماما اس کے پاس دودھ رکھ کے چلی گئی تھی مگر وہ پی نہیں پا رہا تھا۔

ظفر نے اسے فون کرنے کا کہا تھا اس لیے وہ ڈرا سہما فون کے انتظار میں بیٹھا تھا فون کی بیل بجی تو وہ کانپنے لگا پھر اس نے بمشکل بات کی اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا اسے اس جگہ کا ایڈریس بتا دیا گیا تھا جہاں اسے پہنچنا تھا۔ وہ مقررہ جگہ پہنچا تو قاسم اس کا منتظر تھا وہ اسے لیے ایک پرانے سے گھر میں داخل ہو گیا جہاں ظفر اور خالد پہلے سے موجود تھے۔

”خوشی کی بات ہے کہ تم نے جنت میں جانے کا راستہ اپنایا۔“ سلام دعا کے بعد ظفر نے بات کی۔

”مجھے کرنا کیا ہو گا؟“ عمر نے معصومیت سے دریافت کیا۔

”ہم تمہیں ایک جیکٹ پہنا کر موٹر سائیکل پر بٹھا دیں گے تم عیسائیوں کی بستی میں گھس کر خود کو کسی بھی چیز سے ٹکرا دینا ایک ساتھ کئی دھماکے ہوں گے جس سے بستی اور بستی کے لوگ ختم ہو جائیں گے مگر یہ یاد رکھنا کہ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہوں گے اگر اس دوران تم دھماکہ نہیں کرو گے تو ہمارے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریموٹ دب جائے گا۔“

”مگر تم لوگ تو...... بستی کو آگ لگانے کا کہہ رہے تھے۔“

”ہاں...... کہا تو تھا...... مگر اب ارادہ بدل دیا۔“

”لیکن...... اس طرح تو میں بھی...... مارا جاؤں گا۔“

”جنت کے طلب گار موت سے ڈرا نہیں کرتے بھائی۔“ ظفر نے تسلی دی

”تم میں سے جنت میں جانے کا کسی کو شوق نہیں ہے کیا؟“

”کیوں نہیں! ہم تینوں بھی تمہارے پیچھے پیچھے ہی ہوں گے اگر تم ناکام ہوئے تو بستی کو ہم اڑا دیں گے کیونکہ عیسائیوں کی اس بستی میں رہنے والوں کی موت لکھی جا چکی ہے۔“ ظفر نے بات کی اور پھر دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ”بس اب تم باتوں میں وقت ضائع مت کرو اور جیسا کہا ہے ویسا ہی کرو۔“

وقت نے عمر کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس کے دونوں طرف موت تھی اور فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی وہ مجبور و بے بس خاموش کھڑا تھا اسے وہ جیکٹ پہنا دی گئی تھی جس میں بم فٹ تھے پھر اس کے جسم پر چادر لپیٹ دی گئی اور اسے ایک پرانی سی موٹر سائیکل پر بٹھا کر ٹارگٹ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

عمر کو خود کش حملے کے لیے دس منٹ کا وقت دیا گیا تھا اس کی موٹر سائیکل عیسائیوں کی بستی کی طرف بڑھ رہی تھی اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں گھر سے نکلا تھا مگر اب اس نے عیسائیوں کی بستی کو تباہ کرنے کا مکمل ارادہ کر لیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ جن لوگوں نے قرآن پاک کی بے حرمتی کی ہے ان کی موت ہی اس کے لیے راہ نجات ہے مگر اگلے ہی لمحے اس کے ذہن میں ایک اور خیال نے انگڑائی لی اور وہ سوچنے لگا کہ یہ بھی تو ممکن ہے یہ کسی دشمن کی چال ہو جو اس طرح سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑانا چاہتا ہو۔

وہ گہری سوچوں میں گم بستی کے قریب پہنچ گیا تھا اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اس کے پاس صرف تین منٹ باقی رہ گئے تھے اسے بستی میں داخل ہو کر وہاں کے مکینوں کو موت کی نیند سلا دینا تھا اچانک اس کے دل و دماغ میں قرآن پاک کی وہ آیت گونجنے لگی جسے وہ بچپن سے سنتا چلا آیا تھا۔

”جس نے ایک انسان کو قتل کیا گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔“ عمر کے دل میں اس آیت کا آنا تھا کہ وہ کانپ کر رہ گیا وہ سوچنے لگا کہ قرآن ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل کہہ رہا ہے۔ وہ تو ایک ساتھ بہت سے انسانوں کا قتل کرنے جا رہا تھا یہ خیال آتے ہی اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی اور وہ دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرنے لگا تھا۔

بستی سامنے دکھائی دے رہی تھی موٹر سائیکل تیزی سے بستی کی طرف بڑھ رہی تھی اب اس کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف دو منٹ تھے اس نے موٹر سائیکل کو بریک لگا دی اور پیچھے مڑ کر دیکھا اسے کچھ فاصلے پر ایک سرخ رنگ کی کار اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی اسے وہ کار پہچاننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی یہ وہی کار تھی جس میں پچھلی رات ظفر خالد اور قاسم اس کے ہاں آئے تھے۔

کار اس کا پیچھا کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اس کے پاس آخری چند سیکنڈ بچے تھے اچانک اس نے اپنی موٹر سائیکل کا رخ واپسی کی طرف موڑ لیا اب وہ بستی میں داخل ہونے کی بجائے موٹر سائیکل کو تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا بستی سے دور ہوتا جا رہا تھا اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ان تینوں نے گاڑی روک دی تھی اور حیرانی سے اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے عمر کے ارادوں میں چٹان جیسی مضبوطی آگئی تھی اور اس نے موٹر سائیکل کی رفتار مزید تیز کر دی تھی اب وہ کار کے انتہائی قریب پہنچ گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتے اس نے اپنی موٹر سائیکل کار سے ٹکرا دی اس کے کار سے ٹکراتے ہی اوپر تلے کئی زوردار دھماکے ہوئے تھے۔ موٹر سائیکل اور کار کے پرخچے اڑ گئے تھے جبکہ عمر سمیت چاروں کے جسم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں دور دور تک بکھر گئے تھے۔

مقدمہ

برادرم عمران احمد صاحب
تسلیمات!
کورٹ اور اسپتال ایسے مقامات ہیں جہاں آپ کو ایسی ایسی کہانیاں بکھری ہوئی ملیں گی کہ جنہیں سن کر آپ کا انسانیت سے یقین اٹھ جائے گا. بلکہ بعض اوقات تو آپ کو اپنے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگے گا ایسا محسوس ہونے لگے گا جیسے ہم بے رحم درندوں کے درمیان سانس لے رہے ہیں. یہ کہانی ایک ایسے ہی انسان نما درندے کی ہے جس نے چند روپوں کی خاطر پورے ایک خاندان کو بربادیوں کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا تھا.
امید ہے آپ حسب سابق میری سرپرستی کریں گے.

خلیل جبار
ہنجرہ پول، حیدر آباد

اس دن مجھے ایک مقدمے کے سلسلے میں کراچی کی ایک عدالت میں پیش ہونا تھا اسی فکر کی وجہ سے رات سکون سے نہیں سو سکا تھا۔ صبح جب وقت سے پہلے تیار ہو کر میں ناشتے کی ٹیبل پر پہنچا تو بیگم نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس کی حیرت بجا تھی مجھے بس کے سفر سے الرجی ہو جاتی ہے' اس لیے میں بس کا سفر کرنے سے کتراتا ہوں۔ یہ مقدمہ جب سے میرے پاس آیا تھا' میں وقت سے پہلے تیار ہو جاتا ہوں اور خوشی خوشی اس طرح بس کا سفر کرتا ہوں جیسے کوئی بات نہ ہو۔ الرجی بھی نہیں ہوتی ہے میں ہشاش بشاش سفر کرتا ہوں اور مقدمے کی پیشی بھگت کر آجاتا ہوں۔ مجھے کسی قسم کی تھکن نہیں ہوتی بلکہ بے پناہ روحانی خوشی محسوس کرتا ہوں۔

''تمہیں دیکھ کر بڑی حیرت ہونے لگی ہے۔'' بیگم نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''بس کا سفر کرنے پر۔'' میں نے مسکراتے ہوئے بیگم کی آنکھوں میں جھانکا۔

بیگم نے شرما کر نظریں نیچی کرلیں۔

''ہاں یہی بات ہے' سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کسی قسم کی الرجی بھی نہیں ہو رہی۔'' مسکراتے ہوئے کراچی جاتے ہو اور مسکراتے ہوئے واپس آجاتے ہو۔

''بیگم یہ حقیقت ہے کہ واقعی پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ اس مقدمے کی وجہ سے سفر کرتے ہوئے مجھے کسی قسم کی الرجی یا پریشانی نہیں ہو رہی ہے ورنہ تمہیں پتا ہے کہ سفر کا نام سن کر مجھے بخار آجاتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اسی بات نے مجھے بہت حیران کیا ہوا ہے۔'' بیگم نے کہا۔

رات بیگم کو میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کراچی جانا ہے اس لیے میرے بیدار ہونے پر بیگم نے ناشتہ تیار کر دیا تھا' میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور کوچ کے اڈے پر پہنچ گیا۔ کوچ تیار تھی اس لیے میرے بیٹھتے ہی چل پڑی۔ کوچ کے چلتے ہی میں نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆......☆......☆

یہ مقدمہ ملنے سے پہلے کی بات ہے اس رات میرے پاس ایک جاننے والے کا فون آیا۔

''سید سرفراز علی ایڈووکیٹ بات کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے کہا۔

''سرفراز صاحب میں شوکت بات کر رہا ہوں۔ ایک پارٹی سے آپ کی ملاقات کرانی ہے۔''

''ضرور' ضرور ہم آپ کی مدد کرنے کے لیے ہی وکالت کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہم کل گیارہ بجے سیشن کورٹ آجائیں گے' وہاں کہاں ملاقات کی جائے؟'' شوکت نے پوچھا۔

''آپ ایسا کریں پارٹی کے ساتھ شیڈ نمبر 21 پر آجائیں۔ میں وہیں پر ملوں گا۔'' میں نے کہا۔

دوسرے دن شوکت پارٹی کے ساتھ پہنچ گیا۔ وہ بوڑھی خاتون تھی انہوں نے مجھے ایف آئی آر دکھائی' میں ایف آئی آر سرسری طور پر دیکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔

''اس مقدمے میں اکیس لاکھ روپے کی ضمانت داخل کرنا پڑے گی' پچیس ہزار روپے میری فیس ہوگی۔ حیدر آباد سے کراچی جانے اور حیدر آباد سے آنے کے لیے گاڑی کا انتظام کرنا ہوگا۔'' میں نے پیشہ ورانہ انداز میں بات کی۔

میری بات سن کر خاتون کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

''سرفراز صاحب میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے' جب سے میں اس پریشانی میں آئی ہوں پیسے پیسے کو محتاج ہوگئی ہوں۔ مزاروں اور درگاہوں پر بھیک مانگ کر گزارا کر رہی ہوں' آپ یہ مقدمہ لڑیں' میرا لڑکا جیل سے باہر آجائے تو پھر میں جو مقدمہ کے اخراجات اور فیس ہے' ادا کر دوں گی لیکن میرے لڑکے کو کسی طرح جیل سے باہر نکلوا دیں۔'' رشیدہ نے کہا۔

جب رشیدہ نے یہ کہا کہ وہ بھیک مانگ کر گزارا کر رہی ہے تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں تم سے فیس نہیں لوں گا اور نہ ہی گاڑی کا انتظام کریں' میں بلا معاوضہ یہ مقدمہ لڑوں گا' صرف مجھے بس کا کرایہ دے دینا۔'' میں نے کہا۔

''سرفراز صاحب میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' رشیدہ نے کہا۔

''یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہارا بیٹا ان لوگوں کے چنگل میں کس طرح پھنس گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سرفراز صاحب! بات یہ ہے کہ انسان جب ذرا لالچ میں پڑ جاتا ہے تو پھر وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میری بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے۔ میں پانچ سال سے لانڈھی کے علاقے میں رہائش پزیر ہوں۔ ریحانہ نامی عورت ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ میرے گھریلو حالات سے آگاہ تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے کہا۔

''رشیدہ! تم ایسا کیوں نہیں کرلیتیں کچھ رقم کسی اسکیم میں لگا دو۔ اس طرح تمہیں ماہانہ رقم خرچے کے لیے اضافی مل جانے سے گھریلو خرچے میں سہارا مل جائے گا۔'' ریحانہ نے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں' قومی بچت اسکیموں میں ماہانہ منافع ملتا ہے لیکن وہ منافع اتنا کم ہوتا ہے کہ رقم جمع کرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر منافع زیادہ ہو تو پھر ایسی اسکیموں میں پیسہ لگانا اچھا لگتا ہے۔''

''سرکاری اسکیموں میں واقعی منافع بہت کم ہوتا ہے لیکن پرائیوٹ اداروں میں سرمایہ لگانے سے منافع زیادہ ملتا ہے۔''

"کیا ایسا ممکن ہے۔" میں نے چونک کر پوچھا۔
"ہاں میری ایک سہیلی افشین ہے اس نے اپنے بہنوئی شکیل کو دو لاکھ روپے کاروبار کے لیے دیئے ہوئے ہیں اور وہ اس کو ہر ماہ ٹھیک ٹھاک منافع دیتا ہے اگر تم افشین کے بہنوئی شکیل کو کاروبار میں کچھ رقم دینا چاہتی ہو تو میں بات کروں۔" ریحانہ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔
میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ہاتھوں ویسے ہی پریشان تھی۔ ماہانہ معقول رقم کی امید ہونے پر میں نے ہامی بھرلی اور ایک لاکھ روپیہ شکیل کو دے دیا۔ شکیل نے مجھے اور افشین کو ہر ماہ باقاعدگی سے رقم پر منافع دینا شروع کر دیا تھا۔ منافع بروقت ملنے سے شکیل پر ہمیں اعتماد ہو گیا تھا۔ ایک دن شکیل بڑے خوشگوار موڈ میں تھا اس نے مجھ سے کہا۔
"بس اتنے ہی منافع پر خوش رہو گی۔ زیادہ منافع کیوں نہیں کماتیں؟"
"میرے پاس جو رقم تھی میں نے تمہارے پاس جمع کرا دی، کہیں سے اور رقم آئے تو جمع کراؤں نا۔" میں نے کہا۔
"کون کم بخت تمہیں کہہ رہا ہے کہ تم رقم دو۔" شکیل نے کہا۔
"پھر کیا کروں؟" میں نے حیرت سے شکیل کو دیکھا۔
"اپنے عزیز و اقارب سے رقم لو اور مجھے دو، ہر سودے پر تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔" شکیل نے کہا۔
ہر سودے پر پانچ سو روپے کا سن کر میرے دل میں لالچ پیدا ہوا کہ مفت میں پانچ سو روپے آئیں گے۔ میں نے اپنے جان پہچان والوں کی رقم شکیل کے کاروبار میں لگوادی۔ شکیل نے بڑی ایمانداری سے مجھے میرا حصہ دے دیا۔ ڈیڑھ سال ہونے پر شکیل نے ہمیں کاروبار سے منافع دینا بند کر دیا جس پر مجھے تشویش ہوئی اور میں نے شکیل سے استفسار کیا تو وہ غصے سے بولا۔
"کون سے پیسے...... میرے پاس تمہارے کوئی پیسے نہیں ہیں۔"
"شکیل خدا کا خوف کرو، میں نے ایک ایک پیسہ جمع کر کے ایک لاکھ روپے کی رقم تمہیں دی تھی۔" میں نے کہا۔
"میرے پاس تمہاری کوئی رقم نہیں ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے کرلو، تھانے جاؤ، کورٹ جاؤ۔" وہ غصے سے بولا۔
"شکیل تم بے ایمان ہو گئے ہو، مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔" میں نے غصے سے کہا۔
"میں بے ایمان ہو گیا ہوں نا ٹھیک ہے پھر تم مجھ سے اب رقم لے کر دکھاؤ۔" شکیل نے کہا۔
"میں تمہیں کوئی دھمکی دینے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی میرا ارادہ ہے، مجھے صرف منافع کی رقم چاہیے۔" میں نے کہا۔
"میں نے تمہیں جب کہہ دیا کہ میرے پاس تمہاری کوئی رقم نہیں پھر کس بات کا منافع دوں اگر تم سمجھتی ہو تمہارے پیسے میری طرف ہیں تو پولیس کے پاس جاؤ، کورٹ جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔" شکیل نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔
شکیل کے اس رویئے سے مجھے شدید دھچکا لگا تھا۔ ماہانہ منافع ملنے سے گھریلو خرچ میں بڑی مدد مل رہی تھی اب گھر میں تنگی آ گئی تھی اور ایک لاکھ روپے کی رقم بھی ڈوب جاتی تھی۔ اپنی رقم وصول کرنے کا اب یہی آسرا رہ گیا تھا کہ پولیس سے مدد لی جائے۔ میں جب تھانے پہنچی تو تھانے کا عملہ خوش گپیوں میں

مصروف تھا مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔
"جی بی بی! کیا مسئلہ ہے تمہارا؟" ایک پولیس والے نے پوچھا۔
"جی وہ ایک رپورٹ درج کرانی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں، ہاں لکھوائیں ہم بیٹھے ہی رپورٹ درج کرنے کو ہیں۔" دوسرے پولیس والے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
"کس کے خلاف رپورٹ درج کرانی ہے؟" اس نے کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔
"ڈیڑھ سال قبل شکیل نے اپنی سالی کی معرفت مجھ سے ایک لاکھ روپیہ لیا تھا، کاروبار میں لگانے کے لیے اور وعدہ کیا تھا کہ وہ منافع کی رقم باقاعدگی سے ہر ماہ ادا کرے گا لیکن ڈیڑھ سال منافع دینے کے بعد رقم دینا بند کر دی اور رقم لینے سے بھی مکر گیا ہے۔" میں نے بتایا۔
"ایک لاکھ روپیہ تیرے پاس آیا کہاں سے؟" پولیس والے نے پوچھا۔
"میں نے بڑی محنت سے ایک لاکھ روپے کی رقم جمع کی تھی۔" میں نے کہا۔
"تیرے پاس شکیل کا فون نمبر ہے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں، ہاں۔" میں نے کہا
اتفاق سے شکیل کا موبائل نمبر زبانی یاد تھا اس لیے لکھوا دیا۔ موبائل نمبر دیکھ کر وہ چونکا۔
"ارے یہ تو اپنے شکیل بھائی کا نمبر ہے۔" پولیس والے نے کہا۔
"کیا تم شکیل کو جانتے ہو؟" میں چونکی۔
"ہاں، ہاں وہ بہت شریف انسان ہیں، میرا ایک فون جاتے ہی تھانے میں دوڑا دوڑا چلا آئے گا۔"
واقعی ایسا ہی ہوا پولیس والے کی ایک کال پر شکیل تھانے پر دوڑا دوڑا چلا آیا۔ تھانے میں مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ میں تھانے پہنچ کر اس کے خلاف رپورٹ درج کراؤں گی۔
"شکیل بھائی یہ عورت کہتی ہے کہ تم نے ایک لاکھ روپے اپنے کاروبار میں لگانے کے لیے اس سے لیے ہیں۔ ڈیڑھ سال منافع دے کر منافع دینا بند کر دیا ہے اور رقم لینے سے مکر گئے ہو۔" پولیس والے نے کہا۔
"میں کب رقم لینے سے مکر رہا ہوں، میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ اس عورت سے ایک لاکھ روپے کی رقم لی تھی۔ اس کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے ورنہ اس دور میں کون اتنی بڑی رقم دیتا ہے۔" شکیل نے کہا۔
"پھر میری رقم کیوں نہیں دے رہے ہو؟" میں نے غصے سے کہا۔
"وہ رقم میں تمہیں ڈیڑھ سال کے عرصے میں لوٹا چکا ہوں۔" شکیل نے کہا۔
"وہ منافع تھا اصل رقم کہاں دی ہے؟" میں نے کہا۔
"منافع کس بات کا؟ میں نے کاروبار کے لیے رقم ادھار لی تھی وہ میں نے لوٹا دی۔ منافع میں اس صورت میں دیتا جب میں نے رقم ادھار کی بجائے کاروبار میں لگانے کو لی ہوتی۔" شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تم جھوٹ بول رہے ہو، میں نے رقم ادھار نہیں کاروبار میں لگانے کے لیے دی تھی۔" میں نے غصے سے کہا۔
"میں نے تم سے کب کہا تھا کہ ادھار پر منافع

دوں گا' تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ میں نے تم سے رقم منافع کی صورت میں لی ہے؟'' شکیل نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا تھا کہ تم ڈیڑھ سال ہونے پر مکر جاؤ گے' ورنہ تم سے تحریری طور پر معاہدہ کرتی۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ لے منشی نوید! یہ کتنی مکار عورت ہے جو میرے خلاف رپورٹ درج کرانے آئی ہے۔ میں اس سے کاروبار کے لیے رقم لیتا تو تحریری طور پر معاہدہ کرتا جس میں اصل رقم اور ماہانہ منافع دینے کا درج ہوتا۔'' شکیل نے کہا۔

''ہاں' ہاں' ہمیں پہلے ہی پتا تھا یہ عورت تمہارے جیسے شریف انسان کے خلاف جھوٹی رپورٹ درج کرانے آئی ہے۔ اس لیے تمہیں فون کر کے بلالیا۔'' منشی نوید نے کہا۔

''گرمی بہت ہے میرے خیال میں یہ وقت ٹھنڈی بوتل پینے کا ہے۔'' شکیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ جیب سے نکالتے ہوئے منشی نوید کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

نوٹ دیکھ کر منشی نوید کے چہرے پر خوشی کی چمک آ گئی تھی۔

''اوے منیرے! جلدی آ' بھاگ کر دس ٹھنڈی ٹھار بوتلیں لے کر آؤ۔''

میں سمجھ چکی تھی کہ یہ سب ملے ہوئے ہیں۔ اس لیے شکیل نے بڑے تکبر سے کہا تھا' پولیس اور کورٹ جہاں دل چاہے چلی جاؤ۔ پولیس غریبوں کی کہاں ہوتی ہے جو رقم دکھائے اس کی ہو جاتی ہے۔ مجھ غریب کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے جو پولیس کی جیب گرم کرتی' اس لیے بہتری اسی میں سمجھی کہ خاموشی سے تھانے سے چلی آؤں اور کوئی ایسی تدبیر نکالوں جس سے ڈوبی ہوئی رقم نکل آئے۔ مجھ پر یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ وہ بڑے خطرناک قسم کے پیشہ ور مجرم اور جسم فروشی کے گھناؤنے کاروبار سے بھی منسلک ہیں۔ ایسے لوگوں کے پولیس سے بہت اچھے تعلقات ہوتے ہیں' جسے چاہیں پولیس کے ذریعے ہراساں کرادیتے ہیں تاکہ وہ ان کا سامنا نہ کر سکے۔ میری عمر بھر کی جمع پونجی وہ ایک لاکھ روپے کی رقم تھی اور وہ بھی مجھے ڈوبتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں چاہ رہی تھی کہ پیار و محبت سے یہ رقم نکل آئے اس لیے شکیل اور اس کے رشتے داروں کے گھروں کے چکر لگا کر رقم کا تقاضا کر رہی تھی۔ شکیل اور عمر فاروق کو مجھ پر بہت غصہ تھا کہ میں ان کے خلاف رپورٹ درج کرانے تھانے پہنچ گئی تھی اور ان کے رشتے داروں کے پاس بھی جا رہی ہوں' مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں سمجھی کہ وہ شاید اپنی بدنامی کے ڈر سے گھبرا گئے ہیں اور رقم دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی شکیل غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

''دیکھ لیا پولیس کے پاس جا کر...... دلادی پولیس نے تمہاری رقم؟''

''تم نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ پولیس کے پاس جاؤ' کورٹ جاؤ میں اس لیے گئی تھی۔'' میں اس کے غصے سے مرعوب ہوئے بغیر بولی۔

''اس کا مطلب ہوا میں جو کہوں گا وہ تم کرو گی؟'' شکیل نے معنی خیز مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنی رقم چاہیے' اسی لیے میں پولیس میں گئی تھی۔''

''ہم تمہارے ساتھ ایسا سلوک کریں گے کہ پولیس اور کورٹ جانے کے قابل ہی نہیں رہو گی۔'' یہ کہتے ہوئے فاروق نے مجھے پکڑ لیا اور شکیل

نے ایک اسٹامپ پیپر نکالا اور زبردستی اس پر میرا انگوٹھا لگا دیا اور پھر اس نے میری آنکھوں کے سامنے اسٹامپ پیپر لہراتے ہوئے کہا۔

''تیرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہم نے تجھ سے ایک لاکھ روپے اپنے مکان کی مرمت کرانے کے واسطے لیے ہیں۔'' شکیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ اسٹامپ مجھے دے دو۔'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔

''کیوں دے دیں' تم نے ہمیں اتنا پریشان کیا ہے اتنا بدنام کیا ہے پھر بھی تجھے اتنی آسانی سے دے دیں۔'' شکیل نے کہا۔

''یہ اسٹامپ پیپر تمہیں اس وقت مل سکتا ہے' جب تم اس کی قیمت چکا دو۔'' فاروق نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیسی قیمت؟'' میں چونکی۔

''ہمیں بے عزت اور بدنام کرنے کی قیمت صرف تین لاکھ روپے دو یا اپنی جوان کنواری لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔'' عمر فاروق نے کہا۔

''اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے ہوگی' میرا خیال ہے کہ یہ اپنی کنواری لڑکی ہمارے حوالے کروے' اس سے ہم خود تین لاکھ روپے کی رقم وصول کر لیں گے۔'' شکیل نے معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''تمیز سے بات کرو میری ایک لاکھ روپے کی رقم کھا چکے ہو اور اوپر سے اس طرح کی بکواس کر رہے ہو۔''

''تمہیں کتنی بار سمجھائیں کہ تم اپنی رقم لے چکی ہو' چاہے منافع کی مد میں سمجھو یا اصل کی صورت میں' ہر ماہ قسطوں میں رقم لے چکی ہو۔ بار بار اس بات کو دہرانا بند کرو۔'' شکیل نے غصے سے آنکھیں گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''میں تمہیں کوئی رقم نہیں دوں گی' کان کھول کر سن لو اور تمہیں مجھے ایک لاکھ روپے بھی دینا ہوں گے۔'' میں نے بھی غصے سے کہا۔

''ابھی تم غصے میں ہو' اس لیے گھر جاؤ جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تب ہماری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ تم نے جو ہمیں بدنام کیا ہے اس کے بدلے ہم تم سے بہت کچھ مانگ سکتے تھے لیکن تم سے رعایت کر رہے ہیں' تین لاکھ دو یا اپنی کنواری بیٹی دونوں میں سے ایک چیز ہمیں لازمی چاہیے ورنہ ہم تمہیں سنگین مقدمات میں ملوث کر کے جیل بھجوا دیں گے اور تمہارے گھر پر قبضہ کر لیں گے۔ اس لیے تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ہماری بات مان لو۔'' شکیل نے کہا۔

مجھے وہ دونوں اس وقت انسان کے روپ میں بھیڑیے نظر آ رہے تھے۔ میں گرتی پڑتی نا جانے کیسے گھر پہنچی تھی کچھ ہوش نہیں تھا۔ ذہن میں بار بار ان دونوں کی باتیں آ رہی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا بھی گر سکتے ہیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا میں ابھی تک کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں نے ان سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی رقم دی تو انتقامی طور پر مجھ پر جھوٹا مقدمہ بنوا کر جیل بھجوا دیا۔ مقدمہ جھوٹا تھا اس لیے جلد ہی میری ضمانت ہو گئی۔ میری ضمانت ہو جانے پر وہ خوش نہیں تھے' اس لیے وہ مجھ پر رقم دینے کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔

امیر لوگوں کے کروڑوں روپے ڈوب جائیں انہیں افسوس نہیں ہوتا' لیکن غریب کے سو روپے بھی ہتھیا لیں تو اسے بخار آ جاتا ہے۔ ایک لاکھ روپے

میرے حق حلال کی کمائی تھی پھر میں اتنی بڑی رقم کیسے چھوڑ سکتی تھی۔

شکیل نے عمر فاروق کے ذریعے پیغام بھیجا کہ اسے مجھ سے کام ہے فوراً ملاقات کرے۔ میں یہ سوچ کر ان کے گھر چلی گئی کہ شاید انہیں خدا کا خوف آ گیا ہے اور مجھے رقم دے دیں گے لیکن اس کے برعکس ہوا انہوں نے گھر بلا کر گھر میں قید کر دیا۔ مجھے ان سے ایسی امید نہیں تھی اسی لیے سخت پریشانی اور حیرت ہو رہی تھی۔

رات ہونے پر شکیل اور عمر فاروق میرے کمرے میں آئے۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' شکیل نے پوچھا۔

''کس بارے میں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہماری رقم دو گی یا اپنی لڑکی ہمارے حوالے کرو گی؟'' فاروق نے کہا۔

''تمیز سے بات کرو تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟'' مجھے شدید غصہ آ گیا۔

''یہ ناٹک کسی اور دکھانا' شرافت سے جواب دو کہ تم ہمیں کیا دو گی لڑکی یا رقم......؟'' شکیل نے کہا۔

''میرا بس چلے تو تم دونوں کے منہ پر جوتوں کی اتنی بارش کروں کہ تمہیں شریف لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ آ جائے۔'' میں نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

میری بات پر شکیل کو غصہ آ گیا اور اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں بوڑھی عورت ان کا کہاں مقابلہ کرتی' خاموشی سے ان کے تشدد کا نشانہ بنتی رہی' جب ان کے ہاتھ تھک گئے تو وہ رک گئے۔ شکیل کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا' اس نے عمر فاروق کو اشارہ کیا اور دونوں نے مل کر مجھے کرسی پر بٹھا کر باندھ دیا۔ شکیل کی شعلہ بار آنکھیں مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ اس نے بجلی کا ننگا تار مجھے لگایا تو بے اختیار ایک جھٹکا لگا۔

''بڑھیا! اب بھی وقت ہے' شرافت سے مان جا ورنہ ہم کرنٹ لگا لگا کر ہلاک کر دیں گے۔'' شکیل نے کہا۔

''بہت خوب الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میری رقم بغیر ڈکار لیے ہضم کر گئے اور اب مزید رقم کا مطالبہ کر رہے ہو' تمہارا پیٹ ہے یا دوزخ جو بھر ہی نہیں رہا۔'' میں چیختے ہوئے بولی۔

''خاموش بڑھیا! تیری زبان بہت لمبی ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شکیل نے مجھے وقفے وقفے سے کرنٹ لگانا شروع کر دیئے جس سے مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر ان دونوں کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

''ظالموں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو' نا جانے کب تم عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ایسی باتیں کمزور لوگ کرتے ہیں' ہمارے بازوؤں میں طاقت ہے ہم کسی سے نہیں ڈرتے' پولیس ہمارے ساتھ ہے پھر ہم کیوں بزدل لوگوں کی طرح زندگی گزاریں۔'' شکیل نے کہا۔

''بڑھیا ہماری بات مان لے ورنہ آج تیرے ساتھ وہ کچھ ہو جائے گا جس کا تو نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔'' عمر فاروق نے کہا

''تم میرے ساتھ جو یہ سلوک کر رہے ہو وہ کم ہے؟''

''ہم تیری عزت تار تار کر دیں گے جس کا تو نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔'' شکیل نے میرے سراپا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری ماں کی طرح ہوں مجھ سے تمیز سے بات کرو۔''

''ماں کی طرح ہے لیکن ماں تو نہیں ہے نا۔'' عمر فاروق نے زوردار قہقہہ لگایا۔

جواب میں شکیل نے بھی اس کا ساتھ دیا' وہ واقعی درندے تھے انہوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں ان کی ماں کی جگہ ہوں دونوں نے مل کر مجھے زیادتی کا نشانہ بنایا' میں اپنی عزت پر شرم سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔

ایک ہفتے تک انہوں نے مجھے حبس بے جا میں رکھا' جتنا تشدد وہ مجھ بوڑھی عورت پر کر سکتے تھے کیا میں انہیں رقم کہاں سے دے سکتی تھی میری جمع پونجی وہ پہلے ہی لے چکے تھے' کام نہ بنتا دیکھ کر وہ شدید اشتعال میں آئے تھے۔ غصے میں انہوں نے میرے بیٹے حاکم کو چیک سمیت بلایا اور میری رہائی کے عوض تین چیکوں پر زبردستی دستخط کرا لیے۔ مجھے حبس بے جا سے رہا کرتے ہوئے انہوں نے حاکم کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''ہم نے تم سے تین چیکوں پر دستخط کرا لیے ہیں لہٰذا تم فوری رقم کا بندوبست کرو ورنہ ہم جعلی چیک دینے کی ایف آئی آر درج کرا کے جیل بھجوا دیں گے۔'' شکیل نے کہا۔

''ہم تمہیں اتنی رقم نہیں دے سکتے جتنا تم مطالبہ کر رہے ہو۔ ویسے بھی تمہارے پاس ہماری جمع پونجی ایک لاکھ روپے موجود ہے۔ اب ہم کہاں سے تمہیں رقم دیں۔'' حاکم نے کہا۔

''تمہاری ماں نے تھانے جا کر اور ہمارے رشتہ داروں کے پاس جا کر جو ہماری بے عزتی کی ہے اس کے بدلے یہ رقم کچھ بھی نہیں ہے' اگر تم چاہتے ہو بات یہیں دب جائے تو پھر تم اپنی بہن دے دو اس کے ذریعے ہم خود رقم وصول کر لیں گے۔'' شکیل نے کہا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ زبان باہر کھینچ لوں گا۔'' حاکم نے کہا۔

''ارے بھئی بڑی اکڑ ہے اس میں' اپنی بہن سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر ہماری رقم ہمیں لوٹا دو۔''

''بڑے عجیب لوگ ہو' رقم دینے کی بجائے ہم سے مطالبہ کر رہے ہو۔'' حاکم نے کہا۔

''یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ سیدھے سیدھے ایف آئی آر کٹوا کر جیل بھجوا دو۔ خود ہی عقل ٹھکانے پر آ جائے گی۔'' عمر فاروق نے کہا۔

''ہاں ہاں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' شکیل نے کہا۔

پھر انہوں نے میرے بیٹے کو جعلی چیک دینے کے جھوٹے مقدمے میں پھنسوا دیا۔'' رشیدہ نے اپنے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

☆......☆......☆

کوچ کے رکنے پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنی آنکھیں آرام کی غرض سے بند کی تھیں لیکن کوچ میں ٹھنڈک اتنی تھی کہ بے اختیار نیند آ گئی تھی۔ میں نے پردہ اٹھا کر شیشے سے باہر دیکھا نوری آباد آ چکا تھا' کچھ مسافر اترے اور کچھ سوار ہو رہے تھے۔ کوچ پھر سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ میرے سیٹ پر سر ٹیک دینے سے آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں پھر سے سو گیا اور پھر کراچی پہنچنے پر ہی میری آنکھ کھلی۔

کوچ سے اتر کر میں نے سٹی کورٹ کا رکشہ کیا اور رکشے میں سوار ہو کر سٹی کورٹ پہنچ گیا۔

عدالت نے میرے دلائل بڑی توجہ سے سنے اور ہر مقدمے سے دو دو لاکھ کی ضمانتیں منظور کرلیں۔ ضمانت منظور ہونے پر مجھے بڑی خوشی ہورہی تھی۔

''لو بھئی میں نے ضمانتیں کرادی ہیں اور شورٹی لے آؤ تاکہ تمہارے بیٹے کو جیل سے باہر نکالا جاسکے۔'' میں نے رشیدہ کو دیکھ کر کہا۔

''سرفراز صاحب میں غریب عورت ہوں' میں کہاں سے اتنی رقم لاؤں' ہمیں کھانے کے لالے پڑے ہیں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''شورٹی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ رقم ہی جمع کرائی جائے کسی بھی واقف کار سے بات کریں جو شورٹی کے طور پر گھر کے کاغذات عدالت میں رکھوادے کیوں کہ شورٹی کے بغیر آپ کا لڑکا جیل سے باہر نہیں آسکے گا۔'' میں نے کہا۔

''شکیل اور عمر فاروق جیل میں حاکم کے پاس آئے تھے۔'' رشیدہ نے بتایا۔

''اچھا...... پھر انہوں نے کچھ کہا ہے حاکم سے؟'' میں نے کہا۔

''انہیں دھمکیاں دینے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے کہہ کر گئے ہیں کہ حاکم جیسے ہی جیل سے رہا ہوگا' پکڑ کر لے جائیں گے نوکر بنا کر رکھیں گے جب تک تین لاکھ روپے وصول نہیں ہوجاتے' چھوڑیں گے نہیں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پھر حاکم نے ان سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''حاکم نے ان سے یہی کہا کہ ہمارے ساتھ ظلم نہیں کرو' تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو' اس کا عذاب بہت ہی غضب ناک ہوتا ہے۔''

''تمہارے بیٹے نے بالکل ٹھیک کہا' لوگوں پر ظلم وستم کرتے کرتے یہ سخت دل ہوگئے ہیں۔ اللہ نے رسّی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے' جس وقت وہ رسّی کو کھینچے گا' اسی وقت ان کا اندازہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔

رشیدہ نے اپنے طور پر شورٹی کی بہت کوشش کی' راتوں کو رو رو کر اللہ کے حضور حاکم کی رہائی کے لیے دعائیں مانگنا اور شکیل اور عمر فاروق کو بددعائیں دینا اس کا معمول بن گیا تھا۔

شکیل اور عمر فاروق تین ماہ تک غائب رہنے کے بعد پھر جیل پہنچے اور حاکم سے ملاقات کی۔

''ہمیں دیکھ کر تم حیران ہورہے ہوگے کہ ہم کہاں غائب رہے؟'' شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم قتل کے مقدمے میں جیل میں تھے' جیسے ہی ضمانتیں ہوئی ہیں' تمہارے سامنے موجود ہیں۔''

''خدا کے عذاب سے ڈرو' میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے' آٹھ ماہ سے جیل میں قید ہوں' اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' حاکم نے کہا۔

''ہم تمہارا پیچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے' تمہاری ماں نے ہماری بڑی بدنامی کی ہے۔ یہ ہماری شرافت ہے اس بدنامی کے عوض صرف تین لاکھ روپے لے رہے ہیں اگر تم نے تین لاکھ روپے نہیں دیئے تو پھر جیسے جیسے عرصہ گزرے گا' رقم میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لیے تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تین لاکھ روپے کی رقم فوری طور پر دے دو۔'' شکیل نے کہا۔

''ہم پھر آئیں گے' اچھی طرح سوچ لو کہ یہ رقم تم ہمیں کس طرح ادا کروگے۔ اپنی پاگل ماں کو بھی سمجھا دو ہمارے پیچھے نہ پڑے ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔'' عمر فاروق نے کہا۔

وہ دونوں خطرناک دھمکیاں دیتے ہوئے چلے

گئے۔ یہ بات بھی مجھے رشیدہ سے فون پر پتا چل گئی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ سب محض دھمکیاں ہیں' ماں بیٹے کو ہراساں کرنے کے لیے تاکہ وہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرکے انہیں دے دیں۔

☆......☆......☆

پرائیوٹ کمپنی کا طیارہ گرنے کی خبر نے تمام پاکستانیوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا' سو سے زائد انسانی ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ دوسرے پاکستانیوں کی طرح میں بھی اس واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی' موبائل فون کی اسکرین پر رشیدہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

''شاید ضمانت کے لیے شورٹی کا بندوبست ہوگیا ہے۔'' میں نے موبائل میز سے اٹھاتے ہوئے کہا ''ہیلو۔''

''سرفراز صاحب! میرے بیٹے کو جھوٹے مقدمے میں پھنسانے والے اصل کردار شکیل اور عمر فاروق طیارے کے حادثے میں ہلاک ہوگئے ہیں۔'' رشیدہ نے کہا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا اس لیے بے ساختہ میرے منہ سے ''کیا'' نکل گیا۔

''ایک ہی نام کے دس ہزار آدمی ہوتے ہیں' لازمی نہیں کہ طیارے میں جس شخص کی ہلاکت ہوئی ہو وہ وہی ہوں جو ہم سمجھ رہے ہیں۔''

''سرفراز صاحب! شکیل اور عمر فاروق دونوں ہی ہلاک ہوگئے ہیں' دونوں کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر جسموں سے الگ ہوگئے ہیں وہ راولپنڈی میں قتل کے مقدمے میں عدالت کی پیشی پر جارہے تھے۔'' رشیدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے' بحیثیت وکیل میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ رشیدہ کو اتنی جلدی انصاف مل گیا۔ انصاف کے حصول کے لیے لوگوں کی زندگیاں بیت جاتی ہیں۔

میں جب مقدمے کی سماعت کے موقع پر عدالت گیا تو جج صاحب نے مجھے بتایا کہ شکیل اور عمر فاروق کا طیارے کے حادثے میں انتقال ہوگیا ہے چوں کہ جعلی چیک کا مقدمہ شکیل نے اپنی بیوی کے نام سے کرایا تھا' اس لیے یہ بات مجھے جلد پتا چل گئی تھی۔

میں نے رشیدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ جن لوگوں نے ظلم وزیادتی کی وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں' ان شاء اللہ تمہارا بیٹا بھی بہت جلد جیل سے باہر ہوگا۔ میں نے کچھ لوگوں سے ضمانت کی شورٹی کے لیے بات کی ہے' بہت جلد ضمانت کے کاغذات بھی عدالت میں جمع ہوجائیں گے۔''

میں رشیدہ کو بظاہر تسلی دے آیا تھا لیکن مجھے خدا کی ذات سے پوری امید تھی کہ شورٹی کا مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔ اسے خدا کی غیبی مدد کہیں گے کہ یامین شیخ کی شکل میں ہمیں ضمانت کی شورٹی دینے والا مل گیا اور آج حاکم کی ضمانت عدالت میں داخل کرنے پر رشیدہ کا بیٹا عدالت سے بھی ضمانت پر رہا ہوگیا ہے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے جب حاکم کی ضمانت ہوگئی ہے تو پھر وہ مقدمے سے بھی بری ہوجائے گا۔

تقدیر

محترم عمران احمد'
السّلام علیکم!
سچی کہانیاں کبھی میرا موضوع نہیں رہا لیکن آپ کے حکم اور برادرم اقبال بھٹی کی فرمائش نے مجھے کہانیوں کی صنف کی جانب آنے پر مجبور کردیا۔ سچ پوچھیں تو مجھے بھی اب اس میں مزا آنے لگا ہے۔ ہزارہا بلکہ لاکھوں کہانیاں ہمارے اردگرد بکھری ہوئی ہیں۔ بس اس طرف نظر ڈالنے اور قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ زیر نظر کہانی ان لوگوں کی ہے جو خونی رشتوں کو بھی دولت کے ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر از خود پچھتاوں کی آگ میں کود جاتے ہیں۔ امید ہے آپ کو اور قارئین کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔
والسّلام
نوشاد عادل
کراچی

''گھس گئے...... پھر گھس گئے یہاں بدبوخانے میں......'' عذرا بھابی کی چنگھاڑ ابھری۔ ''کتنی بار منع کیا ہے یہاں آنے کو...... سنتے ہی کب ہو تم لوگ میری...... بیماریاں لگ گئیں تو پڑجائیں گے بستر پر میری جان کو......اور آپ تو منع کردیا کرو بچوں کو......ایک ذرا سا منع بھی نہیں ہوتا۔''

عذرا بھابی اماں سے بول رہی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو بچے سہمے سہمے سے وہاں سے نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ میرے پیچھے لگ گئے۔

''آنی چیز...... آنی میری چاکلیٹ۔''

میں نے پرس میں سے بچوں کو چاکلیٹ' بسکٹ اور ٹافیاں دیں پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

عذرا بھابی نے پہلے ہی مجھے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ منہ بناتی ہوئی وہاں سے چل دیں۔ میں نے اماں کو دیکھا وہ بے چاری سر جھکائے اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے پرس ایک طرف ڈالا اور اماں کے پاس بیٹھ گئی۔

''اماں...... منع کردیا کریں نا بچوں کو آنے سے...... آپ کو بلاوجہ کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔''

اماں نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''کیا منع کروں میں بچوں کو...... محبت میں آجاتے ہیں...... میرا دل بھی بہل جاتا ہے۔ پر ان کی ماؤں کو اچھا نہیں لگتا بچوں کا میرے پاس آنا۔''

''انہیں تو ہم دونوں ہی اس گھر میں اچھے نہیں لگتے۔'' میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کا بس چلے تو ابھی کھڑے کھڑے ہمیں گھر سے باہر نکال دیں۔''

''نہیں سائرہ بیٹا...... ایسا نہیں کہتے۔ وہ اگر ہمیں اپنا نہیں سمجھتی ہیں تو ہم تو سمجھتے ہیں۔'' اماں نے پیار سے مجھے سمجھایا اور پھر وہ...... وہ دونوں میرے بیٹوں کی بیویاں ہیں۔ کتنے ارمان سے بیاہ کرلائی تھی میں ان دونوں کو۔''

''اور انہوں نے آپ کے ارمانوں کا خون کردیا......'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اب تک پرانی پرانی باتیں ہی یاد کرتی رہتی ہیں۔ سارا قصور تو آپ کے بیٹوں کا ہے۔ مرد کو مرد کی طرح رہنا چاہیے۔''

''اچھا بیٹا بس کر اب...... بلاوجہ ان دونوں نے سن لیا تو رات تک بڑبڑاتی رہیں گی۔'' اماں نے مجھے خاموش رہنے کا کہا۔ میں چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے الماری سے دوسرے کپڑے نکالنے لگی۔

میری اماں کا تعلق ایک بہت بڑے اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اماں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھیں۔ ان کے والد بڑے ٹرانسپورٹر تھے۔ اس وقت ویسے ہی لوگوں کے پاس اتنی گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ اماں کے والد یعنی میرے نانا ابرار شیخ شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے امیر کبیر ہونے کے باوجود ان میں غرور وتکبر نام کو نہ تھا۔ وہ اللہ کے نام پر غریبوں میں بھی اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ تقسیم کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی دولت میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

یہ تمام باتیں مجھے اماں سے معلوم ہوتی رہی ہیں۔ پھر میرے سب سے چھوٹے ماموں جب تک زندہ رہے وہ ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ بہت سی باتیں چھوٹے ماموں نے مجھے بتائی تھیں۔

اماں کی شادی کم عمری میں ہی کردی گئی تھی۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی کہ لڑکی کی شادی میں مسئلہ ہوتا اور نہ اماں کے رشتوں میں کوئی کمی تھی۔ اپنی جوانی میں بڑی خوب رو اور سیدھی سادی ہوا کرتی تھیں۔ بہت سے معزز خاندان انہیں اپنے گھر کی بہو بنانے کے متمنی تھے۔ بڑے بڑے سیٹھوں کے صاحب زادوں اور نوابوں کے رشتے آئے مگر نصیب میرے والد میاں محی الدین سے جا لڑا تھا۔ وہ میرے نانا کے عزیز ترین دوست کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اس طرح میری والدہ کی شادی ہوگئی۔

میرے نانا نے اپنی بیٹی کو جہیز میں کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ شادی ایسی دھوم دھام سے کی تھی کہ دنیا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔ میری امی کی طرح ابو بھی سیدھے سادے تھے ان میں چالاکی نام کو نہ تھی۔ یہی حال امی کا تھا۔ نانا نے ایک بڑا سا مکان بھی امی کو دیا تھا۔ نانی نے بہت سا زیور دیا تھا۔ امی کم عمر تھیں اور انہیں سونے کے زیورات سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ نانی نے انہیں زیورات رکھنے کے لیے ایک خوب صورت سی صندوقچی دی تھی۔ وہ برسوں تک یونہی پڑی رہی تھی۔

پھر اللہ نے انہیں بیٹے سے نوازا۔ انہوں نے بیٹے کا نام زاہد رکھا۔ جب زاہد بھائی پیدا ہوئے تھے تو اس وقت بھی نانا نانی زندہ تھے۔ انہوں نے نواسے کی پیدائش کی خوب خوشیاں منائی تھیں۔ زاہد بھائی نانا کے لاڈلے تھے۔ زاہد بھائی کے بعد حامد بھائی پیدا ہوئے۔ اس وقت نانا کا انتقال ہوگیا تھا اور جب میں دنیا میں آئی تو نانی بھی اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں۔

ابو کا اپنا کپڑے کا کاروبار تھا۔ بڑا اچھا چلتا تھا۔ جب ہم تھوڑے بڑے ہوئے تو ابو نے زاہد بھائی اور حامد بھائی کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ کام پر بھی لگالیا۔ وہ دونوں اسکول سے پڑھ کر گھر آتے' پھر کھانا کھانے کے بعد ابو کے لیے بھی کھانا لے کر دکان پر چلے جاتے تھے' مارکیٹ میں ابو کا بڑا نام تھا۔ دکان بہت بڑی تھی۔ ابو نہایت ایمان داری سے کاروبار کرتے تھے۔ حق حلال سے ایک روپیہ اوپر لینا وہ گناہ سمجھتے تھے۔

امی گھرداری میں مصروف رہتی تھیں۔ میں ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ وہ وقت بہت اچھا تھا۔ کسی

چیز کی فکر تھی نہ کوئی غم۔ میرے والد ان پڑھ نہیں تھے۔ انہیں تعلیم کی اہمیت کا احساس تھا۔ بس وہ خاندانی کاروباری تھے اس لیے ملازمت پر کاروبار کو اہمیت دی تھی۔ نانا نے امی کو بھی میٹرک تک تعلیم دلائی تھی۔ آگے پڑھنے کی نوبت اس لیے نہیں آسکی کہ ان کی شادی کردی گئی تھی۔ امی نے آگے تو نہیں پڑھا مگر گھر میں ہی کتابیں پڑھ لیتی تھیں۔ ان وقتوں میں لے دے کر صرف بلیک اینڈ وہائٹ ٹیلی ویژن ہی گھر کی ایک واحد تفریح ہوتی تھی۔ لہٰذا امی کو کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا۔

وقت ایسے گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا۔ زاہد بھائی اور حامد بھائی نے پورا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ ابو بیمار رہنے لگے تھے۔ اب ان کا زیادہ وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔ ہفتے میں ایک یا دو دن ہی دکان کا چکر لگاتے تھے پھر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ ہم سب کو روتا چھوڑ کر چلے گئے۔ خاص طور پر امی کو ان کی وفات پر بہت صدمہ ہوا تھا۔ مگر اولاد کے خیال نے انہیں زندہ رکھا ہوا تھا۔

ابو کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد زاہد بھائی کی شادی کردی گئی۔ عذرا بھابی ہمارے گھر کی بڑی بہو بن کر آ گئیں۔ اب امی کو میری فکر ستانے لگی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب میرے فرض سے سبکدوش ہوجائیں مگر دونوں بھائیوں کو پہلے بھی میری پروا نہ تھی اور اب تو خاص طور پر شادی کے بعد انہوں نے مجھے بالکل نظر انداز کردیا تھا۔ امی دونوں بھائیوں سے اکثر بولتی تھیں۔

"ارے بہن کی بھی کچھ فکر کرلو...... جوان ہوگئی ہے...... کوئی رشتہ دیکھو...... اپنے جاننے والوں سے معلوم کرو...... کب تک اسے بٹھا کر رکھو گے؟"

زاہد بھائی جھنجلا کر بولتے۔ "ہوجائے گی امی! آپ بھی ہتھیلی پر سرسوں جما دیتی ہیں۔ ابھی کون سی سائرہ بوڑھی ہوگئی ہے۔ ابھی تو کافی ٹائم ہے۔ جب ہونا ہوگی تو ہوجائے گی۔"

"بیٹا لڑکیوں کی عمر آنکھ میچتے ہی نکل جاتی ہے۔ جتنی جلدی فرض پورا ہوجائے اتنا اچھا ہے۔"

"ہمیں بھی پتا ہے امی...... آپ کیا سمجھتی ہیں کہ ہمیں سائرہ کی کوئی فکر نہیں ہے۔" اس بار حامد بھائی نے جواب دیا تھا۔ "آخر بھائی ہیں ہم...... جو ہم سے ہوسکے گا کریں گے...... جیسے ہی نظر میں کوئی اچھا رشتہ آئے گا تو بتا دیں گے۔ اب اسے ایسے ہی راہ چلتے کسی کے حوالے تو کرنے سے رہے۔"

"میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میری زندگی میں ہی یہ فرض پورا ہوجائے۔ پھر میں سکون سے مرسکوں گی۔" زاہد بھائی نے منہ بنا کر کہا۔ "بس یہی تو بری بات لگتی ہے آپ کی...... فوراً مرنے کی باتیں شروع کردیتی ہیں۔ پتا نہیں آپ کو اتنی فکر کس بات کی لگ گئی ہے۔ ہم دونوں ہیں نا فکر کرنے والے...... یہ فرض بھی ہم ہی پورا کریں گے۔"

عذرا بھابی بھی وہاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے جان لیا کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولیں "ہاں اور کیا...... شادی تو ہم ہی کریں گے نا...... اچھا سا رشتہ دیکھیں گے چھان پھٹک ہوگی اور دھوم دھام سے رخصت کریں گے اسے۔ ٹھیک تو کہہ رہے ہیں یہ۔"

میں ان لوگوں کی باتیں سنتی تھی لیکن ان میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ ابو کے بعد جب سے پوری دکان دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں آئی تھی...... امی اور میں ان کے رحم و کرم پر آ گئے تھے۔ امی کا خرچ ہی کیا تھا...... دو وقت کی روٹی تھی البتہ میرا تعلیمی خرچ تھا جو بڑی مشکلوں سے بھائیوں کی جیبوں سے نکلتا تھا۔ زاہد بھائی کو انگلیوں پر نچانے والی عذرا بھابی تھیں۔ وہ جو منہ سے نکال دیں، زاہد بھائی آنکھیں بند کرکے اس پر عمل کرتے تھے۔

زاہد بھائی کے دو بچے بھی تھے جو اب خاصے بڑے ہوچکے تھے اور اسکول جاتے تھے۔ ان کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر حامد بھائی کی بھی شادی ہوگئی۔ ان کی بیوی فرزانہ بھابی بھی عذرا بھابی سے کسی طور کم نہیں تھیں۔ گھر آتے ہی انہوں نے چند روز میں ہی سارے معاملات بھانپ لیے تھے۔

اب آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ کاروبار پر تسلط جمانے کی جنگ شروع ہوگئی۔ جب تک حامد بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی، انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ زاہد بھائی کا دکان پر زیادہ قبضہ ہے۔ حامد بھائی کے اپنے اخراجات پورے ہوجاتے تھے لہٰذا انہیں اس بات کی پروا بھی نہ تھی لیکن شادی ہوگئی اور فرزانہ بھابی نے ان کی ٹیوننگ شروع کی تو وہ بھی چارج ہوگئے۔

شروع میں تو صرف ہلکی پھلکی جھڑپ ہوجاتی تھی لیکن پھر یہ جھڑپ زیادہ بڑھنے لگی۔ فرزانہ بھابی دیکھ رہی تھیں کہ عذرا بھابی کا شوہر گھر میں زیادہ پیسے لاتا ہے، اپنی بیوی اور بچوں کو زیادہ چیزیں لاکر دیتا ہے جبکہ ان کا شوہر لگے بندھے پیسوں پر اکتفا کرتا تھا۔ جب سے انہوں نے اپنے شوہر کو چابی دینا شروع کی وہ بھی ہوشیار ہونے لگے اور نتیجہ لڑائی کی صورت میں نکلنے لگا تھا۔

ایک رات میں اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ امی اپنی مسہری پر دراز تھیں۔ گاہے بہ گاہے وہ مجھ سے باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ اتنے میں باہر سے حامد بھائی کی تیز آواز ابھری۔

"بس بھائی جان...... بہت ہوگیا ہے...... اب میں ان روز کے دو چار سو پر گزارا نہیں کرسکتا...... میں کوئی مزدور تو نہیں ہوں نا...... جو آپ مجھے روز کی دیہاڑی دیتے ہیں...... شادی سے پہلے تک تو ٹھیک تھا...... مگر اب...... اب میرے ساتھ میری بیوی بھی ہے...... اس کے بھی دس خرچے ہیں۔"

زاہد بھائی کی غصیلی آواز آئی۔ "تو اور کیا چاہیے تمہیں؟ ہزار روپے روز دوں......؟ اتنی سیل نہیں ہوتی ہے۔ جو مل رہا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو...... ویسے بھی تم دکان پر کرتے کیا ہو...... دن بھر پنکھے کے نیچے بیٹھے رہتے ہو یا پھر چائے منگوا منگوا کر پیتے ہو...... اس پر اتنے پیسے مل رہے ہیں...... یہی بہت ہیں۔"

"تو آپ کو کون سا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ملازم ہی سارے کام نمٹاتے ہیں۔ اور پھر...... میں بھی دکان کا اتنا ہی مالک ہوں جتنا آپ ہیں۔" حامد بھائی کا لہجہ اس بار مزید سخت ہوگیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ دونوں بھائی صحن میں کھڑے دکھائی دیے۔

امی اٹھنے لگیں تو میں نے انہیں پکڑ لیا۔ "نہیں امی آپ باہر نہ جائیں۔"

"ارے میں بیچ میں نہیں بولوں گی تو دونوں یونہی لڑتے رہیں گے۔ روز کا معمول بنا لیا ہے انہوں نے...... پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ خون سفید کرلیے ہیں پیسوں کے پیچھے۔" امی مسہری سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔ امی باہر چلی گئیں۔ کھڑکی سے مجھے وہ لوگ نظر آرہے تھے۔

"کیا ہوگیا ہے بیٹا......؟" امی نے جاتے ہی دونوں کی طرف دیکھا۔ "کیوں اس طرح جھگڑ

رہے ہو۔"

"امی آپ مت بولیں درمیان میں۔" زاہد بھائی نے فوراً انہیں ٹوک دیا۔ "آپ جائیں اپنے کمرے میں۔ آرام کریں۔ کوئی نہیں جھگڑ رہا...... بلاوجہ اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

اس بات پر حامد بھائی ایک دم بھڑک کر بولے۔ "ہاں بھائی...... میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بس اب دکان میں سے میرا جو حصہ بنتا ہے' وہ مجھے چاہیے۔ میں اپنی الگ دکان کرلوں گا۔ روز روز بھیک مانگنے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنا کاروبار جمالوں۔"

"دیکھ لیا امی آپ نے اسے؟" زاہد بھائی نے جھلا کر امی سے کہا۔ "اب یہ اپنا حصہ مانگ رہا ہے۔ جبکہ سب جانتے ہیں کہ کاروبار بڑھانے میں کس نے سب سے زیادہ محنت کی ہے۔ ارے دن رات ایک کر دیے ہیں میں نے...... کوئی ایسے ہی خود بخود کاروبار نہیں بڑھ گیا۔ تم تو بہت بعد میں دکان پر بیٹھنے لگے تھے۔ کام تو شروع میں نے ہی کیا تھا۔ اب تک میں ہی کر رہا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میں اپنا حصہ چھوڑ دوں۔" حامد بھائی کا لہجہ مکمل بدلا ہوا تھا۔ ان کے منہ میں فرزانہ بھابی کی زبان تھی۔ "اگر آپ نے دکان پہلے سنبھالی تھی تو آپ بڑے تھے۔ اور پھر آپ نے اس حساب سے پیسہ اپنے اوپر خرچ بھی کیا ہے۔ بس میں نے بول دیا ہے مجھے میرا حصہ چاہیے ہر حالت میں۔ امی آپ بتا دیں بھائی کو...... اور میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ اپنا حصہ ہی مانگ رہا ہوں۔ شرعی اور قانونی جو دکان میں سے میرا بنتا ہے مجھے دے دیں...... ورنہ روز روز یہی چک چک بازی چلتی رہے گی۔"

یہ کہہ کر حامد بھائی اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔ بھائی اور امی انہیں دیکھتے رہ گئے۔

"دیکھا...... دیکھا آپ نے اسے......؟" زاہد بھائی کے چہرے سے غصہ اور بے بسی مترشح تھی۔ "کیسا بولنا آ گیا ہے اسے...... پہلے میرے آگے کسی بات پر اف نہیں کرتا تھا اور اب دیکھیں اسے...... کیسے چڑھ چڑھ کے آ رہا ہے۔"

"میں کیا بولوں...... میری تو خود عقل کام نہیں کر رہی ہے۔" امی کی بے بسی دیدنی تھی۔ "کس کی طرف داری کروں اور کس کی نہ کروں۔"

"آپ کچھ نہ کریں۔ بس جا کے اپنے کمرے میں آرام کریں۔" زاہد بھائی جھنجلا اٹھے اور وہ بھی اپنے کمرے کی طرف چل پڑے۔

یہ معاملہ ادھر ختم نہیں ہوا بلکہ اب تو شروع ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں کی چپقلش سے گھر میں مستقل تناؤ کی صورت ہو گئی تھی۔ فی الحال حامد بھائی نے اپنا مطالبہ کر کے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ دونوں بھابیاں بظاہر مل کر رہتی تھیں لیکن ان کے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ فرزانہ بھابی کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ٹی وی ڈرامے دیکھتے ہوئے گزرتا تھا یا پھر ٹیلی فون پر اپنے گھر والوں سے باتیں کرتے ہوئے۔ عذرا بھابی اپنے بچوں میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں نے اپنی اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ بس گھر میں امی اور میں لاوارثوں کی طرح پڑے رہتے تھے۔

میں نے کئی بار امی سے کہا کہ میں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرلوں' تاکہ کم از کم چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے تو بھائیوں کی محتاج نہ ہو مگر امی نے ہر بار مجھے منع کر دیا۔

"نہیں سائرہ...... تو کہاں نوکری کرتی پھرے گی...... ہمارے خاندان میں عورتوں نے کبھی نوکری نہیں کی۔"

"کسی کے خاندان کی عورتیں پہلے نوکری نہیں کرتی تھیں امی؟" میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔ "مگر جب ضرورتیں بڑھیں یا مجبوریاں...... تو عورتوں کو بھی نوکری کے لیے نکلنا پڑتا ہے۔"

"اللہ کرے ہم پر ایسا وقت نہ آئے۔" امی نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ "جیسا جو مل رہا ہے اللہ کا شکر ہے۔ بس وہ وقت آنے سے پہلے تو اپنے گھر کی ہو جائے۔"

"مگر امی ہم کب تک بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہیں گے؟" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"بیٹا...... اسے ہاتھ پھیلانا نہیں کہتے...... یہ تو تیرا حق ہے...... آخر تو بہن ہے ان کی...... بہن کا بھائیوں کی کمائی پر حق ہوتا ہے۔" امی کی آواز کھوکھلی تھی۔

میں تلخ انداز میں ہلکے سے بولی۔ "ہوں...... حق...... آ تو گئی ہیں حق لینے والی...... پورا حق وصول کر رہی ہیں۔"

"وہ بھی ان کی بیویاں ہیں...... حق تو بیوی کا بھی ہوتا ہے میری بچی...... آخر تم نے بھی تو کسی کی بیوی بننا ہے نا؟" امی نے ناصحانہ انداز میں پیار سے سمجھایا۔

"مگر امی...... اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ بیوی کے چکر میں آدمی اپنی ماں بہن کو ہی نظر انداز کر دے۔" میں نے شکایتاً کہا۔ "میں یہ نہیں کہہ رہی کہ صرف ہمارا سوچیں...... مگر انصاف کی بات تو کریں۔"

"اگر وہ نہیں سوچتے تو تم ہی اپنے بھائیوں کا خیال کرتے ہوئے درگزر سے کام لو۔ کبھی نہ کبھی تو انہیں عقل آ ہی جائے گی۔" امی نے کہا۔ میں خاموش رہی۔ میں مزید بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اب ایسا بھی ہونے لگا تھا کہ دونوں بھائی اپنی اپنی بیگمات کے لیے اکثر کھانے پینے کی چیزیں لاتے اور سیدھا اپنے کمرے میں لے جاتے تھے۔ ورنہ پہلے کوئی بھی چیز لاتے تو امی کے ہاتھوں میں دیتے تھے۔ امی ان باتوں کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیتی تھیں۔

چند سال مزید گزر گئے۔ اس دوران یہ ہو گیا کہ زاہد بھائی نے حامد بھائی کا حصہ انہیں دے کر کاروبار سے الگ کر دیا تھا اور اب وہ بڑی دکان کے تنہا مالک بن گئے تھے۔ حامد بھائی نے اپنے حصے کے ملنے والے پیسوں میں اسی مارکیٹ میں اپنی کپڑے کی دکان کر لی تھی۔ اب دونوں بھائی اپنے اپنے الگ کاروبار کے مالک ہو گئے تھے۔ فی الحال ایک ہی مکان میں رہتے تھے بات چیت بھی دونوں کے درمیان بہت کم ہو گئی تھی۔

حامد بھائی کے بھی دو بچے ہو گئے تھے۔ امی اور میں بھائیوں کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں ان کا ان معاملات میں کوئی قصور نہیں تھا۔

اکثر بچے امی کے پاس ہی ان کے کمرے میں گھسے رہتے تھے۔ امی کے پاس ان کی برسوں پرانی چیزیں بھی تھیں۔ جو انہوں نے یادگار کے طور پر سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی مسہری کے نیچے ایک پرانی ٹیڑھی میڑھی جست کی پیٹی تھی اس میں برسوں پرانے پیتل کے برتن' لوٹا' پاندان' چمچے' تشتریاں' پلیٹیں اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ بھائیوں کے بچے اکثر اس پیٹی میں سے یہ سامان

نکال کر کھیلنا شروع کر دیتے تھے۔ امی انہیں کھیلتا دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھیں۔

اس دوران میں نے کسی نہ کسی طرح مارا ماری کر کے اچھے نمبروں سے گریجویشن کر لی۔ میں نے نوکری کا ارادہ پکا کر لیا تھا۔ کیونکہ مجھے بھائیوں سے کسی چیز کی کوئی توقع نہ تھی۔ اب تک انہوں نے میری شادی کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دونوں اپنے کاروبار اور بیوی بچوں کے ہو کر رہ گئے تھے اور یہ بھلا دیا تھا کہ گھر میں جوان بہن بھی ہے۔ انہیں اپنا فرض بھی پورا کرنا ہے۔ میں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ اپنے لیے مجھے ہی خود سب کچھ کرنا پڑے گا۔

"بس اب یہ کسر اور رہ گئی تھی...... اب وہ بھی پوری کر دی۔" زاہد بھائی ہمارے کمرے میں آ کر چلا رہے تھے۔ "چلو پڑھنے سے ہم نے نہیں روکا...... اس نے ضد کر کرا کے اپنا شوق پورا کر لیا...... لیکن اب اتنے پر نکل آئے کہ بھائیوں سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا اور چپ چاپ ملازمت بھی کر لی۔"

"لوگ بولیں گے کہ بھائی ایک بہن کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ایسا کون سا بھوکا رکھ رہے تھے ہم تمہیں۔" حامد بھائی بھی زاہد بھائی کے ساتھ مل گئے۔ "ایسی کیا آفت آ گئی تھی...... کیا ضرورت پیش آ گئی کہ ساری دنیا میں ہمیں بدنام کرنے گھر سے نکل گئیں؟"

"اب بھی آپ دونوں کو امی اور میرا خیال نہیں...... صرف اپنی بدنامی کا ڈر ہے......" میں نے پہلی بار بھائیوں کے سامنے اتنے تلخ لہجے میں بات کی تھی۔

"اوہو...... تو ملازمت کرتے ہی زبان بھی لمبی کر لی...... دیکھا امی آپ نے اسے......؟" زاہد بھائی امی کی طرف پلٹے۔

"اسے ہی نہیں...... میں تو سب کو دیکھ رہی ہوں زاہد......" امی کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ "ٹھیک کیا اس نے...... جب دونوں بھائی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچیں گے تو اسے نکلنا ہی ہوگا باہر۔"

"اچھا...... تو اب سمجھا۔" زاہد بھائی نے گردن ہلائی۔ "اسے شہہ دینے والی آپ ہیں۔"

"نہیں بیٹا...... اسے شہہ دینے والی میں نہیں بلکہ مجبور کرنے والے تم دونوں ہو۔"

"تو کیا ہم نے اسے کہا تھا کہ جا کر نوکری کرو۔" حامد بھائی نے غصے سے پوچھا۔

"ہر بات کہی نہیں جاتی رویوں سے ظاہر بھی ہو جاتی ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ہم کون سے تم پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ ایسا کیا رویہ ہے ہمارا؟" حامد بھائی میری جانب مڑ کر طیش میں بولے۔

میں خاموش ہو کر امی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دونوں کافی دیر تک امی کو سناتے رہے۔ ان دونوں کی بیویاں بھس میں چنگی ڈال کر اپنے اپنے کمروں میں بیٹھی آگ بھڑکتی دیکھ رہی تھیں۔

❁......❁......❁

"آپ بولتی نہیں ہیں؟" اچانک کسی کی آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے فیصل کھڑا تھا۔ میں نے فائل بند کی اور ہچکچا کر کہا۔

"آپ آپ...... بیٹھیں۔"

"کیا فائدہ......؟" فیصل نے گہری سانس لی۔ "جب آپ بات ہی نہیں کریں گی تو کیا میں خود سے باتیں کروں گا بیٹھ کر۔"

"وہ اصل میں...... باس نے یہ کام دیا تھا...... اسے پورا کرنا ہے اور صبح دینا ہے۔" میں نے فائل کی

طرف اشارہ کیا۔

"باس کا تو یہی کام ہے کہ دوسروں کو کام تھما دیتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔" فیصل کرسی پر بیٹھ گیا۔ "ویسے اطلاع کے لیے عرض ہے کہ باس تشریف لے جا چکے ہیں۔ لہٰذا آپ کی ایفی شنسی دیکھنے والا اور شاباش دینے والا کوئی نہیں ہے یہاں...... سوائے میرے۔"

"جی نہیں۔" میں نے تردیدی انداز میں کہا۔ "میں کسی کو دکھانے کے لیے کام کرتی ہوں اور نہ شاباش لینے کے لیے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" فیصل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"وہ کس بات کا؟"

"آپ نے بات تو کی...... ورنہ میں تو مایوس ہو گیا تھا...... مگر پھر مجھے خیال آیا کہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اس لیے آج آپ کے پاس امید لے کر آ گیا۔"

"کس بات کی امید؟" میں نے اسی انداز میں پوچھا۔

"آپ سے بات کرنے کی۔" فیصل نے شوخی سے کہا۔

اس کے انداز پر نا چاہتے ہوئے بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ یہ فیصل سے میری پہلی ملاقات نہیں تھی مگر اس سے پہلے صرف آفیشلی گفتگو ہی ہوتی تھی۔ آج پہلی بار ہم نے دیگر باتیں کی تھیں۔

فیصل بہت اچھا لڑکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی جو مجھے پسند آئی وہ یہ کہ فیصل بہت ہنس مکھ اور شریف لڑکا تھا۔ پھر اکثر ہم دونوں فرصت میں باتیں کرنے لگے تھے۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے بھی اپنے اور گھر والوں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

پھر نا جانے کس طرح...... کب...... میں فیصل کی منتظر رہنے لگی۔ ہمارے درمیان بے تکلفی کے پردے گر چکے تھے۔ آفس میں لنچ ٹائم پر ہم دونوں ایک ساتھ لنچ کرتے تھے۔ ہماری دوستی پر آفس کے بہت سے افراد ذومعنی انداز سے ہمیں دیکھتے تھے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے تھے۔ میں نے فیصل کو یہ بات بتائی تو اس نے ہنس کر کہا۔

"ایسے موقعوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"کیسے موقعوں پر؟"

"بھئی فلموں میں نہیں دیکھا...... جب لڑکا لڑکی آپس میں محبت کرتے ہیں تو انہیں لوگوں کی حاسد نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" فیصل روانی میں یہ بات کہہ گیا۔

اس کی بات پر میرے سراپا میں بجلی سی دوڑ گئی۔ پھر فیصل کو بھی احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے نظریں چرا کر جلدی سے کہا۔

"چلو...... اب دیر ہو رہی ہے...... کام بھی نمٹانا ہے۔" میں کھڑی ہو گئی تھی۔ فیصل سے نظریں ملانے کی تاب نہیں رہی تھی مجھ میں۔ فیصل نے دھیرے دھیرے کھڑے ہو کر سرگوشیانہ انداز میں استفسار کیا۔

"سائرہ...... تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا؟"

"چلو فیصل پلیز......" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے لہجے سے عجلت کا اظہار کیا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو سائرہ...... ابھی۔" فیصل نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بے انتہا سنجیدہ

دکھائی دے رہا تھا۔

"کس بات کا؟"

"ابھی جو میں نے کہی تھی۔"

میں چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا۔"

"زبردست......" فیصل خوش ہوگیا۔ "یعنی کہ یعنی کہ میں خوش ہوجاؤں؟"

"پہلے ہی دانت نکل رہے ہیں اور کتنا خوش ہوگے۔" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا اور فیصل ہنس پڑا۔

❀......❀......❀

گھر کے معمولات ویسے ہی تھے۔ دونوں بھابیوں کے درمیان سرد مہری قائم تھی۔ یہی حال بھائیوں کا تھا۔ امی ان لوگوں کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں مقید رہتی تھیں۔ بچے آجاتے تھے ان میں مصروف ہوجاتی تھیں۔ بچوں کو بھی دادی سے خوب لگاؤ تھا۔ حالانکہ ان کی مائیں بچوں کو امی کے کمرے میں آنے سے روکتی تھیں مگر بچے دادی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ اب بھی موقع پا کر دادی کے پاس آجاتے اور ان کے سامان میں گھس جاتے تھے۔ کئی بار میں نے انہیں روکا تو امی نے مجھے جھڑک دیا۔ "کیوں روک رہی ہے سائرہ انہیں...... کھیلنے دے نا...... انہیں دیکھ دیکھ کر تو میری آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔"

"امی میں تو آپ کے سامان کی وجہ سے بول رہی تھی۔" میں نے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو امی کی پرانی پیٹی میں سے سامان نکالے کھیل رہے تھے۔ "آپ کی یادگار چیزیں ہیں...... آپ خود بولتی ہیں کہ ان سے بڑی یادیں وابستہ ہیں۔ بلاوجہ خراب کر رہے ہیں یہ۔"

"پاگل ہوگئی ہے کیا۔" امی نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ ان بچوں سے بڑھ کر تو نہیں ہیں نا۔ بے جان چیزیں ہیں۔ اور یہ تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے...... توڑ دیں گے نا...... تو توڑ دیں...... دس بار توڑ دیں۔"

زاہد بھائی کی سات سالہ فریحہ پاندان کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے امی کی بات سن کر کہا۔ "دادی ہم نہیں توڑیں گے...... کچھ بھی...... ہم تو صرف کھیلتے ہیں۔"

امی نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔ "مجھے معلوم ہے بیٹا۔" اتنے میں فریحہ سے چھوٹا فرحان ایک موٹی سی پیتل کی چین لے کر باہر بھاگا۔ فریحہ چلائی۔

"دادی...... فرحان آپ کی چین لے گیا۔" پھر اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ "رکو...... چین دو دادی کی۔"

"یہ ایسے ہی شرارت کرتے رہتے ہیں۔" امی ہنسنے لگیں۔

"خراب کردے گا وہ۔" میں نے کہا۔

"تو کرنے دو...... پیتل کی تو ہے۔ تیری نانی نے شادی پر جو بہت سارا سامان اور برتن دیے تھے ان کے ساتھ یہ چین بھی تھی۔"

اتنے میں عذرا بھابی وہاں آئیں' ان کے ہاتھ میں وہی پیتل کی میلی سی چین تھی۔ وہ انہوں نے برتنوں کے پاس ڈال دی۔

"آپ منع کیوں نہیں کرتی ہیں انہیں۔ اتنی میلی کچیلی چیزیں دے دیتی ہیں کھیلنے کے لیے...... انہی ہاتھوں سے کھانا کھالیتے ہیں...... پھر بیمار پڑجاتے ہیں ہماری جان پر...... ہزاروں جراثیم ہوتے ہیں ان گندے سندے برتنوں میں...... بیچ باچ کر جان چھڑائیں۔"

عذرا بھابی بولیں تو بولتی چلی گئیں۔

"اگر کبھی امی یا میں بچوں کو کسی کام سے روکیں یا ٹوکیں تو آپ کو تب بھی برا لگ جاتا ہے بھابی...... اس لیے نہیں روکتے۔" میں نے بھی ترش لہجے میں جواب دیا۔

"کم از کم انسان دیکھ کر تو منع کرتا ہے۔ بھلے سے وہ غلاظت میں کھیلتے رہیں۔" عذرا بھابی کے ماتھے پر شکنیں بن گئیں اور پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر چلی گئیں۔

"اس لیے میں آپ کو منع کرتی ہوں امی۔" میں نے شکایتاً امی سے کہا۔

"بیٹا...... مجھ سے منع نہیں ہوسکتا۔" امی نے بے بسی سے کہا۔ میں ان کی بکھری ہوئی چیزیں اٹھا کر پیٹی میں رکھنے لگی۔

❀......❀......❀
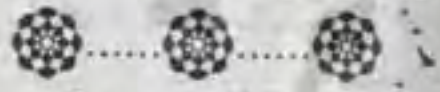
فیصل نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی امی کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیج دے گا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور کہا۔

"اتنی جلدی......؟"

"اتنی جلدی کیا مطلب ہے بھئی......" فیصل نے ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر مجھے گھورا۔ "کیا بوڑھا ہونے کا انتظار کرنا ہے؟"

"اوہو...... میرا مطلب یہ تھا کہ......" میں بولتے بولتے رک گئی۔

"کیا مطلب تھا......" فیصل نے جمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "گھما پھرا کر بات مت کرو سائرہ...... جو بھی بات ہے کھل کر کرو۔"

"تم میرے گھر کے معاملات سے واقف ہو نا؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ اس وقت ہم لوگ ایک ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ آفس کے بعد فیصل اور میں اکثر یہاں آجاتے تھے۔ پھر وہ مجھے بائیک پر گھر کے نزدیک اسٹاپ پر ڈراپ کردیتا تھا۔ ورنہ بس سے بھی مجھے اتنا ہی ٹائم لگتا تھا جتنا ریسٹورنٹ میں تھوڑا وقت گزار کر بائیک پر پہنچنے میں لگتا تھا۔

"ہاں...... تم نے بتا تو دیا تھا...... اور بھی کوئی بات رہ گئی ہے کیا؟" فیصل نے کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر سوال کیا۔

"نہیں......" میں نے انگلی سے ٹیبل کی سطح کھرچتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... اچھا...... میں سمجھ گیا۔" فیصل نے گہری سانس لی۔ "امی کا مسئلہ ہے...... یہی بات ہے نا؟"

"ہاں......" میں نے اقرار کیا۔ "دیکھو فیصل تمہاری حد تک تو ٹھیک ہے کہ تم نے میرے گھر کے معاملات سننے کے بعد بھی مجھے قبول کیا ہے لیکن تمہاری والدہ...... کیا وہ قبول کرلیں گی؟"

فیصل ہنسنے لگا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا ہوا...... ہنس کیوں رہے ہو تم؟"

"تمہارے معصومانہ سوال پر۔" فیصل نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔ "میں امی کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ بلکہ وہ تو خوش ہوئی تھیں کہ تم نے شروع سے ہی کچھ نہیں چھپایا اور نہ کوئی غلط بیانی کی...... انہوں نے ہی مجھے کہا ہے کہ تم سے رشتے کا معلوم کرکے بتاؤں۔"

"اچھا...... اچھا تو پھر ٹھیک ہے...... میں کل جواب دوں گی امی سے پوچھ کر۔" میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

فیصل نے ٹائم پر مجھے اسٹاپ پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے میں گھر چلی آئی۔ امی کو میں نے پہلے ہی فیصل کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوا تھا اور میرا خیال ہے کہ امی معاملے کی تہہ تک پہنچ چکی تھیں آج میں خوشی خوشی گھر پہنچی۔ حسب معمول بچے بھاگے چلے آئے۔ آج تو میں ان کے لیے چیزیں بھی لانا بھول گئی تھی۔ مگر میں نے انہیں پیسے دے دیئے کہ جا کر چیز خرید لیں۔

ابھی میں امی کے کمرے میں داخل ہی ہونے والی تھی کہ باہر بھائی کی گاڑی کی آواز آئی۔ پھر انہوں نے مسلسل ہارن بجانا شروع کر دیا۔ وہ اتنی عجلت پہلے کبھی نہیں کرتے تھے۔ میں نے پلٹ کر دروازہ کھولا۔ پھر زاہد بھائی اندر آئے' ان کا چہرہ دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ وہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

اس سے قبل کہ میں کچھ پوچھتی' انہوں نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔

''کون تھا وہ......؟ کس کے ساتھ گھوم رہی تھی...... بتا...... بکواس کر؟''

میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ میرے منہ سے ہکلائی ہوئی آواز نکلی۔ ''کک...... کو...... ن......؟''

''وہی جس کے ساتھ بائیک پر چپک کر بیٹھی تھی۔'' زاہد بھائی کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ مجھے ایسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہے تھے جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔

''وہ...... میرے آفس میں کام کرتا ہے...... چھوڑنے آیا تھا۔'' میں نے اٹک اٹک کر بتایا۔ ''بس نہیں مل رہی تھی۔''

''جھوٹ مت بول......'' بھائی گرجے۔ ''سچ سچ بتا۔''

یہ چیخ پکار سن کر دونوں بھابیاں اور امی بھی اپنے کمروں سے نکل آئیں۔

''کیا ہو گیا زاہد؟ کیوں شور مچا رہا ہے؟'' امی نے آتے ہی پوچھا۔

''دل تو کر رہا ہے اس کا گلا دبا دوں۔'' زاہد بھائی نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہوا کیا ہے آخر...... کچھ پتا تو چلے...... خامخائی میں چلا رہا ہے۔'' امی نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے ہی پوچھیں اپنی چہیتی سے۔ بھائیوں کی عزت کو سڑکوں پر نیلام کر رہی ہے۔ غیر مرد کے ساتھ اسکوٹر پر گھوم رہی تھی۔ وہ تو آج اتفاق سے میں نے دیکھ لیا...... پتا نہیں کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہو گا۔'' زاہد بھائی کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

دونوں بھابیاں خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان دونوں کی نظروں میں میرے لیے طنز اور نفرت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اور ویسے بھی ان سے ہمدردی کی امید رکھنا ایسا تھا جیسے رات میں سورج دیکھنے کی کوشش کرنا۔

''کون تھا وہ سائرہ......؟ کس کے ساتھ تھی تو؟'' امی نے پوچھا۔

''وہ فیصل تھا امی...... جس کا میں نے آپ کو بتایا تھا۔'' میں نے حواس سمیٹتے ہوئے کہا۔ اب میرا اعتماد بحال ہوا تھا اور مجھے بھائی پر غصہ آنے لگا تھا۔ انہوں نے کبھی میری پروا نہیں کی تھی کہ بہن گھر میں بیٹھی ہے اس کی شادی بھی کرنا ہے۔ کبھی جھوٹے منہ میری شادی کی فکر میں ایک لفظ نہ کہا تھا اور آج انہیں اپنی عزت کی فکر نے ہلکان کر ڈالا تھا۔

''اچھا...... تو فیصل تھا۔'' پھر امی نے زاہد بھائی سے کہا۔ ''وہ شریف لڑکا ہے...... اس کے ساتھ ہی نوکری کرتا ہے دفتر میں۔ مجھے بتا چکی ہے اس کے بارے میں۔''

''اچھا تو آپ کو پتا تھا اس چکر کا۔'' عذرا بھابی نے زبان کھولی اور زہر اگلا۔ ''سن لیا آپ نے...... اب اور کیا پوچھنا ہے...... چلیں اپنے کمرے میں...... سب سمجھ میں آ گیا ہے۔'' عذرا بھابی نے زاہد بھائی سے کہا۔

زاہد بھائی اپنی بیوی کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کرتے تھے اور نہ اس کا کہا ٹالتے تھے' لہٰذا ایک کہنے سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ فرزانہ بھابی بھی میدان صاف ہوتے دیکھ کر خاموشی سے اپنے کمرے میں جا گھسیں۔

''یہ سب کیا ہے بیٹا؟'' امی نے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔ ''تو اس کے ساتھ کہاں گھوم رہی تھی۔ پتا ہے کہ اگر بھائی دیکھ لیں گے یہی ہو گا جو آج ہوا......''

''چھوڑیں امی ان بھائیوں کی بات۔'' میں نے زہرخند کیا۔ ''ویسے تو کبھی بھائیوں والی محبت نہیں کی...... اور اب بھائی بن کر آ گئے...... ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

پھر میں نے امی کو فیصل کی بات بتا دی وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے چہرے پر فکر اور خوشی کے تاثرات آپس میں مدغم ہو رہے تھے۔ وہ اس تذبذب میں پڑ گئی تھیں کہ اس پر خوشی کا اظہار کریں یا پریشانی کا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا اللہ نے کرم کیا ہے مگر...... مگر شادی ہو گی کیسے؟'' امی فکر کے مارے دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹ رہی تھیں اور کھول رہی تھیں۔ ''میرے پلے تو کچھ بھی نہیں ہے...... اور اپنے بھائیوں کا حال تو تُو جانتی ہی ہے۔''

''اللہ بہت بڑا ہے امی...... ہو جائے گا کچھ نہ کچھ...... تھوڑے سے پیسے تو میں نے بھی جوڑ کر رکھے ہوئے ہیں۔ باقی کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی جائے گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ خود میں بھی پریشان ہو گئی تھی۔ بہرطور میں نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

❀......❀......❀

فیصل سے میں نے کہہ دیا تھا کہ امی رشتے کے لیے راضی ہیں' وہ مناسب وقت دیکھ کر بتا دیں گی کہ تم لوگوں کو کب آنا ہے۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' فیصل نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس میں مناسب وقت کی کیا بات ہے......؟''

''بات یہ ہے فیصل......'' یہ کہہ کر میں نے اسے بھائیوں اور بھابیوں کے رویے کے بارے میں بتا دیا۔ ''اوہ......'' فیصل نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ''یہ بات ہے...... اچھا یہ بتاؤ کہ تم اپنی امی کو میرے گھر لا سکتی ہو؟''

''تمہارے گھر...... امی کو؟'' میں نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

''ہاں...... فیصل نے سر ہلا کر کہا۔ ''اگر تمہارے گھر آنے میں مسئلہ ہے تو تم اپنی امی کو ہمارے گھر لے آؤ...... رشتے کی بات طے کرنا ہی باقی ہے۔ کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارے گھر یا ہمارے گھر۔''

''اچھا...... میں...... میں امی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔'' میں نے نیم رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

''مگر جلد جواب دینا۔ تم نے اب تک جو بھی معاملات بتائے ہیں ان سے مجھے لگتا ہے کہ اب بھائیوں اور بھابیوں سے تمہارے تعلقات مزید بگڑتے جائیں گے۔'' فیصل نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا اور میں نے تائیدی انداز میں

سر ہلا دیا۔
فیصل کا کہنا سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔
زاہد بھائی اور حامد بھائی نے اندر ہی اندر فیصلہ کرلیا تھا کہ اس گھر کو جلد از جلد فروخت کردیا جائے اور اپنے اپنے حصے کی رقم لے کر وہ الگ الگ مکان خرید لیں۔ یعنی اب کاروبار کے بعد گھر بھی الگ کرنے کا فیصلہ ہوگیا تھا۔
''امی...... پھر ہم لوگ کہاں جائیں گے......؟''
میں نے رات کے وقت امی سے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔
''ہم بھی کوئی چھوٹا موٹا مکان دیکھ لیں گے بیٹا...... وہ دونوں بول رہے تھے کہ میرا اور تمہارا جو حصہ بنتا ہے وہ ہمیں دے دیں گے۔'' امی نے خاصے دل گرفتہ انداز میں کہا تھا۔ مجھے رونا آ گیا۔ سچ بات تھی کہ اس وقت مجھے اپنا نہیں بلکہ امی کا زیادہ خیال تھا۔ میں تو شادی کے بعد فیصل کے گھر چلی جاؤں گی، لیکن...... امی...... امی کا کیا ہوگا؟ یہ کہاں رہیں گی؟ نا جانے فیصل اور اس کی امی کو یہ بات گوارا ہوگی کہ نہیں کہ میری امی بھی ان کے ساتھ رہیں، لیکن پہلے بیٹوں کا فرض بنتا ہے کہ ماں کو اپنے ساتھ رکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ بیٹوں کے دلوں میں ماں کی محبت کسی کونے گوشے میں باقی ہو اور وہ انہیں ساتھ رکھنے پر آمادہ بھی ہوجائیں، لیکن عذرا بھابی اور فرزانہ بھابی کو یقیناً یہ نامنظور ہی ہوگا۔
مجھے خدشات و تفکرات کے آسیب نے گھیر لیا تھا۔ گھومتا ہوا دماغ رک نہیں رہا تھا، مجھے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر امی تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔
''مجھے پتا ہے تو میری فکر کررہی ہے، ارے...... میں تو رہ لوں گی کسی نہ کسی کے ساتھ...... اب زاہد اور حامد کوئی سوتیلے بیٹے تھوڑی ہیں میرے...... اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے...... وہ بھلا مجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیں گے...... اور پھر میری زندگی باقی ہی کتنی رہ گئی ہے...... کب تک اور جی لوں گی...... سال دو سال...... بس میں چاہتی ہوں کہ تو میرے سامنے اپنے میاں کے گھر چلی جائے۔ پھر میں سکون سے مرسکوں گی۔''
میں امی کے گلے لگ گئی۔ ''ایسی باتیں نہ کریں امی...... ابھی تو آپ نے بہت کچھ دیکھنا ہے۔''
امی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ پھر میں نے انہیں فیصل کی بات بتائی۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ گھر کے معاملات کو دیکھتے ہوئے راضی ہوگئیں۔
پھر چند روز بعد میں امی کو رکشے میں بٹھا کر فیصل کے گھر لے گئی۔ کبھی کبھی میں امی کو باہر بھی لے جاتی تھی اس لیے بھابیوں کو شک نہیں گزرا۔ پھر باقی معاملات بہ حسن و خوبی طے پا گئے۔ فیصل کی امی ایک نیک دل اور خدا ترس پڑھی لکھی خاتون تھیں، بڑی عزت اور محبت سے پیش آئیں۔
ادھر دونوں بھائی بڑی جاں فشانی اور تن دہی سے گھر بیچنے کے لیے دوڑیں لگا رہے تھے۔ چند روز بعد ہی پارٹیاں گھر دیکھنے آنے لگیں۔ گھر کافی بڑا اور کارنر کا تھا اس لیے کافی ویلیو تھی لیکن بھائیوں نے اس کی ہوش ربا ڈیمانڈ رکھی تھی۔
آخر ان کی محنت رنگ لے آئی اور ایک بلڈر نے مکان کا سودا کرلیا۔ وہ اسے بلڈوز کروا کر فلیٹ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بھائیوں کی ڈیمانڈ نوے فیصد پوری ہوگئی تھی۔ دونوں بڑے خوش اور پر جوش تھے۔ ان دونوں کے حصے میں لاکھوں کی رقم آئی تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنے لیے نئے گھر بھی دیکھ لیے تھے۔ ان دونوں نے ہم سے پوچھا بھی

نہیں کہ ہم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پھر ایک روز زاہد بھائی نے خاندان کے کچھ بزرگوں کو بلوایا اور ان کی موجودگی میں امی کے ہاتھ پر تین لاکھ روپے رکھ دیئے کہ یہ آپ کا اور سائرہ کا حصہ ہے۔ آپ دونوں اپنا بندوبست کرلیں۔ دو ہفتے بعد مکان کا قبضہ دینا ہے۔ امی گنگ رہ گئی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے اور امی کے حصے کے بہت کم پیسے دے رہے تھے اور انہوں نے مکان جتنے میں فروخت کیا تھا اس سے آدھی رقم ہی ہمیں بتائی تھی۔ میں ان سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔
پھر خاندان کے افراد کے سامنے زاہد بھائی اور حامد بھائی نے اعلان کردیا کہ اب ان کا سائرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ ماں کو وہ رکھ سکتے ہیں۔ سائرہ نے ان کی عزت خاک میں ملادی ہے، لہٰذا ایسی بہن سے وہ قطع تعلق کررہے ہیں۔
''اگر سائرہ سے رشتہ ختم کررہے ہو تو پھر میرا خیال بھی دل سے نکال دو۔'' امی نے غضب ناک ہوکر انہیں جواب دیا۔ ''نہیں رہنا مجھے تم دونوں میں سے کسی کے پاس...... میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہ لوں گی یا اکیلی رہ لوں گی۔ تم جیسی اولاد کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔''
''امی آپ خواہ مخواہ سائرہ کی حمایت لے رہی ہیں۔'' حامد بھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔
''وہ بیٹی ہے میری...... مگر میرا بیٹا بن کر رہی ہے...... تم دونوں نے کی ہے میری پروا...... جواب دو آگے کرو گے؟''
''ٹھیک ہے...... اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہیں تو آپ کی مرضی۔'' زاہد بھائی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں سب خاندان والوں کے سامنے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ کل کلاں کو ہمارے پاس کوئی روتا ہوا نہ آئے...... اگر آپ کو ہماری شکلیں اچھی نہیں لگتیں ہیں تو پھر یہ شکلیں دیکھنے مت آیئے گا۔''
''بے فکر رہیں بھائی جان۔'' میں نے مداخلت کی۔ ''وہ موقع کبھی نہیں آئے گا ان شاءاللہ۔''
حامد بھائی خاندان کے افراد کی طرف مڑے۔
''سن لیا آپ لوگوں نے بھی...... اب ہمارا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور امی ہم سے خود رشتہ ختم کرکے جارہی ہیں...... ہم نے ان کا جو حصہ بنا دے دیا...... ان کا جو بھی سامان ہے...... یہ لے جائیں۔''
''ہاں ہاں لے جائیں گے اپنا سامان۔'' امی نے ہاتھ جھلا کر کہا مگر ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ بڑا تکلیف دہ اور اذیت سے بھرا وقت تھا یہ۔ خاندان والے ٹکر ٹکر کبھی ہمیں اور کبھی بھائیوں کو دیکھ رہے تھے۔

❁......❁......❁

اس رات امی روتی رہی تھیں۔ دل تو میرا بھی بھرا ہوا تھا۔ بھائیوں سے ایک بہن کے لیے تو یہ توقع کی جاسکتی تھی لیکن بیٹوں کی حیثیت سے ان کا رویہ دل خراش تھا۔
فیصل نے چند روز بھاگ دوڑ کرکے ہمیں دو کمرے کا ایک مکان کرائے پر دلا دیا تھا۔ تین لاکھ میں تو کوئی مکان خریدا نہیں جاسکتا تھا۔ پھر اس میں ضروریات زندگی کی چیزیں بھی خرید کر ڈالی گئیں۔ مالک مکان کو پچاس ہزار کا ایڈوانس ادا کیا گیا۔ مالک مکان اچھا آدمی تھا لیکن اصولوں کا سخت پابند تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ تو یونہی خرچ ہوگئے۔ میں اور امی اپنا سامان لے آئے تھے۔
جس روز ہم اپنا سامان لا رہے تھے بھائیوں کے

بچے بہت اداس تھے۔ امی اور میرے دل بھی بھرے ہوئے تھے۔ بچوں کی صورتیں دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔

بچوں نے امی کی پرانی پیٹی میں سے سامان نکال لیا تھا۔ امی نے انہیں پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''رکھ لو...... یہ تم لوگ رکھ لو...... کھیلتے ہو نا تم ان چیزوں سے۔''

بچے چیزیں لے جانے لگے تو عذرا بھابی اور فرزانہ بھابی ایک ساتھ وہاں آ گئیں۔ فرزانہ بھابی نے اپنے بڑے بچے کو بری طرح ڈپٹ کر کہا تھا۔

''رکھو...... رکھو یہ...... دو انہیں...... اور جا کر صابن سے اچھی طرح ہاتھ دھوائیے......'' انہوں نے اپنے بیٹے کے ہاتھ سے امی کی پیتل کی چیزیں لے کر فرش پر ڈال دیں اور اپنے بچے کو زبردستی لے گئیں۔

عذرا بھابی نے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے پیتل والی موٹی چین لے کر پھینکی۔ بڑا شوق ہے تجھے فقیرنی بننے کا...... گندی سندی چیزوں سے بڑی محبت ہے......'' پھر امی اور میری طرف دیکھ کر بڑی نخوت سے بولیں۔ ''سنبھالیں اپنی یہ یادگار قیمتی چیزیں...... بہت کام آئیں گی...... ان پیتل کی چیزوں سے سائرہ کے زیور بنوا دینا۔'' ان کا لہجہ طنز کے زہر سے بجھا ہوا تھا۔

امی اور میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بدتمیز عورت تھی۔ اس کے منہ لگنے سے بہتر خاموش رہنا تھا۔ امی نے اپنا سامان بڑی حفاظت سے ساتھ رکھ لیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ امی اپنا پرانا سامان بیچ دیں، لیکن ان کی ناراضی کے خیال سے میں چپ رہی۔ انہوں نے یہ سامان برسوں سے سنبھالا ہوا تھا اب بھلا کیا فروخت کریں گی۔ وجہ صرف یہی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی دی ہوئی چیزوں کو مرتے دم تک ساتھ رکھنے کی خواہش مند تھیں۔ اس طرح میں اور امی اپنے کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ دونوں بھائیوں نے بھی اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔

❁......❁......❁

میری اور فیصل کی بات پکی ہو چکی تھی۔ امی نے تقریباً ایک سال کا وقت مانگا تھا اور اس پر بھی کہہ دیا تھا کہ جو میری بچی کے نصیب میں ہو گا وہی دے سکوں گی۔

فیصل نے کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کی تھی بلکہ اس بات پر سخت ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ وہ جہیز کے حق میں نہیں تھا۔ اس کی امی نے بھی یہی بات کی تھی۔

''بہن...... فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ہمیں بیٹی دے رہی ہیں ہمارے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔ ہمیں اور کوئی چیز نہیں چاہیے۔ لڑکی اپنا نصیب خود ساتھ لاتی ہے۔ اس کے نصیب میں دولت ہو گی تو اللہ ویسے ہی سب کچھ دے دے گا...... نہیں ہو گا، ہمیں تب بھی کوئی شکایت نہیں ہو گی...... مجھے دیکھو، بہن...... میں امیر گھرانے سے آئی تھی...... لیکن میرے نصیب میں پیسہ نہیں تھا...... بس ایسے ہی صبر شکر کر کے زندگی گزار دی۔ میری سب سے بڑی دولت میرا فیصل ہے۔ اور اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بہن جی......'' امی نے تشکرانہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''مگر ایک ماں کی حیثیت سے میں تھوڑا بہت تو اسے دے کر رخصت کروں گی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے...... ورنہ آج کل آپ جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔''

''بس تو پھر...... میں چاہتی ہوں کہ سائرہ جتنی جلدی ہو سکے...... میری بہو بن کر گھر آ جائے...... اور آپ بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔'' فیصل کی امی نے محبت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں آنٹی......'' اس موقع پر فیصل بول اٹھا۔ ''آپ بھلا اکیلے کیسے رہیں گی؟''

''رہ لوں گی بیٹا......'' امی نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔ ''اللہ میرے ساتھ ہے...... اتنی گزر گئی ہے بس اب جو باقی ہے وہ بھی اللہ کے سہارے گزار لوں گی۔''

''لیکن میں آپ کو اکیلے رہنے نہیں دوں گا۔ شادی کے فوراً بعد آپ بھی یہاں آ جائیں گی۔'' فیصل نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

امی نے اس بار جواب نہیں دیا تھا۔

دن گزرنے لگے...... میری جاب اچھی چل رہی تھی۔ میرے کام سے خوش ہو کر باس نے سیلری میں اچھا اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے فیصل سے کہہ دیا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی نوکری کرتی رہوں گی۔ اس طرح ایک سے دو آمدنی ہو گی اور ہم بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ آنے جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ ساتھ آیا جایا کریں گے۔ فیصل نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

میں اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ امی کو دیتی تھی اور تھوڑا اپنے خرچے کے لیے رکھتی تھی۔ امی میرے لیے کپڑے اور دیگر سامان جمع کر رہی تھیں۔ نئے محلے میں کئی عورتوں سے امی کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے امی نے محلے کے بچے اور بچیوں کو سپارہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح گھر میں رونق لگی رہتی تھی اور امی کا دن بھی آرام سے گزر جاتا تھا۔

ایک روز چھٹی والے روز میں نے دیکھا کہ امی نے اپنی پرانی پیٹی میں سے پیتل کا سامان نکالا اور صحن میں تخت پر رکھنے لگیں۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور امی سے پوچھا۔

''یہ کیوں نکال رہی ہیں امی؟''

''ارے پڑے پڑے سڑ رہے ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ انہیں بیچ دوں...... گلی میں پرانے برتن خریدنے والا آتا ہے روز...... آج آئے گا تو دے دوں گی...... پیتل کے بھاری برتن ہیں...... اچھے پیسے مل جائیں گے کم از کم تیرا ایک اچھا سا سوٹ ہی آ جائے گا۔'' امی نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

اتنے میں محلے میں رہنے والی نسیم خالہ گھر میں آ گئیں۔ انہوں نے برتن دیکھ کر امی سے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو بہن؟''

''بیچ رہی ہوں...... کیا کرنا ہے ان کا...... کسی کام ہی آ جائیں گے سائرہ کے۔'' امی نے برتن رکھنے کے بعد تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ نسیم خالہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ اور وہ برتنوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

''کافی پرانے لگتے ہیں...... ان پر کام بڑا اچھا ہوا ہے۔ کس کو بیچو گی؟'' نسیم خالہ نے پوچھا۔

''ارے کسے بیچنا ہے...... گلی میں پرانے برتن خریدنے والا آتا ہے اسے ہی دے دوں گی...... آج کل کون رکھتا ہے ایسے برتن۔'' امی نے عجیب سی نظروں سے برتنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

میں کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور وہاں کی کھڑکی سے انہیں دیکھ بھی رہی تھی۔ اتنے میں نسیم خالہ نے پیتل کی وہ بھاری چین اٹھا لی اور اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''یہ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی زیور ہے۔ یہ کہاں سے آیا تھا؟''

"میری والدہ نے شادی پر بہت سے برتن، زیور اور پتا نہیں کیا کیا دیا تھا۔ انہیں کے ساتھ یہ چین بھی تھی۔ ویسے یہ زیور تو نہیں ہے...... اس وقت تو زیادہ تر سونے کے زیور ہی ہوتے تھے...... پیتل کے زیور کہاں سے آ گئے۔" امی نے عام سے انداز میں بتایا۔

"مگر اس پر کام تو بڑا اچھا ہوا ہے۔ اس پر میل لگ گیا ہے اگر صاف کروا دیا جائے تو بالکل سونے کی طرح لگے گی۔" نسیم خالہ نے چین کو غور سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"اب کیا صاف کروانا اسے...... وہ میرے پوتے پوتیاں ہیں نا، انہوں نے میلا کر دیا تھا۔"

"ویسے ہو سکتا ہے کوئی سنار اسے خرید لے...... اس کا ڈیزائن اچھا ہے...... وہ تو کسی نہ کسی گاہک کو بیچ دے گا۔"

"اچھا...... تو پھر کس سنار کو دوں...... میں تو کسی کو نہیں جانتی۔" امی نے سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے مسکرا کر سر کو جھٹکا۔ مگر کوئی مداخلت نہ کی۔ کم از کم اس طرح امی کا دھیان پریشانیوں کی طرف سے ہٹا رہتا ہے۔

نسیم خالہ بول رہی تھیں۔ "اری ہے ایک میری جاننے والی۔ اس کا میاں سنار ہے...... بہت بڑی دکان ہے ان کی...... مولوی سا ہے...... نمازی پرہیزگار...... ایمان داری سے خرید لے گا...... میں اس کی بیوی کو بول دوں گی وہ آ کر لے جائے گی چین۔"

"ٹھیک ہے...... بتا دینا......" امی نے حامی بھر لی۔

❀ ❀ ❀

"تمہارے دونوں بھائیوں کے تو حالات اچانک ہی خراب ہو گئے ہیں۔" فیصل نے آفس میں لنچ ٹائم پر بتایا۔

کھانا کھاتے کھاتے میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟ حالات کیسے خراب ہو گئے؟"

"پتا لگا ہے ایک دوست سے۔" فیصل نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہارے پرانے محلے میں ہی رہتا ہے۔ اس نے کل بتایا تھا رات کو......"

"مگر ہوا کیا ہے کچھ پتا تو چلے؟" میں نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا۔

"بڑے بھائی ہیں نا تمہارے...... زاہد بھائی...... ان کی دکان میں ڈکیتی پڑ گئی تھی۔ اتفاق سے اس روز ریکوری کا بہت بڑا کیش تھا جو انہیں آگے بھی دینا تھا۔ سب لے گئے ڈاکو...... سب کا یہی کہنا تھا کہ کسی قریبی آدمی نے مخبری کی تھی...... ورنہ ڈاکوؤں کو کیا پتا کہ اس روز اتنا کیش آیا ہوا ہے۔ تمہارے بھائی کی تو کمر ہی ٹوٹ کر رہ گئی۔ جو مال خریدا تھا اس کی پے منٹ ابھی باقی ہے۔ اور پاس پلے رقم نہیں ہے۔ اللہ رحم کرے ان پر۔" فیصل نے کہہ کر پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"اور...... اور حامد بھائی......؟" میں نے کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔

"ان کی دکان میں شارٹ سرکٹ کی وجہ سے آگ لگ گئی...... سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا...... فرنیچر تک راکھ ہو گیا ہے۔ وہ تو ایک رات میں ہی سڑک پر آ گئے ہیں۔" فیصل سر جھکائے بتا رہا تھا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں ماں بیٹی کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا تھا، اس کی سزا اتنی جلدی انہیں مل جائے گی، ایسا میں نے

سوچا تک نہ تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہرگز نہیں تھی بلکہ کافی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جیسے بھی تھے میرے بھائی تھے۔ میں بھلا ان کی مشکلات پر کیسے خوش ہو سکتی تھی۔

"کیا ہوا...... ہاتھ کیوں کھینچ لیے تم نے......" فیصل نے پلیٹوں کی جانب اشارہ کیا...... "یہ باقی کھانا کون کھائے گا؟"

"بس میں نے کھا لیا۔" میرا دل بجھ سا گیا تھا۔

"افسوس تو مجھے بھی ہے سائرہ...... مگر ہم افسوس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔" فیصل نے ہلکی آواز میں کہا پھر گھڑی دیکھ کر عجلت آمیز لہجے میں بولا۔ "چلو اب فٹافٹ یہ سب ختم کرو...... ٹائم کم رہ گیا ہے۔"

میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور دھیرے دھیرے منہ چلانے لگی۔

❀ ❀ ❀

تیسرے روز میں آفس سے گھر پہنچی تو خاصی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ امی نے میرے لیے کھانا نکال دیا۔ انہوں نے بھی نہیں کھایا تھا حالانکہ میں نے انہیں کہا ہوا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا کریں اور کھانا کھا لیا کریں۔ مجھے دیر بھی ہو جاتی ہے۔ مگر وہ مسکرا کر میری بات سنی ان سنی کر دیتی تھیں۔

میں نے امی کو بھائیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا وہ بلاوجہ پریشان ہو جاتیں اور ہو سکتا ہے کہ ان سے ملنے کے لیے چلی جاتیں۔ بھائیوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن بھابیوں سے کوئی بعید نہیں کہ وہ امی کو گھر میں ہی نہیں گھسنے دیں۔ یہ سوچ کر شاید وہ کچھ مانگنے آئی ہیں۔

مگر کھانا کھاتے ہوئے امی نے بتایا۔

"بیٹا...... حامد اور زاہد بہت پریشان ہیں آج کل...... بڑی مصیبتیں ٹوٹ پڑی ہیں ان پر۔"

امی کے منہ سے یہ بات سنتے ہی میں چونک اٹھی۔ ابھی میں جس بات کے بارے میں سوچ رہی تھی وہ بات امی نے کہہ دی تھی۔

"مگر امی......" میں نے اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال لیا۔ "مگر آپ کو کیسے پتا لگی یہ بات...... کس نے بتائی؟"

"آج مارکیٹ گئی تھی سودا لینے...... وہاں انصاری صاحب ملے تھے جو پرانے محلے میں رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا۔" امی خاصی دل گرفتہ دکھائی دے رہی تھیں۔

"مجھے بھی معلوم ہے امی......" میں نے بتایا۔

"لیکن بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں ان کے لیے۔"

"تسلی تو دے سکتے ہیں...... دعا کر سکتے ہیں ان کی بہتری کے لیے۔" امی نے تفکرانہ لہجے میں کہا۔ "پھر میں گئی تھی زاہد کے گھر۔"

"بھائی جان کے گھر گئی تھیں آپ؟" میں ایک دم چونک پڑی۔

"ہاں بیٹا...... ماں ہوں نا...... رہا نہیں گیا مجھ سے۔" امی نے بے چارگی سے کہا۔ "مگر...... مگر وہ......" انہوں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں کھانا بھول گئی تھی۔ "مگر کیا امی؟"

"عذرا نے مجھے گھر میں آنے ہی نہیں دیا...... دروازے سے ہی لوٹا دیا کہ آپ کا بیٹا نہیں ہے گھر میں...... اور ویسے بھی اب آپ لوگوں کا ہم سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کچھ لینے نہیں...... صرف ملنے آئی ہوں مگر اس نے دروازہ ہی بند کر لیا۔ چھوٹی بہو کے پاس جانا بے کار تھا...... وہ بھی ایسا ہی سلوک کرتی...... بس میں اپنا سا منہ

لے کر لوٹ آئی۔" امی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی۔" میں نے ان کے ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا۔

"ماں ہوں نا بیٹا...... دل نہیں مانا۔"

"وہ بھی تو بیٹے ہیں...... ان کا دل کیسے مان گیا...... چھوڑیں امی...... ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔" میں نے ان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی بڑی عجلت میں دستک دے رہا ہو۔ امی اٹھنے لگیں تو میں نے انہیں روک دیا۔

"آپ رکیں امی...... میں دیکھتی ہوں۔"

میں کمرے سے نکل کر دروازے کی جانب بڑھی۔

"کون ہے؟"

باہر سے کسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو بیٹا...... میں ہوں رضوانہ...... بیٹا امی ہیں گھر میں؟"

"جی ہیں......" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک برقع پوش خاتون کھڑی تھیں۔ میں نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میری سوالیہ نظروں کا مفہوم سمجھ کر خاتون نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "امی کہاں ہیں بیٹا؟"

"اندر ہیں۔" میں نے انہیں سرتاپا دیکھا۔ "مگر میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"ارے...... رضوانہ بہن...... آجاؤ...... آجاؤ اندر......" میرے عقب سے امی کی آواز آئی۔

میں نے راستہ چھوڑ دیا۔ رضوانہ نامی خاتون اندر داخل ہوگئیں۔ امی انہیں لے کر کمرے میں جابیٹھیں۔ میں دروازہ بند کرکے آگئی۔ امی نے مجھے بتایا۔ "سائرہ ان کو نسیم خالہ نے ملوایا تھا۔ ان کے شوہر سنار ہیں۔ میں نے انہیں چین دی تھی بیچنے کے لیے۔" پھر امی نے رضوانہ خاتون سے دریافت کیا۔ "کیا ہوا اس کا رضوانہ بہن...... دکھائی بھائی صاحب کو؟"

رضوانہ خاتون نے جواب دینے کے بجائے برقع میں چھپایا ہوا پرس نکالا اور پھر پرس کھول کر چین امی کے سامنے رکھ دی۔ "ہاں دکھادی تھی۔"

"کیا بولا انہوں نے؟" چین کو واپس کرتے دیکھ کر امی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ "منع کردیا کیا خریدنے سے؟"

"ہاں......" رضوانہ خاتون نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "کیونکہ یہ چین...... پیتل کی نہیں...... خالص سونے کی ہے۔"

مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رضوانہ خاتون کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی چین کو۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو رضوانہ بہن......؟"

امی کی آواز میں غضب کی لرزش تھی۔ مجھے ان کے بدن میں رعشہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہلکی سی برقی رو ان کے جسم میں سے گزر رہی ہے۔

میں سچ بول رہی ہوں بہن۔" رضوانہ خاتون نے اس بار سنبھل کر جمے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "میں بھی اسے پیتل کا سمجھ کر لے گئی تھی۔ جب انہوں نے اچھی طرح پرکھ کر دیکھا اور بتایا کہ یہ تو خالص سونے کی چین ہے اور اس کا وزن ایک کلو کے لگ بھگ ہے تو میرے قدموں تلے زمین ہی نکل گئی تھی۔ میں جب تم سے یہ لے کر گئی تھی تو ایسے ہی پرس میں ڈال کر بے فکری سے لے گئی تھی۔ مگر لاتے وقت تو میری جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی کہ کوئی چھینا

تو نہیں کر رہا ہے۔ کوئی چھین نہ لے۔ یہ میں تمہاری امانت دینے آئی ہوں۔ سنبھال لو اسے۔"

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ میں ٹکٹکی باندھے اس چین کو دیکھ رہی تھی جسے میں اپنے بچپن سے دیکھتی آرہی تھی۔ اسے امی نے ایسے ہی پیتل کی سمجھ کر بے پروائی سے پیٹی میں ڈالا ہوا تھا۔ اس سے بھائیوں کے بچے بھی کھیلتے رہے تھے مگر کبھی کسی کو شائبہ تک نہ ہوا کہ وہ چین پیتل کی نہیں سونے کی ہے۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ میرے نانا نے امی کو بہت کچھ دیا تھا بہت سا زیور دیا تھا ان میں یہ سونے کی چین بھی دی تھی اور یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی ہوگی کہ یہ سونے کی چین ہے۔ لہٰذا امی کو کبھی علم نہ ہوسکا۔ اتنے برسوں کے گزر جانے کے بعد آج معلوم ہوا تھا اس حقیقت کا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسے ایسے ذرائع سے نوازتا ہے جہاں اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اب جب کہ امی میری شادی کے لیے پریشان تھیں اور تنکا تنکا جمع کررہی تھیں تو قدرت نے انہیں ایسے نواز دیا تھا کہ عقل حق دق رہ گئی تھی۔

ساتھ ہی مجھے رضوانہ خاتون اور ان کے شوہر کی ایمان داری نے قائل کردیا کہ ابھی دنیا میں اچھے لوگ کم نہیں ہوئے۔ وہ چاہتے تو چین رکھ لیتے اور پیتل کے وزن کی قیمت امی کو دے دیتے بھلا امی کو کیا پتا چلتا وہ تو ویسے بھی پیتل ہی بیچ رہی تھیں۔

"بہن...... تم یہ لے جاؤ...... اپنے میاں سے بولو کہ اسے بیچ دے۔" امی کی لرزاں آواز نے سکوت توڑا۔

"وہ بتا رہے تھے کہ اس سونے کی مالیت پچاس ساٹھ لاکھ ہوگی۔ خالص سونا ہے آسانی سے بک جائے گا۔" رضوانہ خاتون نے بتایا۔

"ہاں تو بیچ دو...... اور بھائی صاحب اپنی محنت کا جو رکھنا چاہیں رکھ لیں۔" امی نے اب خود کو سنبھال لیا تھا۔ رضوانہ خاتون نے سر ہلا کر چین دوبارہ اپنے پرس میں ڈال لی۔

❁......❁......❁

اب میری اور فیصل کی شادی ہوچکی ہے۔ امی نے شادی پر دل کے تمام ارمان پورے کیے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ زاہد بھائی اور حامد بھائی کو بھی شادی میں بلوائیں۔ مگر میں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ دونوں بھائیوں نے خاندان والوں کے سامنے مجھ سے قطع تعلق کا باقاعدہ اعلان کردیا تھا لہٰذا میں نہیں چاہتی تھی کہ بھائی یا بھابیاں امی کو کچھ کہیں۔ پہلے بھی بڑی بھابی نے امی کو گھر میں آنے نہیں دیا تھا اور دروازے سے لوٹا دیا تھا۔

شادی کے بعد میں نے اور فیصل نے بڑا سا گھر خرید لیا تھا۔ فیصل اور اس کی امی نے اپنا گھر فروخت کردیا تھا اور پیسے ملا کر بڑا گھر خریدا تھا۔ امی اب ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ اب ان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہوگئی ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے بھائیوں اور بھابیوں کو ہمارے بدلے ہوئے حالات کا علم ہوگیا ہے اور اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ عذرا بھابی کی آنکھوں میں وہ چین بار بار گھوم رہی ہوگی جو بارہا انہوں نے اپنے بچوں کے ہاتھوں سے چھین کر امی کو دی تھی۔ اب وہ لوگ اپنی غرض سے ہمارے پاس آنا چاہیں بھی تو اپنی انا کی وجہ سے نہیں آئیں گے۔ بس اب وہ باقی تمام عمر پچھتاوے کے ساتھ گزار دیں گے۔

❁

قسط نمبر 3

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹھاٹھ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادو گر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔
زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

''تم اجنبی دکھائی دیتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو برخوردار؟''

بوڑھے کی اردو بڑی صاف تھی۔ میں نے وہی کہانی دہرادی کہ اپنے ایک شکاری دوست سے ملنے آیا تھا۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ وہ یہاں سے جا چکا ہے۔

''کھانا کھایا تم نے؟''

''جی ہاں...... بازار سے کھالیا تھا۔'

بوڑھے نے ناریل کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''ہندوؤں کا جھٹکا کھایا ہوگا۔ اسلام میں جھٹکے گوشت حرام ہے۔''

میں نے فوراً کہا۔

''جی نہیں' میں نے سبزی کھائی تھی۔''

بوڑھے نے کہا۔

''واپس چاردھا جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ پھر بیل گاڑی نہیں ملے گی۔''

میں نے اس مسلمان بوڑھے سے جان بوجھ کر ہندو مندروں کے پجاریوں کی مسلم دشمنی کی باتیں شروع کر دیں۔ بوڑھا کہنے لگا۔

''برخوردار! اس قصبے بیروگڑھ میں صرف میں ہی ایک مسلمان ہوں۔ اپنے بزرگوں کے مزار پر ان کی امانت لیے بیٹھا ہوں۔ ہندو یہاں مجھے بھی طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ ساتھ والے گاؤں سے مسلمان نذرانے چڑھانے آتے ہیں تو ہندو انہیں بھگا دیتے ہیں۔''

جب مجھے پوری طرح تسلی ہوگئی کہ بڑے میاں پر اعتبار کیا جاسکتا ہے تو میں نے اصل کہانی کھول کر بیان کردی۔ بوڑھے نے ناریل جھونپڑی کے بانس کے ساتھ لگا دیا اور اپنا جھریوں بھرا چہرہ میری طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم بڑا نیک کام کرو گے۔ پٹیل بڑا بدمعاش بدکار ہے۔ میں اگر جوان ہوتا تو ابھی اسے جا کر قتل کر ڈالتا۔''

میں نے کہا۔

''بابا جان! کوئی ایسی ترکیب کریں کہ اگر عائشہ نام کی لڑکی پٹیل کے گھر میں ہے تو اسے یہ خبر ہو جائے کہ میں اسے لینے یہاں آ گیا ہوں۔''

بڑے میاں بولے۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ پٹیل کے گھر جو گھاٹن عورت کپڑے وغیرہ دھونے کا کام کرتی ہے وہ ہے تو ہندو مگر میری بڑی مریدنی ہے۔ میں اس سے جاسوسی کرواتا ہوں۔ اس کا بیٹا پیچھے کھیتوں میں کام کرتا ہوگا۔ میں اسے بھیج کر اس کی ماں کو ابھی بلوا لیتا ہوں۔ تم یہاں بیٹھو۔ ہاں میں گھاٹن کے ساتھ واپس آؤں تو تم مزار کے پیچھے چھپ جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں یہاں دیکھے۔''

یہ کہہ کر بڑے میاں اٹھ کر جھونپڑی کے پیچھے کھیتوں کی طرف چل دیئے۔ میں مزار سے ہٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے وہ کھیتوں میں جاتے نظر آرہے تھے۔ کھیتوں میں فصل کاٹی جارہی تھی۔ ایک جگہ دو تین کسان کام کررہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا بڑے میاں کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے پھر بڑے میاں اس لڑکے کو ساتھ لیے گاؤں کی طرف چل دیئے۔ میں وہیں درخت کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ جب بور ہوگیا تو اٹھ کر درختوں کے پیچھے آ گیا۔ یہاں چھوٹا سا تالاب تھا جس میں جھاڑ جھنکار پڑا تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ میں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کہاں میں پنجاب سے نکل کر بمبئی سیر کرنے جارہا تھا اور حالات مجھے کہاں سے کہاں لے آئے ہیں لیکن میں ایڈونچر ضرور محسوس کررہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو میری نوجوانی کی عمر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے بھی میں برما اور لنکا کے جنگلوں میں گھوم پھر چکا تھا۔

اچانک مجھے وہی سیندور کی بو محسوس ہوئی جو پہلی بار مندر والی کوٹھڑی میں بارش کی رات آئی تھی۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ یہ کسی جنگلی جڑی بوٹی کی بو ہوگی لیکن جب بو تیز ہوتی گئی تو میں گھبرا کر تالاب کی سیڑھیوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے ہی میں پلٹ کر واپس مزار کی طرف جانے لگا ایک پھنکار سنائی دی اور میں نے اپنے سامنے جو کچھ دیکھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔

......☆☆☆......

مجھ سے کوئی چار قدم کے فاصلے پر ایک کالا سیاہ ناگ پھن اٹھائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

خوف سے مجھے پسینہ آ گیا۔ کالا ناگ بار بار منہ سے سرخ دوشاخہ زبان باہر نکال رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف کھسکتا چلا آرہا تھا۔ درخت پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ اچانک شور مچاتا ہوا پھڑ پھڑا کر اڑا۔ سانپ نے جلدی سے پھن سمیٹا اور جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں اس قدر خوف زدہ ہوگیا تھا کہ تھوڑی دیر تک وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ پھر دوڑ کر مزار کی طرف آ گیا۔ مجھے کھیتوں کی طرف سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ مزار کا بزرگ ایک آدمی سے باتیں کرتا مزار کی طرف چلا آرہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ وہ آدمی جس سے بڑے میاں باتیں کررہے تھے تالاب کے پاس آ کر ان سے جدا ہوگیا۔ اب بڑے میاں اکیلے چلے آ رہے تھے۔ میں پھر بھی درخت کی اوٹ سے باہر نہ نکلا۔ جھونپڑی کے پاس آ کر انہوں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور مجھے آواز دی۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر ان کے پاس آ گیا۔

''یہاں بیٹھ جاؤ۔''

میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ میں ان کی زبان سے یہ خوش خبری سننے کو بے تاب تھا کہ عائشہ پٹیل کے گھر پر ہی ہے۔ بڑے میاں نے تھیلی میں سے

بیڑی نکال کر سلگائی اور کہنے لگے۔
"ایک بات کا تو ثبوت مل گیا ہے کہ مسلمان لڑکی پٹیل کے پاس ہی ہے مگر وہ اس کے گھر میں نہیں ہے۔ میں پٹیل کے گھر سے گھاٹن کو باہر بلا کر ایک طرف لے گیا تھا۔ میں نے اس سے ساری باتیں معلوم کرلی ہیں۔ لڑکی کا نام عائشہ ہی ہے۔ مگر وہ پٹیل کے گھر میں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟" میں نے ناامید ہو کر پوچھا۔
بڑے میاں کہنے لگے۔

"یہ بات میری مریدنی یعنی گھاٹن کو بھی معلوم نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پٹیل نے اسے کسی جگہ رکھا ہوا ہے۔ وہ کسی روز گھر سے شہر جاتا ہے اور دوسرے دن واپس آتا ہے۔ ضرور وہ وہیں جاتا ہے جہاں اس نے لڑکی کو چھپایا ہوا ہے۔"

میں نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ بڑے میاں کہنے لگے۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میری مریدنی بڑی ہوشیار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پٹیل کی دکان پر اس کا ایک خاص ملازم ہے اس ملازم کو سب معلوم ہے کہ لڑکی کو پٹیل نے کہاں رکھا ہے۔ گھاٹن نے کہا ہے کہ وہ اس ملازم سے یہ راز معلوم کر کے آج رات کو مزار پر آئے گی۔"

تھوڑی دیر بعد شام ہوگئی۔ بادلوں کی وجہ سے جلدی اندھیرا ہوگیا۔ مزار پر بڑے میاں نے چراغ جلا دیئے۔ جھونپڑی میں بھی لالٹین روشن ہوگئی۔ خدا جانے کہاں سے ایک آدمی کھانا لے کر آ گیا۔ میں نے اور بڑے میاں نے جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جھونپڑی کے اندر بانس کی چارپائی پر بڑے میاں کا میلا سا بستر پہلے سے لگا ہوا تھا۔ انہوں نے بستر میں سے ایک دری نکال کر فرش پر بچھا دی اور ایک چادر تکیہ دے کر کہا۔

"میاں تم یہاں سو جاؤ۔"
میں نے پوچھا۔
"گھاٹن کس وقت آئے گی؟"
مجھے اسی کی فکر لگی تھی۔ بڑے میاں نے کہا۔
"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر اس نے پٹیل کے ملازم سے راز اگلوا لیا تو آ جائے گی نہیں تو بات کل پر جا پڑے گی۔"

میں سخت مایوسی کے عالم میں دری پر گھٹنے بانہوں میں لے کر بیٹھ گیا۔ بڑے میاں اٹھ کر مزار کی طرف چلے گئے۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ گھاٹن نہیں آئے گی۔ پٹیل کا ملازم اسے کبھی یہ راز نہیں بتائے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گھاٹن کے ساتھ پٹیل کے ملازم کے ایسے مراسم ہیں کہ وہ اس کے آگے انکار کر ہی نہیں سکتا۔

رات کو ہوا بند تھی، حبس سا ہو رہا تھا۔ بادلوں نے ایک گھٹن سی پیدا کر دی تھی۔ مجھے بہت تنگ کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے جھونپڑی کے باہر دھونی لگا دی۔ اس سے مچھروں کی طرف سے تھوڑا آرام ہوگیا۔ میں کچھ دیر مزار کے پاس یونہی بیٹھا رہا۔ بڑے میاں بھی وہیں بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔ جب بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگا تو اٹھ کر جھونپڑی کے اندر چلا آیا۔ جھونپڑی میں بڑا حبس تھا۔ مگر میں کیا کرتا۔ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ گھاٹن کا انتظار تھا مگر اس کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آخر میں نے دل میں یہی سوچ لیا کہ صبح اٹھ کر پٹیل کے ملازم کا سراغ لگاؤں گا اور خود ہی اس سے یہ راز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ پٹیل نے عائشہ کو کہاں چھپایا ہوا ہے۔

لیٹے لیٹے کبھی مجھ پر غنودگی سی طاری ہو جاتی اور

کبھی کوئی مچھر کاٹتا تو میں بیدار ہو جاتا۔ جانے کتنی رات گزر چکی تھی۔ بڑے میاں ابھی تک باہر مزار پر ہی تھے۔ باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیرو گڑھ گاؤں کی طرف سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اتنے میں مجھے باتیں کرنے کی مدھم سی آواز آئی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جھونپڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ باتیں کرنے کی آواز جھونپڑی کے قریب آئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے میاں کسی عورت سے باتیں کر رہے تھے۔ عورت کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ میں جھونپڑی سے باہر جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ بڑے میاں ایک عورت کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کی موٹی تازی عورت تھی جس نے لال بارڈر والی کالی ساڑھی اس طرح پہن رکھی تھی کہ ساڑھی کا ایک پلو لنگوٹ کی طرح پیچھے کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ یہ مہاراشٹر کی دیہاتی مراٹھی عورتوں کا خاص پہناوا ہے۔ اس قسم کی ساڑھیوں والی مراٹھی گھاٹنیں بمبئی کی لوکل ریل گاڑیوں میں موسمبیاں اور کیلے وغیرہ بیچتی بھی نظر آتی ہیں۔ یہ پٹیل کے گھر میں کام کرنے والی گھاٹن تھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں اور ناک میں بڑا سا لونگ پہنا ہوا تھا جس کا شیشہ لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

بڑے میاں کی یہ گھاٹن مریدنی عائشہ کے بارے میں پوری معلومات لے کر آئی تھی۔ اسے پٹیل کے ملازم سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اس بدمعاش پٹیل نے عائشہ کو واقعی گنگولی پجاری سے خریدا تھا اور بیرو گڑھ گاؤں سے شمال کی جانب وہاں سے تیس میل دور نانندہ کے دشوار گزار گھنے جنگل میں چھپا رکھا تھا جہاں پٹیل کے کوئلے کے بھٹے تھے۔ ان بھٹوں میں لکڑی جلا کر کچا کوئلہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اس کا لاکھوں کا کاروبار تھا اور وہ مدھیہ پردیش کے شہروں میں کوئلہ سپلائی کرتا تھا۔ جنگل میں ایک جگہ رکھالی ندی کے کنارے پٹیل نے اپنے لیے ایک پکی چار دیواری والی کوٹھڑی بنوا رکھی تھی۔ پٹیل مہینے میں دو ایک بار جنگل میں اپنے بھٹوں پر آتا تو اسی کوٹھڑی میں قیام کرتا۔ گھاٹن نے بتایا کہ پٹیل نے عائشہ کو وہیں رکھا ہوا ہے اور پٹیل کی عدم موجودگی میں اس کے ہٹے کٹے جرائم پیشہ ملازم لڑکی کی رکھوالی کرتے ہیں اور ان کے پاس بندوقیں بھی ہوتی ہیں۔ جب گھاٹن ساری باتیں بیان کر چکی تو بڑے میاں نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"برخوردار! تمہیں سارے حالات کا علم ہو گیا ہے اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں تو تمہیں مشورہ دوں گا کہ جلدی میں قدم نہ اٹھاؤ۔ تم اکیلے اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکتے۔"

میں نے کہا۔
"جناب میں تو اکیلا ہی ہوں۔ مجھے کہیں سے کسی کی مدد ملنے کی بھی امید نہیں ہے۔ یہ کام تو مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

گھاٹن بھی بیڑی پی رہی تھی۔ کہنے لگی۔
"سیٹھ ابھی پرسوں ہی جنگل کے بھٹوں کا پھیرا لگا کر واپس آیا ہے۔ اب وہ تین چار دن بعد دوبارہ جائے گا۔ جب وہ وہاں ہوتا ہے تو اس کے بدمعاش ملازم بندوقیں لیے سوروں کی طرح کوٹھڑی کے آس پاس جنگل میں پہرے پر ہوتے ہیں۔ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں لڑکی کو نکال لے جانے کا موقع مل جائے مگر تم اکیلے اتنے گھنے جنگل میں کیسے جاؤ گے؟ رات کو سنا ہے وہاں شیر آ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔"

گھاٹن نے بزرگ بڑے میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بابا! اب میں جاتی ہوں۔ میں نے آپ کا حکم پورا کر دیا ہے۔ میرے لیے اپنے بھگوان سے پرارتھنا ضرور کرنا۔ میرا مالک روز تاڑی پی کر آتا ہے اور مجھے بڑا مارتا ہے.....''

گھاٹن نے بیڑی کا گہرا کش لگا کر اس کا دھواں اپنے نتھنوں سے نکالتے ہوئے مجھے ایک بار پھر جنگل میں پٹیل کے بھٹوں کا سارا نقشہ اچھی طرح سمجھایا اور یہ بھی بتایا کہ بیروگڑھ سے مجھے کس طرف جانا ہوگا اور پھر نانده کا جنگل شمال میں تیس میل کے فاصلے پر کس جگہ سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ساری باتیں ذہن میں اچھی طرح سے بٹھالیں۔ جب وہ بڑے میاں کے گھٹنوں پر ہندوؤں کی طرح اپنا ماتھا ٹیک کر چلی گئی تو انہوں نے نئی بیڑی سلگائی اور مجھ سے پوچھا۔

''بتاؤ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میاں جی! میں تو عائشہ کو بدمعاشوں سے چھڑانے اور اس کے ماں باپ کے پاس واپس لانے کا ارادہ بنا کر بمبئی سے نکلا ہوں میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

بڑے میاں پر میرے پختہ عزم کا بہت اثر ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

''برخوردار! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ مجھے یقین ہے تم انشاء اللہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگے۔ اب سو جاؤ۔ صبح صبح بیروگڑھ سے نانده کی طرف بیل گاڑیاں جاتی ہیں میں تمہیں جگا دوں گا۔''

میں وہیں دری پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے وسائل کچھ بھی نہیں تھے۔ بس صرف ایک اللہ کا بھروسہ تھا اور اسی مالک کے بھروسے پر میں ایک مسلمان لڑکی کو کافروں سے چھڑانے کے لیے بمبئی سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک چاقو تھا جس سے میں جھاڑیاں اور درختوں کی بڑھی ہوئی شاخیں ہی کاٹ سکتا تھا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفل چلانی مجھے رام دلاری نے جنگل میں ٹھاکر ڈاکو کے ڈیرے پر سکھا دی تھی۔ مگر میرے پاس کوئی رائفل بھی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں انہی خیالوں میں الجھا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب بڑے میاں مجھے شانے سے ہلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''اٹھو میاں، تمہارے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

میں جلدی سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ بادلوں میں سے طلوع صبح سے پہلے کی دھندلی سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ بڑے میاں نے چولہے پر میرے لیے چائے تیار کر رکھی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بڑے میاں کے ساتھ خالی بن کھایا چائے پی۔ بڑے میاں نے اپنی گٹھلی میں سے دس روپے نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔''

میرے پاس کچھ روپے تھے لیکن میں نے بڑے میاں سے دس روپے بھی شکریے کے ساتھ لے لیے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گاؤں کے دوسرے کنارے ایک جگہ پر آئے جہاں پہلے سے تین چار دیہاتی مرد اور دو عورتیں گٹھڑیاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔

ایک آدمی چھکڑے کے آگے بیل جوت رہا تھا۔ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ بڑے میاں ذرا پیچھے ہی رک گئے اور کہا۔

''یہ بیل گاڑی تمہیں نانده گاؤں کے کنارے تک لے جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں۔ جاؤ خدا تمہیں کامیاب کرے۔''

یہ کہہ کر بڑے میاں وہیں سے واپس چل دیئے۔

تھوڑی دیر بعد میں بیل گاڑی میں دوسرے دیہاتی مسافروں کے ساتھ بیٹھا تھا اور گاڑی بیروگڑھ کی سرحد سے نکل کر کھیتوں کے درمیان ہچکولے کھاتی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ گاڑی بان نے مجھ سے تین روپے کرایہ لیا تھا۔ ایک بوڑھا دیہاتی مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں نانده کس کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔ نانده کے جنگل میں میرا ماموں فاریسٹ آفیسر ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔

دوسرے دیہاتیوں پر بھی میرا رعب سا بیٹھ گیا۔ گاڑی بان نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا اور کہا۔

''بابوجی نے تمہارے لیے گھوڑا کیوں نہیں بھیجا۔ جنگل کے تو جمعداروں کے پاس بھی گھوڑے ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ماموں کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے۔''

اس کے بعد کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ بیل گاڑی کھیتوں میں سے نکل کر گھاس کے ایک ویران میدان میں سے گزرنے لگی۔ پھر ایک ندی کا پل آ گیا۔ اس کے بعد پھر دھان اور مکئی کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت تک دن نکل آیا تھا مگر چونکہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اس لیے دھوپ نہیں نکلی تھی۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی بان اور دوسرے دیہاتی بیڑیاں پی رہے تھے۔ دونوں دیہاتی عورتیں بیل گاڑی کے بانسوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھیں۔ کھیت ختم ہوئے تو پتھر کی چٹانیں شروع ہو گئیں۔ ان چٹانوں پر سبز رنگ کی کائی جمی ہوئی تھی۔ کوئی چٹان چھوٹی تھی کوئی بڑی تھی۔ یہاں زمین پر پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان پتھروں کے درمیان بیل گاڑیوں کے واسطے راستہ بنا ہوا تھا۔ سارا راستہ سنسان تھا۔ گاڑی بان دیہاتی بولی میں کوئی لوک گیت گانے لگا۔ بیل گاڑی سست رفتار سے جا رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر کسی چٹان کے پیچھے سے اچانک کوئی شیر یا چیتا نکل کر حملہ کر دے تو وہاں کہرام برپا ہو سکتا تھا۔ درندہ ایک آدھ مسافر کو تو ضرور اٹھا کر لے جائے گا۔ شاید اسی خوف کو دور کرنے کے لیے گاڑی بان گانے لگا تھا۔

چٹانیں ختم ہو گئیں۔ بیل گاڑی اب اونچے نیچے نیم پہاڑی راستے پر چلی جا رہی تھی۔ کہیں درختوں کے جھنڈ آ جاتے۔ کہیں چٹیل میدان آ جاتا۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ ان کے نیچے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ بیل گاڑی ایک نپی تلی رفتار کے ساتھ تھوڑے تھوڑے ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ دوسرے مسافروں کی طرح مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں کبھی سوجاتا، کبھی اچانک بیدار ہو کر ماحول کا جائزہ لینے لگتا۔ ایک بار کچھ زیادہ دیر تک ہی غنودگی کے عالم میں رہا۔ گاڑی کو دھچکا لگا تو میں بیدار ہو گیا۔ گاڑی ایک جھیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ذرا آگے جا کر جنگل کے باسیوں کا چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں والا گاؤں آ گیا۔

بیل گاڑی رک گئی۔ گاڑی بان نے کہا۔

''یہاں جل پانی کر کے آگے جائیں گے۔''

بیروگڑھ سے نانده گاؤں کی طرف بیل گاڑیاں اسی گاؤں میں سے ہو کر جاتی ہیں۔ جنگل کے

باسیوں نے ایک جھونپڑی میں مسافروں کے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا ہوتا تھا۔ گاڑی کے بیل کھول دیئے گئے۔ دوسرے دیہاتیوں کے پاس بیٹھ کر میں نے بھی جل پانی کیا۔ جل پانی یہ تھا کہ کیلے کے پتے پر کھچڑی سی ڈال کر میرے آگے زمین پر رکھ دی گئی۔ کھچڑی میں مرچیں بہت تھیں مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ مٹی کے کٹورے میں سے پانی پی پی کر میں کھچڑی کھاتا اور خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

دو پہر ہو چکی تھی۔ گاڑی بان نے یہاں ایک گھنٹہ لگا دیا۔ ایک گھنٹے کے بعد گاڑی کے آگے بیل جوتے گئے اور ہم ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کسی وقت مجھے خیال آتا کہ میں چندر گپتا کے زمانے میں آ گیا ہوں۔ ماڈرن زمانے کی کوئی نشانی راستے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بہت جلد مجھے ماڈرن زمانے کی نشانی ریلوے لائن کا سگنل دکھائی دیا اور میں قدیم زمانے سے نکل کر جدید زمانے میں آ گیا۔ یہ سگنل ریلوے لائن کے ساتھ لگا تھا۔ وہاں ایک ریلوے کراسنگ بھی تھی۔ بیل گاڑی ریلوے لائن کے اوپر سے گزری تو میں نے دیکھا کہ ریل کی پٹڑی دور تک چلی گئی تھی۔ شاید وہ یہ کوئی برانچ لائن تھی یا ہو سکتا ہے مین لائن ہی ہو۔ میں نے ریلوے لائن کے بارے میں کسی دیہاتی سے کچھ نہ پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ایک بات پوچھنے پر دیہاتی اپنی باتیں شروع کر دیں گے اور پھر ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔

ریلوے لائن کی دوسری طرف جنگلی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کا میدان شروع ہو گیا۔ میں نے گاڑی بان سے پوچھا کہ نانده ابھی کتنی دور ہے۔ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''آ جاوے گا بابو۔ ابھی تو پردھان کے آموں کے باغیچے بھی نہیں آئے۔''

خدا جانے یہ پردھان کون تھا۔ کوئی زمیندار ہی ہو گا۔ اس کے آموں کے باغ ہوں گے جہاں سے ہماری بیل گاڑی کو ابھی گزرنا تھا۔ دو باتوں کی طرف سے میں بڑا مطمئن تھا۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک بارش نہیں ہوئی تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ راستے میں کوئی جنگل نہیں آیا تھا۔ آموں کے باغ کا مطلب بھی یہی تھا کہ آبادی قریب ہی ہو گی۔

پردھان آموں کا باغ کوئی دو گھنٹے بعد آیا۔ یہ کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا باغ تھا۔ بیل گاڑی اس کے کنارے کنارے جا رہی تھی۔ آگے ایک برساتی نالے کی چڑھائی آ گئی۔ بیل گاڑی چڑھائی کی دوسری طرف آئی تو دور کسی گاؤں کے مکان دکھائی دینے لگے۔ یہاں کھیت بھی تھے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر سے اس گاؤں کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

''بھیکم گڑھ ہے آگے نانده ہے۔''

بھیکم گڑھ گاؤں میں بیل گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ وہاں سے روانہ ہوئی تو کوئی دو گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد نانده کے قصبے میں پہنچ گئی۔ یہی اس کی منزل تھی۔ اس وقت دن کی ابر آلود روشنی میں شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا گھلنے لگا تھا۔ نانده چھوٹا سا قصبہ تھا۔ پتھر کی دیواروں والے مکان ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ سب مکانوں کی چھتیں ٹوٹی پھوٹی کھپریلوں کی تھیں۔ جھونپڑیاں بھی جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں کے باہر یہاں بھی ایک بڑا تالاب تھا جہاں عورتیں پانی بھی بھر رہی تھیں اور بیٹھی کپڑے بھی دھو رہی تھیں۔ کیلے تاڑ اور پپیتے کے درختوں کے جھنڈ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ کئی مکانوں میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

بیل گاڑی ایک پرانی حویلی کے اونچے دروازے کے باہر آ کر رکی تھی۔ دوسرے دیہاتی مسافر اپنے اپنے گھروں کی طرف جا چکے تھے۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ میں وہیں ایک طرف ہو کر ایک درخت کے گرد بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ گاڑی بان بیلوں کو کھول کر ان کے آگے چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے مجھے اکیلا بیٹھے دیکھا تو پوچھا کہ میں کس کا انتظار کر رہا ہوں؟ میں نے کہا۔

''بھائی انتظار کس کا کرنا ہے۔ نانده کے جنگل میں اپنے ماموں فاریسٹ آفیسر کے ریسٹ ہاؤس میں جانا ہے۔''

گاڑی بان بولا۔

''میاں رات کے وقت جاؤ گے تو شیر باگھ کھا لیں گے تمہیں۔ رات یہیں پڑ کر سو رہو۔ صبح چلے جانا۔''

گاڑی بان بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے اپنی بیل گاڑی میں رات کو سونے کی اجازت دے دی۔ اس نے مجھے حویلی کے اندر سے کھانا بھی لا کر کھلایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ نانده کا جنگل یہاں سے کس طرف ہے۔ اس نے بتایا کہ شمال میں دو میل آگے جاؤ گے تو نانده کا جنگل شروع ہو جائے گا۔

''مگر یہ جنگل تو بہت بڑا ہے۔ تمہارے ماموں کا ڈاک بنگلہ کہاں ہے؟ اس نے تمہیں کوئی اتہ پتہ نہیں دیا۔''

میں نے کہہ دیا کہ وہاں قریب ہی کچا کوئلہ بنانے کے بھٹے لگے ہیں۔ اس پر گاڑی بان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو یوں کہو کہ پٹیل کے بھٹوں کے پاس جاؤ گے۔''

تب اس نے مجھے سارا راستہ سمجھایا کہ پٹیل کے بھٹے جنگل میں کس طرف ہیں۔ مجھے کس طرف سے جنگل میں داخل ہونا ہو گا اور بھٹوں پر جا کر پٹیل کے کارندوں سے ڈاک بنگلے کا پوچھنا ہو گا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ مجھے تو پٹیل کے بھٹوں کا ہی پتہ درکار تھا اور وہ مجھے مل گیا تھا۔

رات میں نے حویلی کے دروازے پر بیل گاڑی میں کچھ سوتے کچھ جاگتے اور کچھ مچھر مارتے گزار دی۔ صبح گاڑی بان نے مجھے لال مرچوں کی چٹنی کے ساتھ روٹی کھلائی۔ چائے پلائی اور میں نانده کے جنگل کی طرف چل پڑا۔ ایک کچا راستہ جنگل کی طرف جاتا تھا۔ جنگل میں کٹائی کے بعد درختوں کے شہتیر تختے اور پٹیل کے کوئلوں کی بوریوں سے لدے ہوئے چھکڑے اسی راستے سے نانده گاؤں آتے تھے۔ راستہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دونوں جانب بیل گاڑیوں کے پہیوں کے نشان بنے ہوئے تھے جن کے درمیان گھاس کی ابھری ہوئی پگڈنڈی سی بن گئی تھی۔ دونوں جانب کھجور اور کیکر کے درخت تھے۔

دو تین کوس چلنے کے بعد جنگل کا رقبہ شروع ہو گیا۔ پہلے درخت دور دور تھے۔ پھر ان کے جھنڈ قریب آتے گئے۔ ایک برساتی نالا آ گیا۔ گاڑی بان نے کہا تھا کہ اسی نالے کی دوسری جانب بائیں طرف درختوں کے ساتھ ساتھ چلتے جانا۔ آگے ایک مڑھی آئے گی۔ مڑھی ایک چھوٹا سا چبوترہ ہوتا ہے جہاں کسی ہندو سادھو وغیرہ کی ہڈیاں دفن ہوتی ہیں۔ برساتی نالے پر بانسوں کو جوڑ کر ایک پل بنا دیا گیا تھا۔ میں پل پر سے گزر کر بائیں جانب درختوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد سادھو کی مڑھی آ گئی۔ گاڑی بان نے کہا تھا کہ یہاں سے جنگل میں داخل ہو جانا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور یہاں سے جنگل میں داخل ہو گیا۔ بیل گاڑیوں اور چھکڑوں کے لیے بنا ہوا راستہ آگے نکل گیا تھا۔ میں اب نانده کے جنگل میں داخل

ہو چکا تھا۔ پہلے تو مجھے یہ جنگل بھی عام جنگلوں کی طرح لگا کچھ دور چلنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس جنگل میں کچھ زیادہ خاموشی ہے۔ یقین کریں درختوں پر سے کسی پرندے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ درخت اتنے گنجان تھے کہ اوپر جا کر ان کی شاخیں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ جنگل میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ جو شے مجھے خوف زدہ کر رہی تھی وہ اس جنگل کی خاموشی تھی۔ واقعی جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک ہیبت ناک سناٹا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی لگتا تھا کہ یہاں سے لوگ گزرتے ہیں۔ ایک جگہ ایسی آواز آئی جیسے کوئی جنگلی جانور کسی کے پیچھے دوڑ پڑا ہو۔ میں ڈر کر وہیں رک گیا اور درختوں کی ٹہنیوں میں دیکھنے لگا۔ ایک بار پھر خوفناک سناٹا چھا گیا اتنی ڈرا دینے والی ہیبت ناک خاموشی میں نے آج تک کسی جنگل میں محسوس نہیں کی تھی۔ فضا میں گیلی گھاس اور گلے سڑے پتوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی دھڑکا لگا تھا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی شیر ریچھ یا چیتا نہ نکل آئے۔ اللہ کے نام کا ورد کرتا دیکھ بھال کر جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک سامنے ایک ندی آ گئی۔

یہ وہی ندی ہو سکتی تھی جس کے بارے میں گھاٹن نے بتایا تھا کہ رکھالی ندی کے کنارے پٹیل نے پکی چار دیواری کے اندر اپنی خاص کوٹھڑی بنا رکھی ہے۔ میں وہاں رک گیا۔ ندی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ایک جانب اس کے اوپر کسی درخت کا کٹا ہوا تنا ڈال کر پل بنایا ہوا تھا۔ میں نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا ۔تھوڑا سا پانی بھی پیا اور درخت کے تنے کے اوپر سے گزر کر ندی کی دوسری طرف آ گیا۔ دوسرے کنارے پر جا کر میں نے دیکھا کہ کیکر کے بے شمار درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ یہ وہی درخت تھے جن کو بھٹوں میں جلا کر کچا کوئلہ بنایا جاتا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے کچے کوئلے کے دھوئیں کی ہلکی ہلکی بو محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ پٹیل کے کوئلوں کے بھٹوں کا علاقہ قریب ہی تھا۔ میں محتاط ہو کر چلنے لگا۔

ندی پار کرتے مجھے کچے کوئلوں کی جو بو محسوس ہوئی تھی وہ کبھی غائب ہو جاتی اور کبھی بڑی تیز ہو جاتی۔ جنگل میں جو چھوٹی سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی اور جس پر میں چل رہا تھا وہ جھاڑیوں میں غائب ہو گئی تھی۔ میں کوئلوں کی بو کے ساتھ ساتھ اندازے سے چل رہا تھا۔ ایک جگہ اونچی اونچی گھاس تھی۔ میں نے گھاس کو پرے ہٹایا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہاں کوئلوں کی بو تیز ہو گئی۔ یہی وہ ندی تھی جس کے کنارے پر پٹیل نے اپنی خاص کوٹھڑی بنائی ہوئی تھی اور گھاٹن کے بیان کے مطابق مسلمان لڑکی اسی کوٹھڑی میں قید تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف چلنے لگا۔ مجھے دو آدمیوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ کسی نے آواز دے کر کسی کو پکارا تھا۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ چکا تھا۔

اب مجھے وہ کوٹھڑی تلاش کرنی تھی جس میں عائشہ قید تھی۔ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز بند ہو گئی۔ پھر کلہاڑے سے لکڑیاں کاٹنے کی آواز آنے لگی۔ ندی کے کنارے اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے جھاڑیوں کو ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ ایک جگہ درختوں میں سے دھوئیں کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ یہی بدمعاش پٹیل کے کوئلوں کے بھٹے تھے۔ ابھی تک مجھے اس کوٹھڑی کی چار دیواری نظر نہیں آئی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتا ندی کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔ ندی گھوم گئی۔ یہاں مجھے پتھر کی ایک دیوار نظر آئی جو ندی کے دوسرے کنارے ذرا ڈھلان میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ یہ پٹیل کی کوٹھڑی کی چار دیواری کی دیوار تھی۔ دیوار کے اوپر درختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ اس طرف چار دیواری کا دروازہ نہیں تھا۔ مجھے ندی پار کرنی تھی میں اوپر کی طرف گیا۔ ایک جگہ موٹے موٹے بانس ڈال کر ندی پر پل بنایا ہوا تھا۔ میں پل پر سے گزر کر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے مجھے چار دیواری صاف نظر آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ رات کے وقت چار دیواری پھلانگ کر اندر جاؤں اور کوٹھڑی میں سے کسی طرح عائشہ کو نکال کر لے آؤں۔ مجھے پٹیل کے جرائم پیشہ نوکروں کا بھی ڈر تھا جو بقول گھاٹن کے بندوقیں اٹھائے ہر وقت پہرے پر ہوتے ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سر پر پیچھے سے کسی نے کوئی بھاری چیز زور سے ماری۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ مجھے چکر آیا اور اس کے بعد کوئی ہوش نہ رہا۔

......☆☆☆......

ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر زمین پر بٹھا رکھا ہے اور ایک آدمی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے۔ میرے سر کا پچھلا حصہ سخت درد کر رہا تھا۔ یہ ایک تنگ سی کوٹھڑی تھی۔ لیمپ جل رہا تھا مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر جو آدمی میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا اس نے زور سے مجھے دو تین اوپر تلے طمانچے مارے اور گالیاں دیتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں بے تو کہاں سے آیا ہے، تجھے کس سالے نے بھیجا ہے؟"

اس کے بعد پھر مجھ پر تھپڑوں کی بارش شروع ہو گئی۔ جن دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا انہوں نے مجھے فرش پر لٹا دیا اور ٹھڈے مارنے لگے۔ میری چیخیں نکلنے لگیں۔ میں نے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کسی نے نہیں بھیجا، میں جنگل میں راستہ بھول کر ادھر آ گیا تھا۔"

اب ان تینوں نے گالیاں بکتے ہوئے میری پٹائی شروع کر دی۔ میرا برا حال ہو گیا تھا۔ جب وہ مجھے مار کر تھک گئے تو ایک نے کہا۔

"یہ ضرور گنگولی بدمعاش کا آدمی ہے۔ اسی سالے نے اسے عورت کی ٹوہ لگانے یہاں بھیجا ہوگا۔"

دوسرا بولا۔

"اس کو یہیں رکھو۔ سیٹھ بیرو گڑھ سے آئے گا تو اسے اس کا چہرہ دکھا کر گولی مار دیں گے۔"

تیسرا کہنے لگا۔

"میں تو کہتا ہوں اس کو ابھی گولی مار دو سیٹھ کو اس کی لاش دکھا دیں گے وہ ہمیں انعام واکرام دے گا۔"

پہلے والا بولا۔

"ابے نہیں، ابھی نہیں۔ دو دن کی تو بات ہے۔ سیٹھ کو دکھا کر اسے گولی ماریں گے۔ بند کر دو اس حرامزادے کو۔"

یہ تینوں آدمی ہٹے کٹے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں جو انہوں نے کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ لگا رکھی تھیں۔ ان تینوں نے باری باری مجھے ٹھڈے مارے اور مجھے کوٹھڑی میں ادھ موا کر کے پھینک کر چلے گئے۔ باہر سے انہوں نے تالا لگا دیا۔ میرا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ پسلیوں کے نیچے سانس لیتے ہوئے ایسی ٹیس پڑتی تھی کہ میں سر پر لگی ہوئی چوٹ کا درد بھول گیا۔ میں فرش پر سیدھا پڑا تھا۔ مجھے اپنے منہ میں نمک کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میں نے قمیص کو منہ کے ساتھ دبا کر اسے لیمپ کی روشنی میں

دیکھا۔ میرے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ واقعی ان لوگوں نے مجھے بہت مارا تھا۔

میں آنکھیں بند کیے فرش پر سیدھا پڑا رہا۔ میرے جسم کا ہر حصہ درد کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا تو میری مدد فرما۔ میں ایک نیک مقصد لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھ سے اگر کوئی گناہ ہو گیا ہے تو مجھے معاف فرما دے۔ یا اللہ! مجھے معاف فرما دے۔ میں اسی ایک جملے کو بار بار دل میں دہرانے لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی پھر مجھ پر غنودگی یا نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا یا بے ہوش ہو گیا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم پر جو چوٹیں لگی تھیں ان کا درد بہت کم ہو گیا ہے حالانکہ جسم ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس درد میں اضافہ ہو جانا چاہیے تھا۔ پسلیوں کے نیچے سانس لینے سے جو ٹیس اٹھتی تھی اس کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا۔ خدا نے میری فریاد سن لی تھی اور میرے گناہوں کو معاف کر دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اس وقت سچے دل سے خدا سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ بلکہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہیں لاؤں گا۔

اس کے باوجود جسم کی حالت ایسی ضرور تھی جیسے کسی نے مجھے مدھول دیا ہو۔ اس وقت مجھے مدھول کا کوئی اردو متبادل لفظ نہیں مل رہا۔ معافی چاہتا ہوں۔ سر کے پچھلے حصے میں جہاں ان لوگوں نے کسی بھاری شے کی ضرب لگائی درد کی ہلکی ہلکی ٹیس ضرور اٹھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ زمین پر سے اپنے آپ کو سمیٹا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دیواریں بانس جوڑ کر نہیں بنائی گئی تھیں میں نے دیوار پر انگلی پھیر کر دیکھا۔ یہ مٹی کی دیوار تھی دروازے کے اوپر چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان بنا تھا جس میں سلاخیں لگی تھیں۔ کونے میں ایک طاق تھا جس میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ کوٹھڑی کی فضا مٹی کے تیل کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی۔ میری ساری جیبیں خالی تھیں۔ یہ لوگ میرے پیسے اور چاقو سب نکال کر لے گئے تھے۔

وقت کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات۔ روشندان میں باہر سے دن کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رات ہو گی تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس کے مارے حلق بھی خشک ہو رہا تھا مگر کوٹھڑی بالکل خالی تھی۔ پانی کا کوئی گھڑا وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ میری بھرپور نوجوانی کا زمانہ تھا۔ میری رگوں میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا اور طبیعت میں ایڈونچر کا جوش بھرا ہوا تھا۔ میں بے بسی کی موت نہیں مر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں تھا کہ میں پٹیل ہی کے بھٹوں پر تھا اور یہ اسی کے کارندے تھے جو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ جو آپس میں باتیں کر رہے تھے وہ بھی میں نے سن لی تھیں۔ ان باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ پٹیل نے ایک عورت کو گنگولی نامی بدمعاش سے خرید کر یہاں ڈال رکھا ہے اور اس بات کا انکشاف بھی ہوا تھا کہ گنگولی پجاری یہاں سے اس عورت یعنی عائشہ کو اغوا کرنے کی فکر میں ہے۔ ظاہر ہے وہ اس لیے عائشہ کو اغوا کرانا چاہتا ہو گا کہ اسے آگے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ میرے لیے اتنی معلومات ہی بہت تھی کہ عائشہ اسی جگہ پر ہے۔

عائشہ کو وہاں سے نکالنا ایک الگ مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے اس کوٹھڑی سے جان بچا کر فرار ہونا تھا تا کہ آزاد ہو کر میں عائشہ کو وہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر کر سکوں۔ بظاہر کوٹھڑی سے نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوٹھڑی بند تھی۔ دروازہ بھاری لکڑی کا تھا۔ باہر سے اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے اوپر جو روشندان تھا اس پر سلاخیں لگی تھیں اور اس میں سے کوئی دبلی پتلی بلی ہی باہر نکل سکتی تھی لیکن میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے ہر حالت میں وہاں سے فرار ہونا ہے۔ میں فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ دیواریں کچی تھیں مگر میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس سے دیوار کھرچ کر اس میں سوراخ کر کے باہر نکل سکوں۔ میں نے انگلی کے ناخن سے دیوار کی مٹی کھرچنا شروع کر دی۔ ذرا سی کوشش میں میرے ناخن درد کرنے لگے۔ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ کوٹھڑی کے باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا رات کافی گہری ہو چکی ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس آیا اور کوئی درز تلاش کرنے لگا جس کے ساتھ آنکھ لگا کر باہر کچھ دیکھ سکوں۔ دروازہ بڑا مضبوط اور بھاری تھا۔ کسی جگہ بھی مجھے اس میں کوئی درز یا سوراخ نظر نہ آیا۔ اٹھ کر چلنے سے میری پسلیوں کے نیچے دوبارہ ٹیسیں پڑنے لگیں۔ میں بیٹھ گیا۔ بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ میں نانده گاؤں سے ناشتہ کر کے چلا تھا اور دن کے کوئی نو دس بجے کے قریب جنگل میں پٹیل کے کوئلوں کے بھٹوں پر پہنچا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں میرے سر پر کوئی وزنی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر کے اٹھایا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا میں دن کے نو دس بجے کا بے ہوش پڑا تھا اور اب رات کو ہوش آیا تھا۔ اسی لیے مجھے بھوک اور پیاس لگ رہی تھی۔

میں غور کرنے لگا کہ یہ لوگ مجھے پٹیل کے آنے تک اسی کوٹھڑی میں بند رکھیں گے۔ اور زندہ بھی رکھیں گے۔ ظاہر ہے پھر وہ میری زندگی کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو ضرور دیں گے لیکن ابھی تک انہوں نے مجھے پانی تک پینے کو نہیں دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح رات گزر بسر کرنی ہی پڑے گی۔ شاید صبح کو یہ لوگ کچھ کھانے پینے کو دیں میں آہستہ سے فرش پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھیں درد کر رہی تھیں۔ جسم بھی تھوڑا تھوڑا دکھ رہا تھا نیند نہیں آ رہی تھی۔ بس غنودگی سی طاری رہی اور خدا جانے کب تک طاری رہی۔

پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

کوئی باہر سے دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روشندان میں سے دن کی سفید روشنی اندر آ رہی تھی۔ دو ہٹے کٹے آدمی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کھلنے سے دن کی روشنی بھی اندر آ گئی۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں رسے کا گچھا پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ انہوں نے لیمپ بجھا دیا۔ یہ وہی رات والے لوگ تھے۔ ایک نے مجھے گردن سے پکڑ کر میرا منہ زمین کے ساتھ لگا دیا اور زور سے دھول مار کر بولا۔

"سالے بتا تا کیوں نہیں تجھے کس نے بھیجا تھا۔"

دوسرا آدمی جس کے ہاتھ میں رسی کا گچھا تھا بولا۔

"ابے مرلی پیچھے ہٹ، پہلے مجھے اس کی گردن میں رسا تو ڈالنے دے۔"

انہوں نے میری گردن میں رسا ڈال کر اسے اس طرح باندھ دیا جیسے مجھے پھانسی دینے لگے ہوں۔

"چل بے باہر نکل......"

وہ مجھے رسی سے کھینچتے ہوئے کوٹھڑی سے باہر لے

آئے۔ باہر اچھا خاصا دن نکلا ہوا تھا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ تازہ ہوا میں آتے ہی میری جان میں جان آئی۔ وہاں چاروں طرف درخت ہی درخت تھے۔ یہ قیدیوں والی کوٹھڑی پٹیل کے ڈیرے کے کسی ویران کونے میں تھی۔ وہ مجھے رسی سے کھینچتے ہوئے گالیاں بکتے درختوں کے پیچھے ندی پر لے آئے۔ ندی پر لے جا کر انہوں نے مجھے وہاں پر بٹھا دیا اور کہا کہ یہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھولے۔ زیادہ دیر لگائی تو ندی میں ڈبو دیں گے۔ وہ مجھے وہاں چھوڑ کر رسی کو لمبا کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ رسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ رسی کا پھندا میرے گلے میں تھا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے جلدی سے ندی میں ہاتھ ڈال کر پانی پیا۔ پھر منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جس آدمی نے میری رسی پکڑ رکھی تھی وہ اسے کھینچ لیتا تھا اور میری گردن کو جھٹکے لگتے تھے۔ منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں آہستہ آہستہ واپس چلنے لگا۔ وہ زور سے رسی کھینچ رہے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں قہقہہ مار کر ہنسے اور مجھے گالیاں دینے لگے پھر دوسرے آدمی نے پوٹلی کھول کر مجھے دو روٹیاں دیں جو باسی تھیں۔ ان پر آم کا اچار رکھا ہوا تھا۔ میں وہیں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ اس وقت وہ روٹی پلاؤ زردے سے زیادہ لذیذ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔

''سچ سچ بتا دے تجھے اس بدمعاش گنگولی نے ہی یہاں بھیجا ہے ناں؟''

''ارے پٹیل کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں ساری بات بتا دے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پٹیل سے تیری جان بخشی کرا دیں گے۔''

میں ہر بات کے جواب میں یہی کہتا کہ میں راستہ بھول کر جنگل میں ادھر نکل آیا تھا۔ نانده میں اپنے شکاری دوست سے ملنے آیا تھا وہ نہ ملا تو واپس جانے کی بجائے سوچا جنگل کی سیر کر لوں۔ اس پر ایک بدمعاش نے اٹھ کر مجھے زور سے تھپڑ مارا۔ روٹی میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں کھا جانے والی نظروں سے انہیں گھورنے لگا۔

''ابے گھورتا ہے؟''

وہ مجھے رسی کے زور زور سے جھٹکے دینے لگے۔ میں نے رسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس پر وہ غصے میں آ کر وہیں مجھے مارنے پیٹنے لگے۔ میں بے بس تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ مجھے جھاڑیوں میں گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی میں لے آئے۔ مجھے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ہاتھ اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے میری گردن سے رسی کا پھندا نکال دیا تھا۔ میری گردن رسی کی رگڑ سے درد کر رہی تھی۔ میری کمر بھی درد کر رہی تھی۔ وہاں ان کے مکے پڑے تھے۔ مجھے جتنی گالیاں یاد تھیں میں نے انہیں دے دیں اور بیٹھ کر وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا۔ روٹی میں نے ایک ہی کھائی تھی دوسری زمین پر گر پڑی تھی جو میں نے پھر نہیں اٹھائی تھی۔ انہوں نے مجھے اٹھانے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ تھوڑی بہت روٹی کھانے اور سیر ہو کر پانی پینے سے میری کھوئی ہوئی توانائی کچھ بحال ہو گئی تھی مگر وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ دن اور رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن اسی طرح پٹیل کے دونوں کارندے جن میں سے ایک کا نام مرلی تھا اور دوسرے کا نام مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا میری

گردن میں رسی ڈال کر مجھے ندی پر منہ ہاتھ دھونے لے گئے۔ وہیں انہوں نے مجھے رات کی باسی روٹی کھانے کو دی اور میرے گلے میں پھندا ڈالے مجھے کھینچتے ہوئے واپس کوٹھڑی میں لے آئے۔

وہ بیرو گڑھ سے پٹیل کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تیسرے دن دوپہر کے بعد پٹیل آ گیا۔ باہر سے لوگوں کی آوازیں کچھ زیادہ ہی آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان بدمعاشوں کا سرغنہ پٹیل آ گیا ہے۔ تیسرے پہر مجھے اسی حالت میں پٹیل کے سامنے پیش کیا گیا کہ میری گردن میں پھندا پڑا تھا اور رسی مرلی کے ہاتھ میں تھی۔ موٹا پٹیل اپنے جنگل والے مکان کی چار دیواری کے اندر برآمدے کے آگے بانس کی کرسی پر بڑی سی توند نکالے بیٹھا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ بیرو گڑھ والا پٹیل ہی تھا جسے میں نے اس کی ساہوکارے کی دکان پر دیکھا تھا۔ میں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ پٹیل کے مکان یا کوٹھڑی کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ برآمدے میں مٹی کے لمبوترے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ ہر مٹکے کے اوپر سلور کا کٹورا اوندھا پڑا تھا۔ میری نگاہیں عائشہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ پٹیل مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے سامنے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ مرلی نے کہا۔

''سیٹھ یہی وہ لڑکا ہے جسے گنگولی نے جاسوسی کرنے یہاں بھیجا ہے۔''

پٹیل مسلسل مجھے غصے بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے گردن سے پکڑ کر پٹیل کی کرسی کے قریب لے گئے۔ پٹیل نے زور سے میری تھوڑی پر لات ماری۔ میں پیچھے ہو کر گر پڑا۔ وہ بھی مجھے گالیاں دینے لگا پھر گنگولی پجاری کو گالی دیتے ہوئے بولا۔

"اس کو پوری رقم مل گئی تھی تو پھر عورت کے پیچھے کیوں لگا ہے۔ بول! تیرے ساتھ کون کون میرے بھٹوں پرآیا ہے؟"

میں نے پٹیل کے آگے بھی وہی من گھڑت کہانی دہرادی جو میں اس کے کارندوں کو سنا چکا تھا۔ سیٹھ نے اپنے کارندوں سے کہا۔

"یہ اس طرح نہیں بکے گا۔ اس کی ٹھکائی کرو۔"

وہاں پٹیل کے دوسرے نوکر اور باڈی گارڈ بھی بندوقیں کندھوں پر لٹکائے جمع ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کردیا۔ میں اپنے جسم کو گیند کی طرح سمیٹ کر وہیں گول مول ہوکر بیٹھا مار کھاتا رہا۔ پٹیل نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔"

اس کے آدمی وہیں رک گئے۔ میرا بدن مار کھا کھا کر عادی سا ہوگیا تھا اب مجھے گھونسوں اور ٹھڈوں کی چوٹیں زیادہ محسوس نہیں ہورہی تھیں۔ لیکن میرا خون پہلے سے زیادہ کھول رہا تھا اور میں نے دل میں عہد کرلیا تھا کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو ان لوگوں سے اس ذلت کا بدلہ ضرور لوں گا۔ پٹیل نے مجھ سے گنگولی پجاری اور اس کے آدمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ میری جانے بلا کہ گنگولی پجاری کہاں تھا اور اس کے آدمی کون تھے۔ میں تو صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ بمبئی کے مندر کے بڑے مہنت نے عائشہ کو گنگولی نام کے ایک پجاری کے ہاتھ بیچ دیا تھا جس نے اسے آگے پٹیل کے ہاتھ فروخت کردیا تھا۔ یہ تو مجھے یہاں آ کر ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ گنگولی دوبارہ عائشہ کو پٹیل کے ڈیرے سے اغوا کرنے کی فکر میں ہے۔ میرے بیان پر کسی کو اعتبار نہیں آرہا تھا۔ اس دوران میری نگاہیں برآمدے کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں کہ شاید وہاں عائشہ کی شکل نظر آجائے مگر وہ شاید مکان کے اندر بند تھی۔ آخر پٹیل نے گالی دے کر اپنے کارندے مرلی اور اس کے ساتھی سے کہا۔

"اس کو لے جا کر ٹیلے والی غار میں چھوڑ آؤ۔ مگر اندھیرا ہوجانے دو......"

پٹیل کے کارندے رسی سے مجھے کھینچتے ہوئے واپس کوٹھڑی میں لے آئے۔ انہوں نے میری گردن سے پھندا کھول دیا اور کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگادیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ ٹیلے والے غار میں مجھے کس لیے بند کررہے ہیں۔ شاید اس غار میں ریچھ یا کوئی دوسرے جنگلی جانور رات کو بسیرا کرتے ہوں اور یہ چاہتے ہوں کہ میں غار کے درندوں کی خوراک بن جاؤں۔ اس طرح ان پر بھی قتل کا الزام نہیں آئے گا اور میرا کام بھی تمام ہوجائے گا۔ میں بے چین سا ہوکر اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ مجھے اپنے اوپر اس قیدی کا گمان ہورہا تھا جسے موت کی سزا سنادی گئی ہو اور رات کو پھانسی ملنے والی ہو۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر موت ایک بار تو میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے مجھے ٹیلے والے غار میں پھینک کر یہ لوگ اس کا منہ پتھر سے بند کرکے چلے جائیں۔ اگر ایسا ہی ہوا تو میں کسی نہ کسی طرح پتھر ہٹا کر غار سے نکل بھاگوں گا۔ مگر ان بدمعاشوں سے مجھے زندگی کی امید نہیں تھی کوٹھڑی کے روشندان میں سے دن کی روشنی ماند پڑتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دن کی اتنی روشنی بھی غائب ہوگئی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا ہوگیا۔ کسی نے آ کر لیمپ بھی نہیں جلایا تھا۔ اتنے میں تالا کھلنے کی آواز آئی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت میں بے حد خوفزدہ ہوگیا۔ یہ لوگ یقیناً مجھے ٹیلے پر لے جا کر قتل کرنے والے تھے۔ غار میں بند کرنے کا ایک بہانہ ہی تھا۔

وہی دونوں بدمعاش کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ دروازہ کھلنے پر مجھے باہر شام کی ملگجی روشنی نظر آئی۔ ابھی رات نہیں پڑی تھی۔ انہوں نے میری گردن میں رسی کا پھندا ڈال دیا اور مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ دونوں کاندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ وہ مجھے شوٹ کرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے۔ خوف سے میرا حلق خشک ہوگیا تھا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے ٹیلے کی طرف لیے جارہے تھے۔ یہ ٹیلہ ندی کے پاس ہی تھا۔ ندی اس کے دامن سے گھوم کر گزرتی تھی۔ شام کی ملگجی روشنی رات کے اولین اندھیرے میں ڈھل رہی تھی۔ میں ان کی منت سماجت کرنے لگا کہ میں بےقصور ہوں۔ میرا کسی گنگولی نام کے آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ مرلی نے میرے گلے میں بندھی ہوئی رسی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ وہ مجھے ٹیلے کے اوپر لے آئے۔ جہاں مجھے کوئی غار نظر نہ آیا۔ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک درخت تھا۔ وہ مجھے درخت کے ساتھ باندھنے لگے تو موت کے خوف سے میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگا مگر ان پر میری گڑگڑاہٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہورہا تھا۔ مجھے درخت سے باندھنے کے بعد مرلی نے بندوق سنبھال لی۔ اس کا ساتھی ایک طرف بیٹھ گیا بولا۔

"مرلی! اڑادے۔"

میں نے اپنا سانس روک لیا۔ خدا جانے میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ مرلی نے بندوق میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ یہ دونالی بندوق تھی اس نے بندوق اٹھائی کہ میرا نشانہ لے کر اتنے میں ایسی زبردست پھنکار کی آواز آئی کہ میں بھی کانپ گیا۔ دوسرے لمحے مرلی کا بندوق والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا اور وہ چکرا کر گرا۔ اسی لمحے میں نے ایک پھن دار کالے سانپ کو دیکھا جو خدا جانے کہاں سے نکل کر وہاں آ گیا تھا اور اس نے مرلی کو ڈس لیا تھا۔ مرلی کے ساتھی نے سانپ کو دیکھا تو اس پر فائر جھونک دیا۔ گھبراہٹ میں نشانہ خطا گیا۔ سانپ نے اس پر حملہ کردیا مگر وہ خوش قسمت نکلا کہ وہاں سے چھلانگ لگا کر ٹیلے کی دوسری طرف لڑھک گیا۔ مرلی جھاڑیوں کے سامنے زمین پر اوندھا پڑا تھا اور بالکل بے حس و حرکت تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس درخت کی سامنے آ گیا جس کے ساتھ میں بندھا ہوا تھا۔ میں مرلی کی بندوق کی گولی سے بچ گیا تھا مگر اب یہ سانپ مجھے ڈسنے والا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ میرے پاؤں یا پنڈلی پر ضرور ڈس لے گا۔ جب ایک منٹ گزر گیا اور کچھ نہ ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رات کے دھندلے دھندلے اندھیرے میں وہاں سانپ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔

خدا نے مجھے موت کے منہ سے باہر نکال لیا تھا۔ جس رسی سے میں بندھا ہوا تھا میں نے اسے کھولنے کی کوشش شروع کردی۔ چونکہ مجھے انہوں نے شوٹ کردینا تھا اس لیے درخت کے ساتھ رسی کو زیادہ گانٹھیں دے کر نہیں باندھا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے رسی کھول کر ایک طرف پھینکی اور ٹیلے سے اتر کر ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ میں نے یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ مرلی سانپ کے ڈسنے سے مرچکا ہے یا ابھی زندہ ہے۔ ظاہر ہے وہ مرگیا تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو بندوق اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ مجھے بھاگتا دیکھ کر وہ ضرور مجھ پر فائر کرتا۔

میں اندھادھند بھاگا جارہا تھا۔ جھاڑیوں سے الجھ رہا تھا۔ گڑھوں میں پاؤں پڑ رہے تھے مگر موت کا خوف مجھے بھگائے لیے جارہا تھا۔ پٹیل کا ڈیرا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مرلی تو مر گیا تھا مگر اس کا ساتھی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے لازماً اپنے آدمیوں کو لے کر واپس مرلی کے پاس اور مجھے قتل کرنے کے لیے آنا تھا۔ اس بدمعاش کو پتہ تھا کہ میں درخت کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ندی کا پانی مجھے دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ میں اس کے اندازے سے ندی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اونچی گھاس اور جھاڑیاں قدم قدم پر میرا راستہ روک رہی تھیں مگر میں بھاگتا جارہا تھا۔ میں کافی آگے نکل گیا تو ایک جگہ دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔ میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ مگر زندہ بچ نکلنے کی خوشی نے میرے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔

ایک آدھ منٹ سانس لینے کے بعد میں پھر دوڑنے لگا۔ ندی کچھ دور آگے جا کر جنگل کی طرف مڑ گئی تھی۔ آگے گھنے درختوں والا اندھیرا جنگل شروع ہوگیا تھا۔ میں بھی ندی کے ساتھ ہی جنگل میں داخل ہوگیا۔ اب میں نے دوڑنا بند کردیا تھا اور جلدی جلدی چل رہا تھا۔ میں پٹیل کے ڈیرے سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا مگر جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے میری رفتار سست پڑ گئی تھی۔ بار بار کوئی درخت یا جنگلی جھاڑیاں سامنے آجاتی تھیں۔ اندھیرے جنگل میں اتنی دور نکل آنے پر مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ کسی جانب سے بھی کوئی درندہ نکل کر مجھ پر حملہ کرسکتا تھا۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرف سے کسی جنگلی درندے کی آواز تو نہیں آرہی۔ جنگل میں اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ یہاں کسی درخت کے اوپر بیٹھ کر رات گزار دیتا ہوں پھر خیال آیا کہ میں پٹیل کے ڈیرے سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ان کا ایک ساتھی بھی میری وجہ سے مر گیا ہے۔ پٹیل کے آدمی بندوق لے کر میری تلاش میں ضرور نکل پڑے ہوں گے انہیں جنگلوں کا وسیع تجربہ ہے وہ مجھے یہاں تلاش کرلیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر چلنا شروع کردیا۔ ندی مجھ سے کچھ دور ہوگئی تھی۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ جنگل میں کوئی راستہ تو تھا نہیں۔ بس اندازے سے مشرق کی طرف منہ کرکے میں جھاڑیوں سے الجھتا گھاس کو پرے ہٹاتا چلا جارہا تھا۔ چلتے چلتے میں جنگل کے درمیان ایک کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ یہاں درخت فاصلے پر اگے ہوئے تھے اور اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں تیز تیز چلتا اس کھلی جگہ سے نکل گیا۔ سامنے پھر گھنا جنگل شروع ہوجاتا تھا۔ میں تھوڑی دور چلا ہوں گا کہ مجھے ایسی آواز کا شبہ سا ہوا جیسے کوئی انسان کراہ رہا ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور آواز پر کان لگا دیئے۔

آواز کسی انسان کے درد سے کراہنے کی تھی اور کہیں قریب ہی سے آرہی تھی۔ میں وہیں بیٹھا جنگل کے سناٹے اور اندھیرے میں اس آواز کو غور سے سننے لگا۔

ایسے لگتا تھا کہ کوئی زخمی ہے اور درد سے کراہ رہا ہے۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ مجھے اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہیے اس وقت خود میری جان پر بنی ہوئی ہے لیکن انسان ہونے کے ناتے یہ مجھ سے گوارا نہ ہوسکا کہ ایک آدمی جنگل میں زخمی پڑا ہو اور میں اس کی

کوئی مدد نہ کروں۔ کم از کم دیکھنا تو چاہیے یہ کون ہے اور اسے کس نے زخمی کیا ہے۔ یہ سوچ کر جدھر سے آواز آرہی تھی میں اس کی طرف بڑھا۔ آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آتی تھی آخر میں آواز کے تعاقب میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں رات کے اندھیرے میں ایک چبوترے کا دھندلا خاکہ سا نظر آیا۔ چبوترے کے اوپر بارہ دری سی بنی ہوئی تھی۔ انسان کے کراہنے کی آواز اسی بارہ دری سے آرہی تھی۔

میں ہمت کرکے چبوترے کے پاس چلا گیا۔ مجھے ڈر بھی لگا کہ کہیں یہ کوئی چڑیل یا بھوت نہ ہو جو اس قسم کی آواز نکال کر جنگل سے گزرنے والوں کو اپنی طرف بلاتا ہو اور پھر انہیں کھا جاتا ہو۔ کراہنے کی آواز پھر آئی۔ آواز سے لگتا تھا کہ کوئی زخمی ہے اور درد کی شدت سے کراہ رہا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ چبوترے پر چڑھنے کے لیے ایک طرف پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں اندھیرے میں غور سے دیکھ دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چبوترے پر بارہ دری کے پاس فرش پر مجھے ایک انسان لیٹا ہوا نظر آیا۔

درد کی وجہ سے وہ اپنا بازو اوپر اٹھاتا اور پھر نیچے گرا دیتا تھا۔ میں نے دور ہی سے اسے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور اسے کیا ہوا ہے۔ زخمی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے جنگلی ریچھ نے زخمی کردیا ہے۔ مجھے میرے خان بابا کے پاس لے چلو۔"

آواز آدمی کی نہیں کسی نوجوان لڑکے کی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ اندھیرے میں جھک کر اسے دیکھا۔ واقعی یہ میری عمر کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا دھڑ خون میں لت پت تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ہاتھ لگایا تو لڑکے نے زور سے کراہتے ہوئے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

"خدا کے لیے یہاں ہاتھ نہ لگاؤ۔ مجھے اٹھا کر میرے خان بابا کے پاس لے جاؤ۔"

"کیا تم مسلمان ہو؟" میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔ کیونکہ اس نے خدا کا نام لیا تھا۔

"ہاں میں مسلمان ہوں۔ میرے باپ کا نام بھورے خان ہے وہ جنگل میں پرانے تالاب کے پاس رہتا ہے۔ مجھے میرے بابا خان کے پاس لے چلو نہیں تو میں مر جاؤں گا۔"

رات کا وقت اجاڑ سنسان جنگل۔ چاروں طرف اندھیرا۔ لڑکا دبلا پتلا تھا مگر قد اس کا لمبا تھا جس کی وجہ سے دور سے دیکھنے پر مجھے لگا تھا کہ کوئی آدمی لیٹا ہوا ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"پرانا تالاب یہاں سے کس طرف ہے اور کتنی دور ہے؟"

لڑکے نے کہا۔ "چبوترے سے اتر کر مشرق کی طرف چلو۔ آگے ایک خشک برساتی نالا آئے گا اس کی دوسری جانب پرانا تالاب ہے۔ ہائے ریچھ نے میری ٹانگوں پر پنجے مارے ہیں۔ خدا کا شکر ہے تم آگئے۔ مجھے لے چلو۔"

لڑکا بار بار میری منت کررہا تھا۔ اس کے جسم سے کافی خون بہہ چکا تھا جس کی وجہ سے اس کی آواز میں نقاہت بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے اس کے بازو کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا کر اپنے کاندھے پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا سر اور بازو میری پشت پر اور ٹانگیں آگے کی جانب لٹکنے لگیں۔ لڑکے کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔ بوجھ زیادہ بھی ہوتا تو میں اسے اس کے بابا خان کے پاس لے جانے کا عہد کرچکا تھا۔ میں اس حالت میں اسے جنگل میں نہیں چھوڑ سکتا تھا اگر وہ وہیں رہتا تو رات کے کسی حصے میں اس کے خون کی بو پر کوئی نہ کوئی جنگلی درندہ آکر اسے ضرور

ہڑپ کر جاتا۔

میں سنبھل سنبھل کر چبوترے سے نیچے اتر آیا اور مشرق کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ میرے سامنے کوئی سڑک یا پگڈنڈی تو تھی نہیں۔ جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کے بیچ میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ میں نے چند قدم چلنے کے بعد لڑکے سے پوچھا۔

"تم آدھی رات کو جنگل میں ادھر کیوں آ گئے تھے؟"

لڑکے نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"میرے بابا خان نے آج رات واپس ڈیرے پر آنا تھا۔ میں نے سوچا میں جنگل میں آگے جا کر اپنے باپ سے ملتا ہوں۔ غلطی ہو گئی بندوق ساتھ نہیں لایا۔ چبوترے کے پاس ریچھ نے حملہ کر دیا۔"

"تمہارے پاس بندوق بھی ہے۔"

"ہاں ہم سب کے پاس بندوق ہوتی ہے۔"

مجھے کچھ تشویش ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا تم پولیس میں کام کرتے ہو؟"

"ہائے مجھ سے بولا نہیں جاتا۔ جلدی چلو میرے اللہ۔"

اس کے بعد لڑکے کی آواز نہ آئی۔ میں نے دو تین بار اسے بلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ اسے آپ انسانی ہمدردی سمجھ لیں چاہے یہ سمجھ لیں کہ مجھ پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی۔ اب مجھے ہر حالت میں اس لڑکے کو اس کے باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ بندوق کے ذکر سے مجھے لگا کہ اس کا باپ پولیس کا کوئی افسر ہے پرانے تالاب کے پاس جنگل میں کوئی پولیس کی چوکی یا اس کا اپنا کوارٹر ہو گا۔ ساتھ نوکر بھی ہوں گے جن کے پاس بندوقیں ہوں گی۔ دل میں سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہے میں ان کی مدد سے عائشہ کو پٹیل کی قید سے رہائی دلا سکوں گا۔

اگرچہ لڑکا دبلا پتلا تھا اور اس کا کوئی وزن بھی نہیں تھا پھر بھی اتنا بوجھ ضرور تھا کہ میرا سانس پھول گیا۔ میں سانس لینے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ لڑکا بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے میں نے کاندھے پر ہی ڈال رکھا تھا۔ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ جس ریچھ نے اس لڑکے پر حملہ کیا تھا کہیں وہ آس پاس ہی نہ ہو اور اچانک حملہ نہ کر دے۔ میں اس ڈر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اندھیرے میں مجھے درختوں اور جھاڑیوں کے سلیٹی رنگ کے ہیولے ضرور نظر آ رہے تھے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ برساتی نالہ کہاں ہے۔ میں جھاڑیوں کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹاتا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سمت میں نے مشرق کی طرف قائم رکھی تھی۔ جنگلوں میں رات کے وقت چلنے پھرنے کا مجھے بھی تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔

ایک جگہ جھاڑیاں اچانک ختم ہو گئیں۔ میں نے رک کر آگے دیکھا۔ آگے ایک گھاٹی تھی۔ شاید یہی برساتی نالا تھا۔ اس کی دیواریں سیدھی نہیں تھیں۔ کافی ڈھلان تھی۔ میں نے بے ہوش لڑکے کو دوسرے کندھے پر ڈال لیا۔ میرا پہلے والا کندھا سن ہو گیا تھا۔ ڈھلان پر کافی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں انہیں پکڑ پکڑ کر برساتی نالے کی ڈھلان اتر گیا۔ نالے کی تہہ میں پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اسی طرح جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر میں نالے کی دوسری ڈھلان بھی چڑھ گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر میں تھک کر بیٹھ گیا۔ سانس پھول رہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر سانس درست کیا اور دوبارہ آگے چل پڑا۔ میں نے اپنا رخ اسی طرف کر رکھا تھا جس طرف لڑکے نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے کہا تھا۔

اب مجھے پرانے تالاب کی تلاش تھی۔ خدا جانے تالاب کہاں تھا۔ رات کو تالاب نظر بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ لیکن میں ہمت کر کے چلا جا رہا تھا۔ جنگل چھدرا ہونے لگا تھا۔ خالی زمین اندھیرے میں نظر آ رہی تھی۔ دور مجھے درختوں کی سیاہی میں روشنی سی ٹمٹماتی دکھائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ لڑکے کے باپ کا یہی کوارٹر ہے۔ میں اس روشنی کی سمت چلنے لگا۔ راستہ سیدھا نہیں تھا۔ کبھی جھاڑیوں کی وجہ سے مجھے دائیں طرف مڑنا پڑتا کبھی بائیں طرف مڑ جاتا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی کبھی نظروں سے غائب ہو جاتی اور کبھی پھر نظر آنے لگتی۔

درخت ایک بار پھر قریب آنے لگے تھے۔ میری نگاہ ٹمٹماتی روشنی پر تھی۔ اچانک وہ روشنی غائب ہو گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد روشنی پھر نظر آنے لگی۔ یہ کسی لالٹین کی روشنی تھی جو کسی جگہ لٹکی ہوئی تھی۔ اچانک جھاڑیوں میں سے دو آدمی نکل کر میرے سامنے آ گئے۔

"کون ہو بے تم؟ یہ کس کو اٹھایا ہوا ہے؟"

میں رک گیا۔ مگر مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ میں نے بے ہوش لڑکے کو زمین پر ڈال دیا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور ہانپتے ہوئے کہا۔

"بھائیوں اگر تم پولیس والے ہو تو یہ بھورے خان پولیس افسر کا بیٹا ہے۔ میں اسے جنگل سے اٹھا کر لایا ہوں۔"

ان دونوں آدمیوں کی آنکھیں لال لال تھیں۔ انہوں نے سروں پر ڈاٹھے باندھ رکھے تھے اور ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے لپک کر لڑکے کو اٹھا لیا اور زور زور سے آوازیں دیں۔

"او شبراتی او دھنوا۔ ادھر آؤ بے خان جی کا بیٹا مل گیا ہے۔"

کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سے دو تین آدمی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان کے حلیے بھی ویسے ہی تھے اور ان کے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ میرے دل میں شک سا پیدا ہوا کہ یہ لوگ پولیس کے آدمی نہیں لگتے۔

"یا خدا تیرا شکر ہے۔ ارے جلدی سے اسے ڈیرے پر لے چلو۔ ارے دھنوا! تو پلیا کی طرف جا اور خان جی کو خبر کر دے کہ چھوٹے خان جی مل گئے ہیں۔ بھاگ کر جا خان جی اس کی تلاش میں ادھر گئے ہیں۔"

ایک آدمی دوسری طرف کو دوڑا۔

انہوں نے بے ہوش لڑکے کو اٹھا لیا تھا اور جس طرف روشنی ہو رہی تھی ادھر کو چلنے لگے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"کیوں بے چھوٹے خان کو کس نے زخمی کیا ہے۔ ہمیں بتا ہم ابھی اس کا کام تمام کیے دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس پر ریچھ نے حملہ کیا تھا۔ یہ بڑا زخمی تھا میں نے اس کے کراہنے کی آواز سنی تو اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے اپنا ٹھکانہ بتا دیا تھا۔ میں اسی طرف اسے لے کر جا رہا تھا۔"

اس آدمی نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"شاباش رے! تو نے بڑا کمال دکھایا چل۔ ہمارے ساتھ چل تو بھی۔"

پہلے تو میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں پھر دیکھا کہ بھاگنے کا مقام نہیں تھا۔ اتنے میں مجھے ایک تالاب نظر آیا۔ تالاب اس طرف نظر آیا کہ دوسری جانب درختوں میں جو روشنی ہو رہی تھی اس کا عکس

تالاب کے پانی پر پڑ رہا تھا۔ بے ہوش لڑکے کو اٹھائے یہ لوگ تالاب کے دوسرے کنارے آ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ یہاں آ کر دیکھا کہ درختوں کے نیچے چھ سات چھولداریاں یعنی چھوٹے چھوٹے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں اور بھی آدمی خیموں میں سے باہر نکل آئے۔ وہ بے ہوش لڑکے کو فوراً ایک چھولداری کے اندر لے گئے۔ میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چھولداریوں کے درمیان ایک درخت کے تنے کے ساتھ لالٹین روشن تھی۔

اندھیرے میں مجھے کچھ گھوڑوں کے کھر زمین پر مارنے اور کھر کھر کرنے کی آوازیں آئیں تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ لوگ یقیناً کوئی ڈاکو تھے۔ مجھے اس لیے بھی ان سے خوف محسوس نہ ہوا کہ میں نے ان کے سردار کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ وہ میرے ساتھ کسی قسم کا تشدد آمیز سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن میں وہاں سے بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ایک آدمی پانی سے بھرا ہوا مٹی کا پیالہ لے کر میرے پاس آ گیا۔

"لے بے پانی پی لے۔ تو بڑا بہادر لڑکا ہے۔ کیا نام ہے تیرا؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ وہ ہنس کر بولا۔

"مسلمان کا بچہ ہے جب ہی اتنا بہادر ہے۔"

میں نے پانی پیا تو کچھ جان میں جان آئی۔ اتنے میں دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر میں دو گھڑ سوار درختوں جھاڑیوں میں سے نمودار ہوئے۔ ایک گھڑ سوار جلدی سے گھوڑے پر سے چھلانگ لگا کر اترا۔ اس کے کاندھے پر بندوق لگی تھی۔ اس نے پکار کر پوچھا۔

"کہاں ہے میرا بیٹا؟"

دوسرے آدمی اسے اور دوسرے گھڑ سوار کو چھولداری میں لے گئے۔ یہ پہلے والا اونچا لمبا بھاری بھر کم ڈیل ڈول والا آدمی اس زخمی لڑکے کا باپ اور ڈاکوؤں کا سردار بھورے خان ہی ہو سکتا تھا۔ میں اکیلا پتھر پر بیٹھا تھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک چھولداری کے اندر رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ پھر بھورے خان چھولداری سے نکل کر باہر آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے، اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"ابے شبراتی! وہ لڑکا کہاں ہے جو میرے بیٹے کو جنگل سے اٹھا کر لایا ہے؟"

شبراتی بھورے خان کو میرے پاس لے آیا میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھورے خان کو سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر اس نے دونوں بازو کھول کر مجھے اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی کمر کے ساتھ کارتوسوں کی جو بیلٹ بندھی تھی وہ میری پسلیوں میں چبھنے لگی۔ میں نے سانس روک لیا۔ بھورے خان نے مجھے بھرپور انداز میں دو تین بار تھاپی دی اور کہا۔

"بیٹا تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ چل آ میرے ساتھ خیمے میں آ جا۔"

بھورے خان کے خیمے میں بھی ایک لیمپ روشن تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ کونے میں پانی کی صراحی سلور کے گلاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دوسرے کونے میں چھ سات بندوقیں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ چٹائی پر گاؤ تکیے ادھر ادھر پڑے تھے۔ بھورے خان نے اپنی بندوق اور میگزین کی بیلٹ اتار کر دیوار سے لٹکا دی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا۔ آنکھوں کا رنگ گہرا بادامی تھا۔ بھنوئیں گھنی تھیں۔ چوڑے ناک کے نیچے بڑی بڑی

مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ کے پاس زخم کا لمبا نشان نیچے تک آیا ہوا تھا۔ سیاہ بالوں کے پٹے تھے اس نے صدری اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میں نے لڑکے کا حال پوچھا تو وہ ہنس کر بولا۔

"ارے وہ بھورے خان کا بیٹا ہے۔ کچھ نہیں ہوتا اسے۔ ریچھ نے ران کا گوشت پنجے مار مار کر ادھیڑ ڈالا ہے۔ ہمارے وید جی نے مرہم لگا دیا ہے۔ صبح تک ہوش آ جائے گا۔ اچھا یہ بتا تو کون ہے اور تو جنگل میں رات کے وقت کیا کر رہا تھا؟ مجھے تو تو پولیس کا بھیجا ہوا آدمی لگتا ہے جو میری ٹوہ میں ادھر آیا تھا۔"

میں کچھ کہنے لگا تو بھورے خان ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سر کے بالوں میں زور سے ہاتھ پھیر کر بولا۔

"ابھی تو سو جا۔ صبح تم سے باتیں ہوں گی۔ کچھ بھی ہو تو نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ ورنہ پولیس کا بھیجا ہوا کوئی آدمی بھورے خان کے ٹھکانے سے زندہ بچ کر نہیں گیا۔"

وہ چھولداری سے نکلتے ہوئے رک گیا۔ میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پوچھا۔

"ارے تجھے بھوک تو نہیں لگی؟"

پھر ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کم بخت کو بھی مجھ پر پولیس کے آدمی ہونے کا شک ہو رہا تھا۔ خیر ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈاکوؤں کی کمین گاہ کے آس پاس کوئی اجنبی چلتا پھرتا پکڑا جائے تو ڈاکو یہی سمجھتے ہیں کہ اسے پولیس نے ان کا سراغ لگانے کے لیے بھیجا ہوگا۔ بہر حال اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ یہ لوگ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

میں وہیں چٹائی پر لیٹ گیا۔ اتنے میں چھولداری کا پردہ ہٹا اور ایک آدمی میرے لیے روٹیاں لے آیا۔ تین روٹیاں تھیں، جن پر بھنے ہوئے مرغ یا مرغی کی دو ٹانگیں رکھی تھیں۔ روٹیوں کی چنگیر میرے سامنے رکھ کر وہ آدمی یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ پانی صراحی میں سے پی لینا۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ بڑے مزے سے دو روٹیاں بھنے ہوئے مرغ کے ساتھ کھائیں۔ پانی پیا اور گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا کچھ بھورے خان کے بیٹے کا بوجھ اٹھانے سے اور کچھ پٹیل کے آدمیوں نے میری جو پٹائی کی تھی اس سے جسم سخت درد کر رہا تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا اور سونے کو آرام دہ جگہ ملی تو لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب کافی دن نکل آیا تھا۔ چھولداری کے پردے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ باہر بھورے خان کے آدمیوں کے چلنے پھرنے ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ آسمان پر سے بادل اتنے دنوں کے بعد چھٹ گئے تھے اور دھوپ درختوں میں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ بھورے خان ایک درخت کے نیچے بانس کی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ دو ڈاکو اس کے پیچھے بندوقیں اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک ڈاکو اس کے پاؤں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بھورے خان نے مجھے دیکھا تو دور سے آواز دے کر بلایا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اس نے مجھے پاس چارپائی پر بٹھا لیا اور جو آدمی زمین پر بیٹھا تھا اسے کہا۔

"جا بے لڑکے کے لیے ناشتہ لے آ۔"

وہ آدمی چلا گیا تو بھورے خان میری طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے میرا نام لے کر کہا۔

"دیکھ بے! تو نے میرے بیٹے کی جان بچا کر مجھ

پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں ضرور چکاؤں گا ہی لیکن تجھے بھی بتانا ہوگا کہ پولیس نے تجھے میرا اسراغ لگانے کے لیے اکیلا ہی بھیجا تھا یا تیرے ساتھ کوئی اور بھی خفیہ والوں کا آدمی تھا۔"

پھر اس نے اپنے باڈی گارڈوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لو جی اب پولیس والوں نے نوجوان لڑکوں کو بھی میری جاسوسی کرنے کے لیے بھرتی کرلیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خان جی! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے کسی پولیس نے نہیں بھیجا۔ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔"

بھورے خان کی بھنوئیں چڑھ گئیں۔

"تو پھر آدھی رات کو تو جنگل میں کیا کرتا پھر رہا تھا؟"

بھورے خان نے اپنے ایک آدمی کو آواز دے کر بلایا اور کہا۔

"ذرا اس لڑکے کی تلاشی تو لو۔"

اس آدمی نے میری تلاشی لی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس آدمی کے آگے پوری کہانی کھول کر بیان کردوں۔ میں نے کہا۔

"خان جی! اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں آدھی رات کو جنگل میں کیا کر رہا تھا تو پھر سنیے۔ میں آپ کو شروع سے آخر تک سب کچھ سچ سچ بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو اختیار ہوگا کہ میری داستان سن کر اس پر اعتبار کریں یا نہ کریں۔"

میں نے مختصر الفاظ میں بھورے خان کو اپنی ساری داستان بیان کردی۔ ٹھاکر ڈاکو اور رام دلاری کا بھی ذکر کیا کہ کس طرح میں اسے ڈاکوؤں کے ڈیرے سے نکال کر لایا۔ اس کے بعد بمبئی آنے اور بمبئی کے بڑے مندر کا ذکر کیا اور اسے بتایا کہ کس طرح مندر کے بڑے مہنت نے بمبئی کے ایک غریب مسلمان محنت کش کی بیٹی عائشہ کو اغوا کروا کر مندر کی کوٹھڑی میں بند کردیا اور پھر میں نے کیسے اسے وہاں سے نکال کر اس کے ماں باپ کے پاس پہنچایا اور کمینے مہنت نے کس طرح اس غریب بے کس و مجبور مسلمان لڑکی کو پولیس کے ذریعے وہاں سے بھی اٹھوایا اور گنگولی نام کے ایک بدمعاش پجاری کے ہاتھ بیچ دیا جو اسے لے کر چاردھا سٹیٹ کی طرف نکل گیا۔ پھر میں کس طرح مسلمان لڑکی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور کس طرح بیروگڑھ سے نانڈا کے قصبے میں پہنچا کیونکہ مجھے خبر ملی تھی کہ بیروگڑھ کے پٹیل نے لڑکی کو گنگولی سے خرید کر نانده کے جنگل میں اپنے ڈیرے پر قید کر رکھا ہے۔

میں نے شروع سے آخر تک ساری کہانی بیان کردی اور اسے بتایا کہ کس طرح پٹیل کے آدمی مجھے ہلاک کرنے کے لیے ٹیلے پر لے گئے پھر کس طرح میں وہاں سے جان بچا کر بھاگا اور جنگل کے اندھیرے میں ایک جگہ سانس لینے کے لیے رکا تھا کہ مجھے کسی انسان کے کراہنے کی آواز آئی۔

"وہ آپ کا بیٹا چھوٹے خان جی تھا۔ وہ سخت زخمی تھا اور خون کافی بہہ چکا تھا۔ اس وقت آپ کا بیٹا ہوش میں تھا۔ اس نے مجھے آپ کے ڈیرے کا ٹھکانہ بتایا اور میں اسے کندھے پر ڈال کر آپ کے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ آپ کے آدمیوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔"

جب میں نے بھورے خان کو اپنی داستان سنا رہا تھا تو اس کی بھوری آنکھوں والی کرخت چہرے پر بدلتے ہوئے تاثرات کا بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب اس نے میری زبانی سنا کہ پٹیل نے ایک

مسلمان لڑکی کو اپنے ڈیرے پر قید کر رکھا ہے تو اس کی بھوری آنکھوں میں شعلے سے چمکنے لگے تھے جب میں نے اپنی ساری کہانی سنا ڈالی تو بھورے خان نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

میں نے فوراً جواب دیا۔

"اگر اس میں ذرا بھی جھوٹ نکلے تو بے شک مجھے شوٹ کردیں۔"

بھورے خان نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ چارپائی سے اچھل کر اٹھا اور اپنے باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر غضب ناک آواز میں بولا۔

"ہم ابھی پٹیل کے بھٹوں پر جائیں گے گھوڑے نکالو۔"

باڈی گارڈ نے دبی زبان میں کہا۔

"خان جی! ذرا اندھیرا ہو لینے دیں۔"

بھورے خان نے باڈی گارڈ کو زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"مسلمان لڑکی کی عزت سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور تم کہتے ہو ذرا اندھیرا ہو لینے دو۔"

یہ کہہ کر بھورے خان اپنی چھولداری میں گھس گیا۔ باہر آیا تو میگزین کی بیلٹ باندھ رہا تھا اور بندوق اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے گرج کر حکم دیا۔

"گھوڑے نکالو۔"

پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

......☆☆☆......

بھورے خان ڈاکو کے ڈیرے سے تین گھوڑے اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ ایک گھوڑے پر بھورے خان بیٹھا تھا۔ دوسرے گھوڑے پر اس کا ساتھی ڈاکو سوار تھا اور تیسرے گھوڑے پر میں تھا۔ تینوں گھوڑے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ گھنے جنگل میں گھوڑے قدم قدم چلتے جب ایک کھلی جگہ پر آئے تو بھورے خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا دوڑنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہمارے گھوڑے بھی دوڑنے لگے۔ جس گھوڑے پر میں بیٹھا تھا وہ اپنے ساتھیوں کی بو پر اپنے آپ راستہ بناتا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا مگر دن کی روشنی کافی تھی۔ ہم جنگل کے ایک شارٹ کٹ یعنی آسان راستے سے گزر کر نانده کے جنگل میں آ گئے۔ بھورے خان نے گھوڑے کو روک لیا اور اپنے ساتھی ڈاکو سے کہا۔

"پٹیل کا بھٹہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بندوق تیار رکھنا۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو نانده کے گھنے جنگل میں ڈال دیا۔ یہ لوگ جنگل میں جس راستے سے آئے تھے وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ جب ہمارے گھوڑے ایک پرانے تالاب کے قریب سے گزرے تو مجھے کچے کوئلوں کی بو آئی۔ ہمارے گھوڑے قدم قدم چلتے گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ بھورے خان نے رائفل کاندھے پر ڈال رکھی تھی۔ جب وہ ندی ہم نے پار کی جس کی دوسری طرف پٹیل کا جنگل والا مکان اور کوئلوں کا بھٹہ تھا تو بھورے خان گھوڑے سے اتر پڑا۔ ہم نے گھوڑے ایک جگہ باندھ دیئے۔ بھورے خان میری طرف متوجہ ہوا آہستہ سے بولا۔

"پٹیل کی کوٹھڑی کس طرف ہے؟ اس کا بھٹہ تو ان درختوں کے پیچھے ہے۔"

بھورے خان نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں اس کے

پیچھے پیچھے تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد پٹیل کے مکان کی دیوار دکھائی دی۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو بھورے خان نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف ہونے کو کہا۔ میں جلدی سے دیوار کے کونے والے درخت کے تنے کے پیچھے ہو گیا۔ یہاں سے مجھے پٹیل کے مکان کے سامنے والا صحن نظر آ رہا تھا۔ یہاں پٹیل کے تین غنڈے بڑے اطمینان سے بیٹھے شاید دارو پی رہے تھے۔ بھورے خان اور اس کا ساتھی ڈاکو موت کے فرشتے بن کر ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دونوں ڈاکو مکان کی دوسری دیوار سے نکل کر اچانک ان غنڈوں کے سامنے آ گئے۔ بھورے خان کی رائفل سے دو بار شعلے نکلے۔ دو دھماکے ہوئے اور دو غنڈے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ تیسرے کی گردن پر دوسرے ڈاکو نے بندوق کی نالی لگائی اور پوچھا۔

"کہاں ہے پٹیل؟"

اتنے میں مکان کے اندر سے بندوق کا فائر آنے لگا۔ اس دوران بھورے خان مکان کے پیچھے جا چکا تھا۔ اس کے ساتھی ڈاکو نے تیسرے غنڈے کی گردن میں بندوق کا فائر کر دیا۔ وہ گرا، ساتھی ڈاکو چھلانگ لگا کر ایک درخت کے پیچھے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا اور مکان کے دروازے کی جانب گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بھورے خان کی آواز جنگل میں گونجی۔

"پٹیل! جان کی سلامتی چاہتا ہے تو باہر نکل آ۔ میں بھورے خان بول رہا ہوں۔ میرے آدمیوں نے تیرے ڈیرے کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی بھورے خان کی رائفل نے اوپر تلے تین چار فائر کر دیئے۔ اس کا ساتھی ڈاکو پہلے ہی فائرنگ کر رہا تھا۔ جنگل رائفل اور بندوق کے دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ بھورے خان کے الفاظ نے اپنا کام دکھا دیا۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے دیکھا کہ پٹیل اپنے دو باڈی گارڈ غنڈوں کے درمیان ہاتھ اوپر اٹھائے کانپتا ہوا مکان میں سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ اس کے باڈی گارڈ نے اپنی بندوقیں نیچی کر رکھی تھیں۔

بھورے خان نے دیوار کی اوٹ سے بلند آواز میں دونوں باڈی گارڈز کو حکم دیا کہ بندوقیں پھینک دو۔ دونوں غنڈوں نے بندوقیں پھینک دیں۔ بھورے خان رائفل پکڑے دیوار کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کا ساتھی ڈاکو درخت کے تنے کی پیچھے ہی گھات لگائے لیٹا رہا۔

بھورے خان نے پٹیل کے دونوں محافظ غنڈوں کو زمین پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر بیٹھے بھورے خان کی رائفل نے پے در پے دو فائر کیے۔ دونوں غنڈے وہیں اوندھے ہو کر گر گئے۔ پٹیل تو تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے سامنے اس کے پانچ محافظ غنڈوں کی لاشیں پڑی تھیں اور بھورے خان اس کی موت کا پیغام لیے موجود تھا۔

بھورے خان نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر پاس بلایا اور پٹیل کی توند پر رائفل کی نالی لگاتے ہوئے پوچھا۔

"مسلمان لڑکی کہاں ہے؟"

پٹیل ہاتھ جوڑے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اس نے کہا۔

"اندر...... اندر ہے گورو دیو!"

اب بھورے خان نے مجھے آواز دی کہ آ جاؤ۔ میں قریب آیا تو بھورے خان نے مجھے کہا۔

"اندر جا کر لڑکی کو پہچانو اور باہر لے آؤ۔"

میں جلدی سے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بمبئی کی جھونپڑیوں کی

بچی والی لڑکی عائشہ سہمی ہوئی دیوار کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ حیران ہو کر بولی۔

"خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی تم میرے ساتھ باہر آؤ۔"

میں اسے باہر لے آیا اور بھورے خان سے کہا۔

"یہی عائشہ ہے، میں اسے پہچانتا ہوں۔"

بھورے خان نے اپنے ساتھی ڈاکو سے کہا۔

"کیوں بھئی اس پٹیل کو کیا سزا ملنی چاہیے؟"

ساتھی ڈاکو نے کہا۔

"خان جی میرا تو خیال ہے کہ اسے چھوڑ دیں۔"

بھورے خان نے رائفل پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ جا بے پٹیل، تجھے معاف کیا۔ جا مکان کے اندر چلا جا۔"

پٹیل کو تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی حیران تھا کہ بھورے خان نے اسے کیوں معاف کیا ہے۔ پٹیل نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر بھورے خان کا شکریہ ادا کیا اور شکریہ ادا کرتا ہوا واپس مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے پیٹھ موڑی بھورے خان کی رائفل نے شعلہ اگلا۔ دھماکے کے ساتھ گولی بدمعاش پٹیل کی کمر میں سوراخ ڈالتی اس کے پیٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ پٹیل منہ کے بل گرا اور اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر ٹھنڈا ہو گیا۔

عائشہ میرے پاس کھڑی خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ بھورے خان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹی اس کافر کو اس کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ گھبراؤ مت۔ تجھے تیرے ماں باپ کے پاس پہنچا دیں گے۔"

وہیں سے پٹیل کی ایک گھوڑی کھول کر اس پر عائشہ کو بٹھایا ہمارا قافلہ واپس روانہ ہو گیا۔ ڈیرے پر آ کر بھورے خان نے عائشہ سے کہا۔

"بیٹی! تو میری بیٹی کی طرح ہے۔ سمجھ لے تو اپنے باپ کے ڈیرے پر آ گئی ہے۔"

عائشہ کو الگ چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا۔ باہر ایک آدمی کا پہرہ لگا دیا گیا۔ بھورے خان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے اس بچی کے ماں باپ کس شہر میں رہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، میں ان سے مل کر اس جنگل میں آیا تھا۔"

پھر میں نے بھورے خان کو شہر کا نام اور محلے کا سارا پتہ بتا دیا۔ بھورے خان نے عائشہ سے اس کی تصدیق کی۔ عائشہ نے کہا۔

"ہاں اس شہر میں میری ایک خالہ رہتی ہے۔ میرے ابا امی بمبئی چھوڑ کر یہیں آ گئے ہوں گے۔"

دوسرے روز بھورے خان نے ہمارے ساتھ دو آدمی کر دیئے۔ یہ دونوں بڑے خونی ڈاکو تھے مگر انہوں نے بڑا شریفانہ لباس پہن لیا تھا۔ مگر اپنے شریفانہ لباس کے اندر انہوں نے ایک ایک ریوالور ضرور رکھ لیا تھا۔ ہم صبح صبح عائشہ کو لے کر ڈیرے سے نکلے۔ چاردھا گاؤں سے ہم بس میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں سے ایک پسنجر ٹرین میں سوار ہوئے۔ راستے میں ایک ٹرین بدلنی پڑی۔ شام ہو رہی تھی جب ہم عائشہ کی خالہ کے شہر میں داخل ہوئے۔ عائشہ کو اپنی خالہ کے گھر کا پتا معلوم تھا۔ میں نے بھی مکان دیکھا ہوا تھا۔ جب ہم عائشہ

کو لے کر گھر میں داخل ہوئے تو عائشہ کا باپ اور ماں اور خالہ عائشہ کو دیکھ کر رونے لگ پڑے۔ یہ خوشی کا رونا تھا۔ ماں تو بار بار اپنی بیٹی کو سینے سے لگاتی اور خدا کا شکر ادا کرتی۔ انہوں نے ہمارا بے حد شکریہ ادا کیا۔ ہمارے لیے بیٹھک میں زمین پر بستر لگا دیے۔ غریب آدمی تھے۔ بستر کیا لگانے تھے۔ بس دری بچھا کر سرہانے رکھ دیئے گئے۔ عائشہ کے باپ کو میں نے خونی ڈاکوؤں کی بابت یہی بتایا کہ یہ گاؤں کے شریف دیہاتی ہیں۔ انہوں نے عائشہ کو بدمعاش پٹیل کے گھر سے نکلوانے میں میری بڑی مدد کی ہے اور اپنی حفاظت میں لڑکی کو یہاں تک لائے ہیں۔

دونوں خونی ڈاکو چپ تھے۔ کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے تھے۔ ہر بات کا جواب ہوں ہاں میں دیتے اور خاموش رہتے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھک میں سونے لگے تو ایک خونی ڈاکو نے مجھ سے پوچھا۔

"ہم منہ اندھیرے چلے جائیں گے۔ کسی سے ملیں گے نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اس طرح چلے گئے تو میں میزبان کو کیا کہوں گا کہ مہمان راتوں رات کہاں غائب ہو گئے؟"

دونوں ڈاکو اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے۔ دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"ہم تمہارے میزبان کے نوکر نہیں ہیں کہ ان سے اجازت مانگ کر جائیں۔"

پہلے والا ڈاکو اپنے ریوالور کو سرہانے کے نیچے رکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میں بھی واپس اپنے گھر پنجاب چلا جاؤں گا۔"

اس نے مجھے بڑی مزیدار پیش کش کی۔ کہنے لگا۔

"تم ہماری ٹولی میں کیوں نہیں شامل ہو جاتے؟ پنجاب کے لوگ بڑے جی دار ہوتے ہیں۔ بہادر ہوتے ہیں، تم بڑے اچھے ڈاکو بن سکتے ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"میں ڈاکو نہیں بننا چاہتا۔"

"تو پھر کیا بننا چاہتے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میں ڈاکٹر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ ایک بولا۔

"ڈاکٹر تو ہم سے زیادہ خونی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہر ڈاکٹر ایسا نہیں ہوتا۔"

دوسرے ڈاکو نے کہا۔

"میری نصیحت مانو اور ہمارے گروہ میں شامل ہو کر ڈاکو بن جاؤ۔ ہمارے علاقے میں ڈاکوؤں کا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ ویسے بھی اس علاقے میں ڈاکوؤں کی بڑی مانگ ہے۔ غریب لوگ تو ڈاکوؤں کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ابھی تو میں اپنے وطن پنجاب جاؤں گا۔ اگر وہاں جا کر ڈاکو بننے کا خیال آیا تو سیدھا بھورے خان کے ڈیرے پر پہنچ جاؤں گا۔"

میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ دونوں ڈاکوؤں کے خراٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس کے بعد میں بھی سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے میرا کندھا ہلا کر مجھے جگا دیا۔ بیٹھک کی بتی جل رہی تھی۔ دونوں ڈاکو واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جس ڈاکو نے میرا کاندھا ہلایا تھا وہ کہنے لگا۔

"ریل کا کرایہ ہے؟"

حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں نے جیبیں ٹٹول کر دیکھا۔ میرے پاس چار پانچ روپے ہی باقی رہ گئے تھے اسی ڈاکو نے مجھے بیس روپے دیئے اور کہا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ ان پیسوں میں پنجاب پہنچ جاؤ گے۔"

اس کے بعد انہوں نے ریوالور کھول کر چیک کیے۔ انہیں قمیضوں کے اندر چھپایا اور مجھ سے سلام لیے بغیر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔ اسی رات میں بھی عائشہ کی خالہ کے گھر سے اپنے وطن کے لیے روانہ ہو گیا۔ عائشہ کا باپ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آیا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ میرے بیٹے تم کو خدا نے رحمت کا فرشتہ بنا کر ہمارے گھر بھیج دیا تھا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہماری بیٹی خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ میں اسے یہی کہتا کہ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوا ہے۔ اگر وہ مجھے توفیق عطا نہ کرتا تو میں کبھی بھی ہمت نہ کر سکتا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے کہ میری ٹرین دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی سے مجھے پنجاب کے لیے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔ اگلے دن صبح کے وقت میں دلی پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک گھنٹے بعد میں پنجاب میل میں جسے اس زمانے میں طوفان میل بھی کہا کرتے تھے بیٹھا اور اپنے شہر امرتسر پہنچ گیا۔ گھر والے اس دوران مجھے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کر کر کے تھک چکے تھے۔ ویسے انہیں میری آوارہ گرد سیلانی طبیعت کا علم تھا لیکن اتنی دیر میں کبھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے سفر کی الف لیلیٰ کی داستان سنائی تو کسی کو یقین نہ آیا۔ میرے دوست بڑے مزے لے لے کر ڈاکوؤں کے واقعات سنتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالم گیر جنگ اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ اس وقت جاپان جنوب مشرقی ایشیاء میں آگے بڑھتا ہوا آسام کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ جاوا، سماٹرا، فلپائن اس کے قبضے میں آ چکے تھے مگر ہندوستان پر جنگ کی تباہ کاریوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بلکہ یہاں کے لوگ فوجی میٹریل کی سپلائی کے ٹھیکے لے کر بڑے امیر بن گئے تھے اور ملٹری کنٹریکٹرز کا ایک نیا امیر طبقہ پیدا ہو گیا تھا جن کے ہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ کچھ روز میں امرتسر میں رہا۔ اس کے بعد پھر میرے پاؤں میں کھجلی ہونے لگی۔ پاؤں میں جو چکر پڑا تھا وہ گردش میں آ گیا۔ اور میں ایک روز چپکے سے گھر سے نکل کر امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور پشاور سے آنے والی فرنٹیئر میل میں بیٹھ کر دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس بار میری منزل کلکتہ تھی۔ کلکتے میں اس سے پہلے بھی تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔ وہاں ہمارے کچھ رشتے دار کشمیری شالوں کا دھندا کرتے تھے۔ مگر میں ان کے ہاں جا کر ٹھہرتا نہیں تھا۔ ٹھہرتا میں اپنے ایک دوست کے پاس تھا۔ میرے اس دوست کا نام جان تھا۔ پورا نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا تھا۔ جان محمد یا محمد جان تھا۔ بہرحال میں اسے جان ہی کہتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا بڑا تھا اور کلکتے میں اپنے بڑے بھائی کے پاس اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کا بھائی ہانگ کانگ، سنگاپور سے سیلولائیڈ کی شیٹیں منگوا کر پنجاب کے شہروں میں سپلائی کرتا تھا۔ اس کا کلکتے کے مشہور بازار لوئر چت پور روڈ کی سراج بلڈنگ میں دفتر تھا۔ وہیں ایک کمرے میں اس کی رہائش بھی تھی۔

جن دنوں میں بمبئی کے جنگلوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے سفر کے بعد کلکتے پہنچا تو ان دنوں جان کے بڑے بھائی کی فیملی نیپال گئی ہوئی

تھی۔ مجھے دیکھ کر جان بڑا خوش ہوا کہنے لگا۔

''تم کب آئے۔ خط لکھ کر بتا دیتے میں اسٹیشن پر لینے آ جاتا۔''

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''خط لکھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تھوڑی دیر پہلے خیال آیا کہ کلکتے کی سیر کی جائے اور سٹیشن پر آ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ تم سناؤ۔ بھائی جان کی فیملی کہاں ہے؟''

جان اس وقت دری پر بیٹھا سلولائیڈ کی شیٹیں گن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''وہ تو سارے نیپال گئے ہوئے ہیں۔ یہاں کلکتے میں بڑی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ جاپان کی فوجیں کلکتے پہنچنے والی ہیں۔ انگریز یہاں سے بھاگ رہا ہے۔ بھابی اپنے بچوں کے ساتھ گھبرا رہی تھیں۔ بھائی جان نے کہا کہ امرتسر جا کر کیا کرو گی نیپال چلے چلتے ہیں۔ وہاں اپنا مکان بھی ہے۔ بس وہ نیپال چلے گئے۔ تم بتاؤ کھانا کھایا ہے کہ میں بازار سے منگواؤں؟''

میں نے کہا۔ ''کھانا میں نے بردوان کے اسٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔''

''تمہارا سامان کہاں ہے؟''

جان نے مجھ سے سوال کیا۔ پھر خود ہی اپنے سوال پر شرمسار سا ہو کر بولا۔

''میں بھول گیا تھا کہ سامان تو تم کبھی ساتھ لے کر نہیں چلتے۔ ذرا ٹھہرو۔ تھوڑا کام باقی رہ گیا ہے ابھی امجدیہ ہوٹل چل کر چائے پیتے ہیں۔''

جو لوگ پاکستان بننے سے پہلے کلکتے میں رہے ہیں، انہیں معلوم ہوگا کہ امجدیہ ہوٹل کلکتے کی بھاری مسلم اکثریت والی آبادی ذکریا اسٹریٹ میں واقع تھی۔ یہاں کی مسلم اکثریت میں بنگالی مسلمانوں کے علاوہ پنجاب کے خاص طور پر امرتسر کے شال باف، شال مرچنٹ کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہمارے رشتے دار بھی ذکریا سٹریٹ میں ہی رہتے تھے۔ میں ان سے سلام دعا لینے ایک آدھ بار ضرور چلا جاتا تھا مگر ان کے ہاں ٹھہرا کبھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے بگڑا ہوا آوارہ لڑکا سمجھتے تھے اور اکثر طنزیہ انداز میں مجھ سے بات کرتے۔ مثلاً مجھے دیکھتے ہی کہتے۔

''اچھا آ گئے ہو گھر سے بھاگ کر؟ آپو جی کو بتا کر آئے ہو کہ نہیں؟ کلکتے سے واپسی کا کرایہ ہے کہ نہیں؟''

چنانچہ اس بار بھی میں کلکتے گیا تو اپنے دوست جان کے پاس ہی ٹھہرا۔ بلکہ میں نے رشتے داروں کے ہاں جانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جان جب کام سے فارغ ہو گیا تو ہم ذکریا اسٹریٹ والے امجدیہ ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس ہوٹل کا کھانا اور چائے بڑی مشہور تھی۔ ہم نے چائے پی اور امرتسر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے جان کو اپنے بمبئی والے ایڈونچر کی باتیں سنائیں تو اسے بالکل یقین نہ آیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔

''گپ نہ لگایا کرو۔''

ہم نے اسی روز دوپہر کے بعد دریا کی سیر کا پروگرام بنا لیا۔ کلکتے میں دریائے ہگلی بہتا ہے۔ اس کا اصل نام دریائے جمنا ہے مگر کلکتے آتے آتے اس کا نام ہگلی پڑ جاتا ہے۔ گنگا کی طرح ہندو لوگ اس دریا کو بھی مقدس سمجھتے ہیں اور درگا پوجا کے تہوار پر درگا دیوی کے بانس اور کاغذ کے بنے ہوئے بت اسی دریا میں بہاتے ہیں۔

مئی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ پنجاب میں تو اس مہینے میں گرم ہوائیں چلتی ہیں مگر بنگال میں یہ مون سون کا موسم ہوتا ہے اور بارشیں شروع ہو جاتی ہیں۔

اس روز بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہم دریا پر پہنچے تو بڑی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہاں پر دریا کا ایک گھاٹ تھا وہاں سے ہم نے ایک کشتی کرائے پر لی۔ بنگالی ملاح ساتھ ہی تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھے دریا کا نظارہ کرنے لگے۔ گھاٹ پر لوگ دریا میں چھلانگیں بھی لگا رہے تھے۔ حالانکہ دریا مون سون کے سیزن میں چڑھا ہوا تھا مگر بنگالی لڑکے بڑے ماہر تیراک ہوتے ہیں۔ ہم کشتی میں ایک بار دریا کے دوسرے کنارے پر گئے پھر واپس آ گئے۔ ابھی ہماری کشتی گھاٹ کے پاس ہی تھی کہ ایک جانب اچانک شور بلند ہوا۔ لوگ بنگلہ زبان میں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ ہم نے اس طرف دیکھا کہ ایک لڑکا دریا میں ڈوب رہا تھا۔ وہ سر باہر نکال کر زور سے ہاتھ ہلاتا اور دریا کی لہریں اسے اپنے اندر کھینچ لیتیں۔ اس کا فاصلہ ہماری کشتی سے کوئی بمشکل تیس چالیس گز ہوگا۔ خدا جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوبتے ہوئے لڑکے کی طرف بڑھا۔ تیرنا میں نے بچپن میں ہی اپنے والد صاحب سے سیکھ لیا تھا۔ بلکہ انہوں نے مجھے زبردستی سکھایا تھا۔ امرتسر کی نہروں میں میں تیرتا ہوا ایک پل سے دوسرے پل کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ میں تیرنے میں بڑا ماہر ہو گیا تھا مگر نہروں میں تیرنا اور سیلابی دریا میں تیرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرا جذبہ تھا لڑکے کو بچانے کا میرا ارادہ تھا کہ جس نے مجھے دریا کی بپھری ہوئی موجوں میں بھی لڑکے کے پاس پہنچا دیا۔

میرے دادا بھی بڑے اچھے تیراک تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اگر کوئی آدمی دریا میں ڈوب رہا ہو تو اسے کیسے بچانا چاہیے۔ انہوں نے کہا تھا۔

''جو آدمی ڈوب رہا ہو، کبھی اس کے سامنے کی طرف سے مت آنا۔ وہ تو ڈوب رہا ہے وہ اپنی بانہیں تمہاری گردن میں ڈال کر تمہیں بھی ساتھ لے ڈوبے گا۔ ہمیشہ ڈوبتے آدمی کے پیچھے سے آؤ اور اپنا ایک بازو اس کی تھوڑی کے نیچے لے جا کر اس کا منہ پانی سے باہر نکال کر اسی طرح ایک بازو سے تیرتے ہوئے اسے کنارے کی طرف لے جانے کی کوشش کرو۔''

میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ کوئی بنگالی لڑکا تھا۔ عمر بارہ تیرہ سال ہوگی۔ پتلا جسم تھا۔ میں نے نیچے سے بازو ڈال کر اس کا منہ پانی سے باہر کر دیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ لڑکا نیم بے ہوش تھا۔ اتنے میں جان کشتی ہمارے قریب لے آیا۔ کشتی کے ملاح اور جان نے مل کر ہم دونوں کو کھینچ کر کشتی میں ڈال لیا۔ کنارے پر لڑکے کے رشتے دار پریشان حال کھڑے تھے۔ لڑکا بچ گیا تھا۔ جلدی سے اسے لٹا کر اس کے پیٹ میں گیا ہوا پانی نکالا۔ لڑکے کے رشتے دار پڑھے لکھے بنگالی لگتے تھے۔ ان میں سے ایک میرے پاس آیا اور انگریزی میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔ ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی صوبوں میں شروع ہی سے انگریزی عام بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ میں شکل سے ہی بنگالی نہیں لگتا تھا۔ اس لیے لڑکے کے انکل نے انگریزی میں مجھ سے بات کی تھی۔ ان صوبوں میں بچپن ہی سے آوارہ گردی کے دوران مجھے بھی انگریزی آ گئی تھی۔ اس نے مجھے بنگالی لڑکے کے گھر کا ایڈریس ایک چٹ پر لکھ کر دیا اور کہا۔

''گھر ضرور آنا۔ کمل کی ماتا اور پتا جی کو تم سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔''

وہ لوگ لڑکے کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ جان مجھ پر برس پڑا۔

”تم پاگل ہوگئے تھے کیا؟ تمہیں دریا میں چھلانگ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو میں تمہارے گھر والوں کو کیا جواب دیتا......؟“

میں آگے سے صرف ہنستا رہا۔ ہم واپس سراج بلڈنگ والے فلیٹ پر آ گئے۔ میں نے جان کو چٹ پر لکھا ہوا پتہ دکھایا۔ جان کو اتنی انگریزی نہیں آتی تھی مگر وہ انگریزی کے حرف پڑھ لیتا تھا۔ چٹ کو غور سے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”یہ کونوٹولہ سٹریٹ کا ایڈریس ہے۔ تمہیں وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

لیکن میں اس بنگالی لڑکے کے گھر جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ مجھے ایک بنگالی گھر کے رہن سہن کو دیکھنے کا موقع ملے گا اور دوسرے اس لیے بھی کہ وہاں میری آؤ بھگت ایک ہیرو کی طرح ہوگی۔

چنانچہ اگلے روز میں دس گیارہ بجے ٹرام میں بیٹھ کر بنگالی لڑکے کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس لڑکے کا نام اس کے انکل نے کمل بتایا تھا۔ مکان کا نمبر اور اسٹریٹ کا نمبر بھی چٹ پر لکھا ہوا تھا۔ میں کلکتے کے بازاروں اور علاقوں سے کافی واقف ہو چکا تھا۔ میں کمل کے مکان پر پہنچ گیا۔ یہ مکان بلکہ فلیٹ ایک کشادہ مگر گنجان آبادی والی گلی میں تھا۔ یہ پہلی منزل کا فلیٹ تھا۔ میں فلیٹ کے دروازے کے قریب گیا تو مجھے اندر سے بین کی آواز آئی۔ جیسے کوئی سپیرا بین بجا رہا ہو۔ میں نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے بنگالی لڑکے کمل کا وہی انکل کھڑا تھا جس نے مجھے فلیٹ کا ایڈریس دیا تھا۔ وہ خندہ پیشانی سے ملا اور مجھے اندر لے جا کر کمرے میں بٹھایا اور اب بنگلہ اردو میں بولا۔

”کاجل کو ناگ دیوتا رات کو آ کر سونگھ جاتا ہے۔ وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ سپیرا ناگ دیوتا کے منتر سے کاجل کا علاج کر رہا ہے۔ کاجل کمل کی بڑی بہن ہے۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بھجواتا ہوں۔“

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار پر درمیان میں درگا دیوی کی تصویر لگی تھی۔ ایک طرف سبھاش چندر بوس کی تصویر والا کلینڈر لگا تھا۔ بھاری صوفہ سیٹ کا کپڑا میلا ہوگیا تھا۔ یہاں سپیرے کے بین کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کمل کا انکل چلا گیا تھا۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جس پر پردہ گرا ہوا تھا۔ بین کی آواز اس طرف سے آ رہی تھی۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ دیکھنا چاہیے سپیرا کیا کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کے ایک طرف آیا اور پردے کو کنارے پر سے ذرا سا ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف بھی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دو تین عورتیں اور بنگالی مرد بیٹھے تھے۔ درمیان میں زمین پر بچھی ہوئی صف پر ایک سانولے رنگ کی نوجوان لڑکی ہاتھ باندھے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال کھلے تھے۔ سامنے ایک سپیرا منہ پھلا پھلا کر بین بجا رہا تھا اور دوسرا سپیرا ہاتھ میں کالا سانپ پکڑے بار بار سانپ کا پھن لڑکی کے منہ کے پاس لے جا کر جلدی سے پیچھے کر لیتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی پراسرار سانپوں کے مندر میں آ گیا ہوں۔ بنگالی لڑکے کمل کا انکل ایک عورت کے پاس جھک کر اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

میں جلدی سے واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے بین کی آواز کے ساتھ سانپ کی پھنکار سنائی دی۔

سانپ کی پھنکار کے ساتھ ہی سپیرے کی بین بجانے کی آواز بھی تیز ہوگئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا

جیسے سپیرا پھن دار سانپ کو نچا رہا ہے۔ لڑکی کی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ میں نہ رہ سکا۔ دوڑ کر دروازے کے پاس آیا۔ پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ اس وقت یہ منظر تھا کہ بنگالی لڑکی جس کا نام بقول بنگالی لڑکے کے انکل کے کاجل تھا صف پر بے ہوش پڑی تھی اور سپیرے نے سانپ کا منہ اس کے ماتھے سے لگا رکھا تھا۔ دوسرا سپیرا جھوم جھوم کر بین بجائے جا رہا تھا۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتیں، ادھیڑ عمر بنگالی مرد اور کمل کا انکل دم بخود کھڑے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سپیرے نے بین بجانی بند کر دی۔ بنگلہ زبان میں کوئی منتر اونچی آواز میں پڑھا اور سانپ کو دوسرے سپیرے کے ہاتھ سے لے کر پٹاری میں بند کر دیا۔ نیم بے ہوش لڑکی کاجل کو اس کے ماتا پتا اور انکل اٹھا کر چلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میں ایک بار پھر واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں اکیلے بیٹھے مزید دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس کے بعد کمل کا انکل کاجل کے ماتا پتا جی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بنگلہ زبان میں میری طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ کہا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔ ان میں سے ایک بنگالی لڑکے کمل کا باپ تھا اور ایک ماتا جی تھیں۔ یہ لوگ اردو زبان اچھی طرح بول لیتے تھے۔ اس کی وجہ انہوں نے بعد میں بتائی کہ وہ دس پندرہ برس دلی میں رہ چکے تھے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے کہ میں نے ان کے بیٹے کمل کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا۔

تینوں میرے پاس بیٹھ گئے اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ کاجل ان کی بیٹی تھی اور کمل کی بڑی بہن تھی۔ کاجل کا باپ کلکتہ کے ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وہ عمر کے حساب سے زیادہ بوڑھا لگتا تھا۔ چونکہ باتیں اردو میں ہو رہی تھیں اس لیے میں نے کاجل کے بارے میں پوچھا کہ اسے سانپ رات کو آ کر کیوں سونگھ جاتا ہے۔ کمل اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماتا نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ حیران تھی کہ یہ بات مجھے کس نے بتائی ہے۔ کاجل کے انکل نے بنگلہ زبان میں عورت سے کچھ کہا۔ یہی کہا ہوگا کہ یہ بات میں نے اسے بتائی ہے۔ ماتا جی نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر اردو میں کہا۔

”کاجل بیٹی کو دو برس پہلے ہم بلیشور کے ناگ مندر میں ناگ دیوتا کے درشن کرانے لے گئے تھے۔ وہاں ہماری بیٹی کاجل بھگوان ناگ کو پسند آ گئی۔ اب ہفتے میں ایک بار کسی بھی رات کو ناگ دیوتا آ کر کاجل کی پنڈلی پر منہ رکھ کر اسے سونگھتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔“

کاجل کا باپ فکر مند تھا۔ کہنے لگا۔

”کاجل بیمار رہنے لگی ہے۔ یہ سپیرے خاص ناگ مندر کے سپیرے تھے۔ یہ کہتے ہیں کہ کاجل کو ناگ مندر میں لے جا کر دو تین مہینے رکھنا پڑے گا تب وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

کاجل کی ماں عام ہندو عورتوں کی طرح توہم پرست اور دیوی دیوتاؤں سادھو سنتوں پر اندھا یقین رکھنے والی عورت تھی۔ کہنے لگی۔

”کوئی ہرج نہیں۔ اگر ناگ دیوتا کی یہی مرضی ہے تو ہم کاجل کو بلیشور کے ناگ مندر میں چھوڑ آئیں گے۔ یہ تو ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ ناگ دیوتا کو کاجل پسند آ گئی ہے۔“

کاجل کا انکل بھی ترقی پسند قسم کا آدمی تھا اور ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ کہنے لگا۔

”بھابی! اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کاجل کا علاج میں اپنے دوست ڈاکٹر سے کراؤں گا۔ وہ دو

ایک روز میں ٹھیک ہوجائے گی۔"

کاجل کی ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"تم چپ رہو جی۔ تم کیا جانو ناگ دیوتا پوجا پاٹھ کیا ہوتی ہے۔ تم ناستک ہو۔"

یہ کہہ کر کاجل کی ماں اٹھ کر چلی گئی۔ اتنے میں کمل بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر چائے پی۔ کلکتے کے مشہور رس گلے کھائے میں پھر کسی دن آنے کا وعدہ کرکے واپس سراج بلڈنگ کی طرف چل دیا۔

کاجل کو ہر ہفتے کی کسی رات کو سانپ آ کر پنڈلی پر منہ رکھ کر اسے سونگھ جاتا مجھے بڑی پراسرار بات لگی تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے فرش پر بیٹھی تھی۔ ایک سپیرا بین بجا رہا تھا۔ دوسرا سپیرا سانپ کا پھن اس کے چہرے کے پاس لا کر پیچھے لے جاتا تھا۔ یہ منظر ہندوستان کی قدیم داستانوں کی طرح کا منظر تھا۔ ہندو قوم بے انتہا توہم پرست ہے اور ان کی دیو مالا کی کہانیاں جانور آدھے انسانوں، آدھے جانوروں اور بھوت پریت اور بدروحوں سے اس بری طرح سے وابستہ ہیں کہ انہیں الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پس منظر میں مجھے بنگالی لڑکی کاجل بڑی اچھی لگی تھی۔

اس سے آپ ہرگز یہ مطلب نہ نکالیں کہ مجھے کاجل سے محبت ہوگئی تھی۔ ابھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری نوجوانی کی عمر تھی اور اس عمر کا تقاضا بھی تھا کہ مجھے کاجل ایسی پراسرار لڑکی یا جس کے ساتھ پراسرار واقعات منسلک ہیں وہ لڑکی مجھے اچھی لگے۔ میں تو دوسرے روز ہی کاجل کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اس کے گھر کی طرف چل پڑتا لیکن دل میں خیال آیا کہ وہ لوگ کہیں کسی شک میں نہ پڑ جائیں۔

اس لیے تین دن ڈال کر کاجل کے گھر گیا۔ اس وقت کاجل کا بھائی کمل اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا لڈو کھیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں بڑے خوش ہوئے۔ ان کی ماتا جی بھی آ گئیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور بولیں۔

"بیٹا تم کمل کے پاس بیٹھو میں تمہارے لیے شربت بنا کر لاتی ہوں۔"

میری بے قرار نگاہیں پراسرار بنگالی لڑکی کاجل کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمل کے پتا جی کہنے لگے۔

"کمل بیٹا تم دونوں لڈو کھیلو میں ذرا بازار سے ہو کر آتا ہوں۔"

جب میں اور کمل اکیلے رہ گئے تو میں نے لڈو کی گوٹیاں ٹھیک طرح سے لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کمل تمہاری دیدی کا کیا حال ہے؟ رات کو ناگ دیوتا تو اسے سونگھنے نہیں آیا؟"

کمل بولا۔ "دیدی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری دیدی کو سانپ کاٹتا نہیں کیا؟"

وہ کہنے لگا۔ "بھیا وہ کوئی سانپ تھوڑی ہے۔ وہ تو بلیشور مندر کا ناگ دیوتا جی ہیں جس کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اسے بالکل نہیں کاٹتے۔ ہماری دیدی کو ناگ دیوتا نے پسند کرلیا ہے۔"

لڑکے کمل پر بھی اس گھرانے کی صدیوں کی دیو مالائی روایات کا اثر تھا۔ وہ ناگ دیوتا کو سانپ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ مجھے بھی ناگ دیوتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو وہاں کاجل کو ایک نظر دیکھنے کے لیے آ گیا تھا۔ میں نے آخر کمل سے پوچھ ہی لیا کہ اس کی دیدی کاجل کہاں ہے وہ بولا۔

"دیدی تو بس اپنے پلنگ پر پڑی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اٹھ کر باہر آتی ہے۔ اس نے تو کالج جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

معلوم ہوا کہ کاجل کلکتے کے ایک کالج میں سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ جب سے راتوں کو سانپ کے سونگھنے کا چکر چلا یا ناگ دیوتا کے پجاریوں نے یہ چکر چلایا تھا وہ بیمار رہنے لگی تھی اور اس کا کالج جانا بھی ختم ہوگیا تھا۔ گھر کا ملازم لڑکا شیشے کے جگ میں شربت لے کر آ گیا۔ میں نے اور کمل نے مزے سے شربت پیا۔ کچھ دیر میں اس کے ساتھ لڈو کھیلتا رہا۔ صرف اس امید پر کہ شاید کاجل اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آ جائے مگر کاجل نہ آئی۔ میں نے کمل سے کہا۔

"میں پرسوں آؤں گا اور نئی لڈو لاؤں گا۔ یہ لڈو پرانی ہوگئی ہے۔ اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔"

کمل خوش ہو کر بولا۔ "ہاں بھئی ضرور لانا۔"

نئی لڈو کا تو ایک بہانہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں کاجل کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ دو دن کا وقفہ ڈالنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ تیسرے دن میں بازار سے ایک نئی لڈو خریدی اور کاجل کے گھر جا پہنچا۔ ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس زمانے میں بھی کلکتہ کے بنگالی ہندو، خاص طور پر ذرا پڑھے لکھے بنگالی ہندو گھرانوں کا ماحول آزاد ہوتا تھا۔ ایک ویسے ہی ہندوؤں میں عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ کلکتہ کے پڑھے لکھے ہندو گھرانوں میں تو لڑکیاں ہارمونیم بھی بجاتی ہیں اور رقص کرنا بھی سیکھ لیتی ہیں۔ عام طور پر وہ ہارمونیم پر اپنے عزیزوں اور مہمانوں کے سامنے رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت گا کر سناتی ہیں۔ ان گیتوں کی طرز بھی رابندر ناتھ ٹیگور کی بنائی ہوئی ہوتی ہے اور اس صنف موسیقی کو رابندر

سنگیت کہتی ہیں۔ اسی روز میں کاجل کے گھر لڈو لے کر گیا تو کاجل اپنے ماتا پتا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ہارمونیم سامنے میز پر رکھا تھا۔ ہارمونیم پر کاجل کی انگلیاں چل رہی تھیں اور وہ رابندر ناتھ ٹیگور کا کوئی بنگلہ گیت گا رہی تھی۔ کمل نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ میں پرنام کر کے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ کاجل نے اودھے رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے درمیان سے مانگ نکلی ہوئی تھی اور پیچھے جوڑے میں موتیے کے پھول سج رہے تھے۔ اس کے سانولے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ موسیقی کے سر بھی بڑے اداس تھے۔ ٹیگور کا گیت گاتے ہوئے کاجل مجھے اور بھی اچھی لگی۔ اس کے اداس چہرے اور ہونٹوں سے نکلنے والی اداس آواز نے مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری کر دی کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرا جسم کسی پھول کی خوشبو بن کر بارش میں بھیگتے جنگلوں میں پرواز کر رہا ہے۔ گیت ختم ہوا تو کاجل نے ہارمونیم میز پر پیچھے کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

اس کے باپ نے کاجل سے میرا تعارف کرایا تو وہ اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس کی آواز میں بھی ایک خواب کی سی کیفیت تھی یا مجھے یہ کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ کاجل کے باپ نے چھوٹے بیٹے اور میرے دوست کمل کو بازار سے کچھ مٹھائی وغیرہ لینے کے لیے بھیج دیا۔ اس کی ماتا جی چائے بنانے اندر چلی گئیں۔ کاجل بھی اردو میں ہی بات کرتی تھی۔ اگرچہ اس کا اردو بولنے کا لہجہ بھی اپنے ماتا پتا اور انکل کی طرح بنگالی تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کلکتے میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں لوئر چیت پور روڈ پر اپنے ایک دوست کے پاس رہتا ہوں۔ اس کے باپ نے پوچھا۔

"کلکتے کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کالج میں چھٹیاں ہیں۔ ایک مہینہ تو ضرور ٹھہروں گا۔"

میں نے کاجل سے پوچھا کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اس نے اداس سی آواز میں کہا۔

"اب ٹھیک ہوں۔"

اس کے پتا جی نے کاجل سے کہا۔

"جاؤ بیٹی رسوئی میں ماتا جی کا ہاتھ بٹاؤ۔"

کاجل اچھا پتا جی کہہ کر ساڑھی سنبھالتی اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کاجل کے پتا جی کہنے لگے۔

"مجھے تو یہ سب فراڈ لگتا ہے۔ مگر اس کی ماں کو کون سمجھائے۔ کسی ڈاکٹر کو گھر میں نہیں گھسنے دیتی۔"

میں نے کہا۔ "مگر انکل چندر بابو تو کہہ رہے تھے کہ ہر ہفتے رات کو ایک کالا ناگ آ کر کاجل کی پنڈلی سونگھ جاتا ہے۔"

کاجل کے پتا جی نے سر کو بے تابی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اجی یہ بھی تو فراڈ ہو سکتا ہے یہ سب ناگ مندر کے پجاریوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ ایک سانپ کو سدھایا بھی تو جا سکتا ہے۔ میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر کیا کروں، کاجل کی ماں کے آگے بے بس ہوں بھگوان سے ہر وقت اپنی بچی کی صحت کے لیے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں۔"

میں گھنٹہ دو گھنٹے بیٹھ کر چلا آیا۔ کاجل کے اداس چہرے کا نقش میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ میں ہر وقت اسے دیکھتا رہوں۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی میں دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی چیز لے کر کمل سے ملنے کے بہانے کاجل کے گھر پہنچ جاتا۔ وہ اکیلی بھی مجھ سے بات کر لیتی اور سب کے سامنے بھی کھلے دل سے بات کر لیتی تھی۔ میں بھی اس سے بات کرتے ہوئے بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ جب دل پاک صاف ہو دل میں کوئی چور نہ ہو تو پھر آدمی بے دھڑک بات کر لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے معصوم حسن کا رعب آپ کی زبان کو تھوڑی دیر کے لے خاموش کر دے یا آپ کوئی بات کرتے کرتے اصل موضوع کو بھول جائیں۔ یہ میں اپنے تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے حسن معصوم کے کئی پیکروں سے پاک دل اور پاک نگاہوں کے ساتھ محبت کی ہے اور ان کے سامنے بات کرتے ہوئے کئی بار ایسا ہوا کہ میں گفتگو کا موضوع بھول گیا۔ محبت میں میری ہمیشہ یہی حالت ہوتی تھی کہ جیسے کوئی بچہ ساون کی بارش میں بھیگتا باغ میں دوڑتا چلا جا رہا ہو۔

ایک دن دوپہر کے بعد کاجل کے گھر گیا تو بارش ہو رہی تھی۔ صبح سے ساون کی جھڑی لگی تھی۔ کلکتے کی گلیاں اور سڑکیں بھی پکی تھیں۔ وہ اس طریقے سے بنائی گئی تھیں کہ برسات چاہے تین دن لگی رہے نہ تو وہاں کیچڑ ہوتا تھا اور نہ کہیں پانی کھڑا ہوتا تھا۔ بڑا رومانٹک ماحول تھا۔ بازاروں میں بنگالی چھتریاں لگائے گزر رہے تھے۔ عورتوں نے بالوں میں موتیے کے یا ترناری کے پھولوں کے جو گجرے لگائے ہوئے تھے فضا میں ان کی ہلکی ہلکی خوشبو کی لہر کسی وقت قریب سے ہو کر گزر جاتی تھی۔ ریستورانوں میں بیٹھے لوگ چائے پی رہے تھے۔ میں ٹرام میں بیٹھ کر گیا تھا۔ کاجل کی گلی والے موڑ پر ٹرام سے اتر کر بارش میں بھیگتا تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے گھر پہنچا تھا۔ کاجل نے دروازہ کھولا تو مسکرا کر بولی۔

"ارے آپ تو بھیگ گئے ہیں۔ اندر آ جائیں۔ ماتا جی رسوئی میں ہیں۔ کمل ماسٹر کے گھر گیا ہوا ہے......"

پھر وہ ماتا جی کو آوازیں دیتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں میرے لیے چائے لے کر آ گئی۔ اس کی ماتا جی بھی آ گئیں۔ میں اپنے ساتھ انگلش بسکٹوں کا ٹین کا بڑا خوبصورت ڈبہ لے گیا تھا۔ اس کی ماتا جی بولیں۔

"تم نے یہ تکلف کیوں کیا بیٹا۔ اری کاجل دیکھو تمہارے بھیا تمہارے لیے کیا لائے ہیں؟ ذرا اسے کھولو تو۔"

کاجل نے ڈبہ کھول کر بسکٹ نکال کر پلیٹ میں سجا دیے۔ کہنے لگی۔

"یہ تکلیف کیوں کی آپ نے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو میں اپنی خوشی سے لایا ہوں۔ کمل کب آئے گا؟"

ماتا جی بولیں۔ "ماسٹر جی سے ٹیوشن پڑھنے گیا ہے آنے ہی والا ہوگا۔"

ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں سے کسی وقت بارش کی آواز آ جاتی تھی۔ کاجل کاسنی رنگ کی ساڑھی میں تھی۔ وہ کسی کام سے دوسرے کمرے میں گئی تو میں نے اس کی ماتا جی سے کہا۔

"اب کاجل پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔"

ماتا جی کا چہرہ اداس ہو گیا کہنے لگیں۔

"لگتا ہے ناگ دیوتا جی ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کئی روز سے انہوں نے درشن نہیں دیے۔"

(باقی آئندہ ماہ)

صورت سیرت

محترم عمران احمد قریشی'
السّلام علیکم!
امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ سچی کہانیوں کا معیار دن بدن بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے اس سلسلے نے نئے لوگوں کی خاصی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جس کے نتیجے میں نئے لکھنے والوں کی تعداد بڑھتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اس ماہ ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں یہ کہانی نئی ضرور ہے لیکن اس کا موضوع بڑا پرانا ہے۔ یہ کہانی ان لوگوں کی ہے جو خوشیاں خریدنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خریدی ہوئی خوشیاں کبھی دائمی نہیں ہوتیں۔ یہی اس کہانی کا سبق ہے۔ امید ہے یہ تحریر قارئین کو بہت پسند آئے گی۔

والسّلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

وسیم آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ غصہ سے اس کی رگیں تن گئی تھیں۔ آتے ہی اس نے دروازے پر لات ماری۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر میں اور آسیہ گھبرا گئیں۔ میں تو گویا تھر تھر کانپنے لگی تھی' وسیم کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔

''نائلہ......!'' وہ غصہ سے بولا۔ ''تم اور تمہاری ماں اتنی گر سکتی ہو یہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ تم عورت نہیں ناگن ہو' ایسی زہریلی ناگن جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ تم تو سنگسار کیے جانے کے قابل ہو۔ تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے' میرے ارمانوں کو آگ لگائی ہے۔'' وہ آگے بڑھا اور مجھے بازو سے پکڑ کر بولا۔ ''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... طلاق...... طلاق......'' پھر اس نے مجھ سے گھر کی چابیاں لیں اور کہنے لگا۔

''نکل جاؤ اس گھر سے اور اپنی ماں کے پاس جا کر رہو' جس نے تمہیں یہ سبق پڑھایا تھا۔'' اس نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں گرتے گرتے بچی۔

وسیم نے تو کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتی یا اس سے معافی مانگتی پھر بھی میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے مجھے سختی سے جھڑک دیا اور کہنے لگا۔

''میں تمہاری کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا' مجھے تمہاری شکل سے ہی نفرت ہوگئی ہے' جلدی کرو یہاں سے نکل جاؤ' ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔'' پھر وہ آسیہ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا۔

''لے جاؤ اس گناہ کی پوٹ کو ورنہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھالوں گا۔'' میں نے آسیہ کو ساتھ لیا اور اپنے ارمانوں کا لاشہ اٹھا کر وہاں سے نکل آئی۔ میں گھر نہیں جانا چاہتی تھی مگر آسیہ مجھے زبردستی ساتھ لے آئی۔ میں گھر میں داخل ہوئی' ماں کو دیکھا تو دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ امی پوچھے جا رہی تھیں کہ کیا ہوا؟ مگر میری سسکیاں اور آنسو رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ مجھے کچھ صبر اور قرار ملتا تو میں انہیں اپنی بربادی کی داستان سناتی کہ آپ ہی تو میری بربادی کی ذمہ دار ہیں۔ آپ ہی نے تو مجھے اس آگ میں جھونکا تھا۔

❁......☆......❁

میری ماں اپنی دونوں بہنوں بلقیس اور رقیہ سے بڑی تھیں۔ خالہ بلقیس اور خالہ رقیہ کو اوپر والے نے بے پناہ حسن سے نوازا تھا۔ ان کے برعکس میری امی اتنی خوب صورت نہ تھیں اس بدقسمتی نے انہیں شروع ہی سے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ خالہ بلقیس اور رقیہ کی شادیاں تو نہایت ہی اچھے گھرانوں میں ہوگئیں مگر امی کو محض بدصورت ہونے کی وجہ سے اچھا خاندان نہ ملا۔ امی کی نسبت ان کے خالہ زاد انوار سے بچپن میں ہی طے پاگئی تھی۔ انوار کا تعلق ایک کھاتے پیتے اور خوش حال خاندان سے تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مردانہ حسن و جمال میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کسی سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ مگر جب شادی کا وقت آیا تو اس نے امی کے ساتھ شادی کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ خوب صورت نہیں ہیں۔ انوار کو بہت سمجھایا گیا مگر اس نے کسی کی ایک نہ مانی۔ بالآخر خالہ رقیہ کی شادی انوار سے ہوگئی بعد میں پتا چلا کہ انوار اور خالہ رقیہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ رقیہ اور انوار کی جوڑی کی ہر کوئی تعریف کرتا تھا کہ یہ جوڑی لاکھوں میں ایک ہے۔ کچھ عرصہ بعد خالہ بلقیس کی شادی بھی ایک امیر اور خوش حال خاندان میں ہوگئی مگر میری امی پر کسی نے بھی پسند کی نگاہ نہ ڈالی۔ نانا نانی بھی ان کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ وہ آخری بیٹی کے فرض سے بھی جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے مگر برادری کا کوئی بھی گھرانا امی کا رشتہ لینے پر تیار نہ تھا۔ امی کی بدصورتی نے ان کے مقدر میں بھی مات لکھ دی تھی۔ کوئی امی کے اندر کی خوب صورتی کو نہ دیکھتا' کوئی ان کی سیرت پر نہ جاتا۔ کسی کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ یہ سب کچھ تو اوپر والے کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی کو حسن کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے اور کسی کو اس نعمت سے محروم۔ کوئی محلوں میں جنم لیتا ہے تو کوئی غریب کی کٹیا میں۔ سیرت نہ ہو تو صورت کس کام کی۔ امی کا بھلا کیا قصور تھا کہ انہیں ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی تھی۔ بالآخر امی کی شادی غیر برادری میں ہوئی ان کے سسرال والے اچھے لوگ تھے' انہوں نے امی کی صورت نہ دیکھی اور ان کو اتنی چاہت دی' پیار دیا کہ ان کی سونی زندگی میں بہار آ گئی۔

خالہ بلقیس اور خالہ رقیہ بھی بہت خوش تھیں کہ ان کی بڑی بہن بھی گھر والی ہوگئی ہے۔ نانا نانی نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ ان کے سر سے بھی بوجھ اتر گیا ہے مگر امی کے من میں جو میل آ گیا تھا وہ صاف نہ ہوا۔ ان کے دل میں خالہ بلقیس اور خالہ رقیہ کے خلاف نفرت کا لاوا ابلتا رہا کہ خالہ بلقیس اور خالہ رقیہ دونوں ہی ان کی خوشیوں اور ارمانوں کی قاتلہ ہیں۔ خاص کر انوار سے تو ان کو بیر ہوگیا تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کبھی کسی پر نہ کیا تھا اور بظاہر کسی سے کوئی گلہ اور شکوہ بھی نہ کیا۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ہمراہ دوسرے شہر چلی گئی تھیں۔ اب وہ جب بھی اپنے والدین سے ملنے آتیں' اپنی دونوں بہنوں کے گھروں میں جاتیں' ان سے مل کر خوشی کا اظہار کرتیں انہوں نے انوار کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اس نے ان کو ٹھکرا کر ان کے جذبوں کا مذاق اڑایا تھا مگر انوار اور رقیہ کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر ان کے من میں اک آگ سی لگ جاتی تھی۔

❁......☆......❁

جب میں نے جنم لیا تو امی مجھ میں کھو کر وقتی طور پر اس غم کو بھول گئیں۔ میرے بعد آسیہ نے جنم لیا۔ ہم دونوں بہنیں بھی اتنی خوب صورت نہ تھیں مگر

بدصورت بھی نہ تھیں۔ ہماری شکل وصورت درمیانی سی تھی، اُدھر خالہ رقیہ ایک بیٹے وسیم اور دو بیٹیوں کی ماں اور خالہ بلقیس ایک بیٹے نوید اور ایک بیٹی کی مائیں بن گئی تھیں۔ ان کی اولادیں بھی ان جیسی حسین اور خوب صورت تھیں۔ خالہ رقیہ کی دونوں بیٹیاں نہایت ہی خوب صورت تھیں۔ ان کا بھائی وسیم تو سچ مچ کا شہزادہ لگتا تھا۔ وہ ماں باپ سے بھی بڑھ کر خوب صورت اور وجیہہ تھا۔ کسی غمی اور خوشی کے موقع پر جب ہم سب نانا نانی کے گھر اکٹھے ہوتے تو خوب ہلا گلا کرتے، وہ بچپن اور ناسمجھی کا دور تھا اس لیے ہم کو ان باتوں کا احساس ہی نہ تھا کہ امیری اور غریبی، خوب صورتی اور بدصورتی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ان حقائق کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب ہم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ میں اور آسیہ تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئیں جب کہ ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں اور آسیہ اس تفریق کو شدت سے محسوس کرتی تھیں کہ ہمارا خون ایک ہے مگر پھر بھی ہم سے جدا اور الگ نظر آتی ہیں اور ہمیں ہر معاملہ میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

......☆......
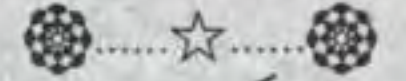
شکیل ابا جان کے کسی دور کے عزیز کا بیٹا تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ ابا جان اسے بہت چاہتے تھے، وہ کوئی کاروبار کرتا تھا اور اس میں کامیاب جا رہا تھا۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی، وہ مجھے پسند کرتا تھا اور شادی کا خواہش مند تھا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگتا تھا، مگر امی کو اس کا رشتہ منظور نہ تھا۔ وہ نا جانے کیوں شکیل کو ناپسند کرتی تھیں۔ ابا جان بھی امی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ شکیل کی تعریفیں بھی کرتے تھے مگر وہ امی سے دبتے تھے اور اس معاملہ میں اپنا فیصلہ سنانے سے قاصر تھے۔ میں سوچتی تھی کہ امی کو شکیل میں کون سی برائی یا خامی نظر آتی ہے کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہیں۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں اور شکیل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ہمارے درمیان دیوار کیوں کھڑی کر رہی ہیں۔ بالآخر تنگ آ کر میں امی سے اس نفرت کی وجہ پوچھ بیٹھی۔ امی کچھ اداس سی ہوگئیں اور تب انہوں نے مجھے اپنے ماضی سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ انوار کو پسند کرتی تھیں، بچپن میں ان کی منگنی بھی ہوگئی تھی مگر انوار نے ان کے ساتھ شادی کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ بدصورت تھیں۔

''تو پھر کیا ہوا امی جان! آپ بھی تو خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔ ابو آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں، بھول جائیں ماضی کو، جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا اور پھر جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔'' میں نے امی کو قائل کرتے ہوئے کہا۔ ''ان باتوں کا بھلا شکیل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

''میں کیسے بھول جاؤں اپنی تذلیل کو، میں نے اس کا بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ شکیل میں کوئی برائی نہیں ہے مگر میں اس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں کرسکتی کیونکہ میں تمہیں رقیہ کی بہو بنا کر ہی دم لوں گی۔ تمہیں اس سلسلہ میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میرا کہا ماننا ہوگا۔ اس لیے بھول جاؤ شکیل کو۔''

''اگر وہ لوگ ایسا نہ چاہیں تو پھر کیسے ہوگا یہ سب کچھ؟''

''میں ایسا کر کے ہی رہوں گی۔'' امی نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

امی کو اس معاملے میں اتنا جذباتی دیکھ کر میں خاموش ہوگئی اور اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ میں وسیم کو بھی پسند کرتی تھی کیونکہ وہ لاکھوں میں ایک تھا۔ برادری کی کئی لڑکیاں اس کی

دلہن بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ وسیم کبھی بھی میرے مقدر کا آسمان نہ بن سکے گا۔ اس لیے میں نے اس کے خواب دیکھنا چھوڑ کر شکیل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

......☆......
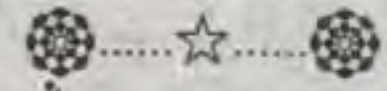
وسیم بے پناہ لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلا تھا۔ قدرت نے دنیاوی دولت کے ساتھ اسے حسن کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ گھر والے اسے ''پرنس'' کہا کرتے تھے۔ ماں اور بہنوں کے لاڈ پیار نے اس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا تھا کہ اسے کوئی پسند ہی نہ آتی تھی، اس کی ماں اور بہنیں اس کے لیے کئی لڑکیاں دیکھ چکی تھیں مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر اسے رد کر دیتا تھا۔ وہ اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

میں کئی بار امی کے ہمراہ خالہ رقیہ کے گھر جا چکی تھی مگر اس نے تو کبھی مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا، میں اس سے بات کرنے کو ترستی تھی۔ میں نے کئی بار اس کے قریب ہونے اور بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ہمیشہ مجھے نظر انداز کیا۔ میں اندر ہی اندر کھولتی تھی کہ وہ مجھے ذرا بھی لفٹ نہ کراتا تھا۔ اس کی ماں بھی فکرمند تھی کہ کوئی لڑکی اس کے معیار پر پوری ہی نہ اترتی تھی۔ اس کی دونوں بہنوں کی بھی شادیاں ہوگئیں۔ اب اس گھر میں سناٹے کا راج تھا۔ اس لیے خالہ رقیہ اس گھر میں جلد از جلد بہو لانا چاہتی تھیں۔ میری اماں نے دبے لفظوں میں میرے رشتے کا اظہار بھی کیا مگر خالہ رقیہ نے امی کی بات کو اہمیت ہی نہ دی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ آخر وہ ان کی بڑی بہن تھیں، ان کا بھی حق تھا مگر بات وہی کہ میں خوب صورت جو نہ تھی......

امی پھر بھی خالہ کے گھر جانے لگی تھیں، وہ وسیم کو بہت ہی پیار کرتی تھیں، جب خالہ رقیہ میری امی سے وسیم کی شکایت کرتیں کہ اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آ رہی تو امی وسیم ہی کی طرف داری کرتیں اور کہتیں۔

''جوان جہان لڑکا ہے، خوب صورت اور پڑھا لکھا ہے، اسے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق ہے۔ جہاں یہ چاہے اس کی شادی وہیں کرو۔ زبردستی کرو گی تو وہ شادی کامیاب نہ ہوگی۔''

امی کی باتیں سن کر وسیم خوش ہو جاتا اور کہتا۔

''خالہ جان! آپ بہت اچھی ہیں آپ میری حقیقی ہمدرد ہیں۔''

وسیم نے تعلیم مکمل کی تو جلد ہی اسے ملازمت بھی مل گئی، یہ اتفاق تھا کہ اس کی تعیناتی ہمارے شہر میں ہی ہوئی۔ میری امی کو معلوم ہوا تو وہ بہت ہی خوش ہوئیں کیونکہ اس شہر میں سوائے ہمارے گھر کے وسیم کا کوئی اور عزیز رشتہ دار نہ تھا۔ امی کو امید تھی کہ وہ ہمارے گھر میں ہی ٹھہرے گا مگر ایسا نہ ہوا کیونکہ اسے محکمہ کی طرف سے رہائش بھی مل گئی تھی پھر بھی امی نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمارے ہی گھر رہے۔ مگر وسیم نہ مانا اور کہنے لگا۔

''خالہ جان! آپ محسوس نہ کرنا، میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے پاس آپ کے گھر میں رہوں مگر ایک تو آپ کا گھر چھوٹا ہے اور دوسرا یہ کہ مجھے کمپنی کی طرف سے مکان مل گیا ہے، میں آپ لوگوں سے ہفتہ دو ہفتے بعد ملنے آتا رہوں گا۔''

وسیم نے ایسا ہی کیا وہ مہینے میں ایک دو بار ہمارے گھر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر ٹھہرتا اور چائے وغیرہ پی کر چلا جاتا۔ امی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔ اس کی خوب خاطر تواضع کرتیں۔ اب وہ مجھ سے بھی ہیلو ہائے کر لیتا مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے

اس کا ہمارے گھر آنا اچھا نہ لگتا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے مسکرا کے بات ہی نہ کی تھی مگر جس روز وسیم آتا امی مجھے اچھے کپڑے پہننے کی تاکید کرتیں۔ زبردستی خوشبو لگواتیں کہ ممکن ہے اس طرح وسیم میری طرف متوجہ ہو جائے مگر وہ تو پتھر کا دل رکھنے والا مغرور شخص تھا' اس پر بھلا کسی کے جذبات کیسے اثر انداز ہوتے؟ اب تو اس نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ اس کے اب ٹھاٹھ ہی نرالے تھے۔ ایک روز بازار جاتے ہوئے میں نے اسے ایک لڑکی کے ہمراہ دیکھ لیا وہ لڑکی واقعی لاکھوں میں ایک تھی۔ میں تو اس کے قدموں کی دھول بھی نہ تھی مگر پھر بھی میرے من میں ایک ہوک سی اٹھی اور میں اپنی بدقسمتی اور بدصورتی پر آنسو بہانے لگی' اس کے علاوہ اور میں کر بھی کیا سکتی تھی۔

❀......☆......❀
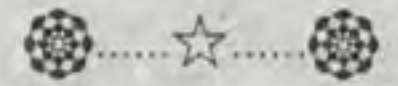
سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا اس روز موسم صبح ہی سے ابر آلود تھا اور بارش کا امکان بھی تھا۔ اسی روز وسیم ہمارے گھر چلا آیا۔ اس وقت شام ڈھلنے لگی تھی' آسمان پر بادل گہرے ہو گئے تھے' اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ ابا جان اور آسیہ کسی عزیز کی شادی میں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اتوار کی شام تک واپس آنا تھا۔ امی نے وسیم کی خوب آؤ بھگت کی' امی نے ہی چائے بنائی اور ہمارے سامنے رکھ کر بولیں۔

''میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں' ابھی آتی ہوں اتنی دیر میں تم لوگ چائے پی لینا۔'' یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گئیں۔

چائے کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

''خالہ ابھی تک نہیں آئیں۔'' وسیم گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ابھی آ جائیں گی۔'' میں نے کہا مگر میں جان گئی تھی کہ اب وہ اتنی جلدی واپس نہیں آئیں گی' میں بھی یہ چاہتی تھی کہ امی ابھی کچھ دیر مزید نہ آئیں تاکہ میں وسیم کا قرب کچھ دیر اور حاصل کر لوں۔ زندگی میں پہلی بار تو وہ مجھ سے اتنی باتیں کر رہا تھا' کچھ دیر بعد وسیم نے اٹھنا چاہا تو میں نے یہ کہہ کر روک لیا کہ اب کھانا کھا کر جائیے گا۔ اتنی دیر میں امی بھی آ جائیں گی۔ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی تو وسیم چونک کر اٹھ کھڑا ہوا' اس نے پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔

''اب تو دس بج گئے ہیں' اب میں چلتا ہوں' میرے ایک دوست نے آنا ہے۔''

''میں جانتی ہوں کس نے آنا ہے؟'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

''اتنی تیز بارش میں آپ کہاں جائیں گے؟ ذرا تھم جائے تو چلے جائیے گا۔'' میں نے پھر سے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں ذرا باہر صحن میں دیکھ آؤں' کوئی کپڑا وغیرہ نہ بھیگ جائے۔'' میں یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آئی' میں نے بڑے دروازے کی کنڈی لگائی تو اتنی دیر میں گرج چمک کے ساتھ بارش میں بھی تیزی آ گئی۔ میں سر تا پا پانی میں بھیگ گئی اور اسی حالت میں واپس کمرے میں آ گئی۔ میں نے دوپٹہ اتارا اور اسے نچوڑتے ہوئے بولی۔

''بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔''

''ارے نائلہ تم تو بالکل بھیگ گئی ہو' کپڑے بدل لو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' وسیم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس نے مجھ سے نظر ہٹانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میں نے دوپٹہ دوبارہ اوڑھ لیا۔ میں

نے بالوں کا کلپ بھی کھول دیا تھا' میرے سیاہ بال بھی بھیگ کر میرے بدن سے لپٹ گئے تھے۔ وسیم ابھی تک میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ سیاہ اندھیری اور سرد رات' موسلا دھار بارش' گرجتے بادل' کڑکتی بجلی اور تنہائی! سب کچھ فلمی منظر کی طرح لگ رہا تھا۔

''میں چلتا ہوں۔'' وسیم نے ایک بار پھر وہی جملہ دہرایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

''وسیم پلیز! ابھی نہ جاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''امی آ جائیں تو چلے جانا۔''

''وہ نا جانے کب آئیں گی؟ مجھے جانے دو۔'' وہ چاہنے کے باوجود بھی میرے وجود پر سے نظریں چرانے میں ناکام رہا تھا۔

''امی آتی ہی ہوں گی۔'' میں نے اسے کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پر گر سا گیا' اسی وقت زور سے بجلی کڑکی' اس کے ساتھ ہی میں ہلکی سی چیخ مار کر اس کے اوپر جا گری۔

''وسیم! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ ابھی نہ جائیے۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں نہیں جاؤں گا۔'' اس کی آواز بہت دور سے سنائی دی پھر باہر کے طوفان سے کہیں بڑھ کر اندر طوفان آ گیا اور سب کچھ ویسا ہی ہو گیا' جیسا میں نے چاہا تھا اور جب ہوش کا دامن ہاتھ میں آیا تو کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

''وسیم! میں زہر کھا لوں گی...... میں مر جاؤں گی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''نائلہ! پلیز مجھے کچھ سوچنے دو۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ شرمندگی اور ندامت سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے تسلیاں دینی شروع کر دیں اور پھر منہ چھپائے واپس چلا گیا۔

❀......☆......❀
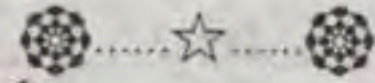
اگلے روز میں اور امی خالہ رقیہ کے گھر موجود تھیں' میری شکل یوں اجڑی ہوئی تھی جیسے میں ہزاروں میل کا صحرائی سفر طے کر کے آئی ہوں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے اور امی نے رو رو کر اپنی بربادی کی داستان کچھ اس انداز میں خالہ رقیہ کو سنائی کہ ان کا غصہ آسمانوں کو چھونے لگا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگیں۔

''وسیم تُو...... تُو میرا خون تھا' میں تجھے دودھ نہ بخشوں گی۔'' اور پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ ''تُو فکر نہ کر بیٹی! میں تجھے اور اپنی باجی کو رسوا نہ ہونے دوں گی۔ اب تُو ہی اس گھر کی بہو بنے گی' یہی وسیم کے گناہ کا کفارہ ہو گا۔''

❀......☆......❀
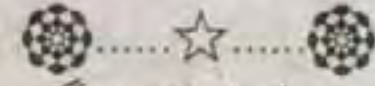
اگلے روز ہی وسیم کو فون کر کے گھر بلایا گیا اور کہا گیا کہ تمہاری ماں بیمار ہے جلدی آؤ۔

وسیم اسی شام گھر آ گیا۔ میں اور امی بھی وہاں ہی تھیں' اس نے مجھے اور امی کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وسیم آہستہ آہستہ اپنی ماں کی طرف بڑھا اور ان کا ہاتھ تھام کر اور چوم کر بولا۔

''امی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کیا ہوا آپ کو؟'' خالہ رقیہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہنے لگیں۔

''مت کہو مجھے ماں......!'' وہ پھٹ پڑیں۔ ''مر گئی تیری ماں وسیم! مجھے بتا مجھ سے کہاں چوک ہوئی تھی؟ میں نے تو راتوں کو جاگ جاگ کر سجدے میں گر گر کر تیرے پیدا ہونے کی دعائیں مانگی تھیں۔ تیرے نیک راستے پر چلنے کی تمنا کی تھی۔'' خالہ رقیہ

ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔ ''ارے تُو تو خود بہنوں والا ہے، کچھ تو خیال کرلیا ہوتا کہ تُو کس کی عزت پر ڈاکہ ڈال رہا ہے، سگی خالہ کے گھر پر۔''

وسیم بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ماں جی! خدا کے لیے چپ ہوجائیں، میں گناہ گار ضرور ہوں مگر یقین کیجیے ماں......'' بقیہ الفاظ اس کی زبان پر ہی رہ گئے وہ اپنی صفائی میں کیا کہتا؟ اب اجلا دامن کہاں سے لاتا؟

''امی! میں مجرم ہوں اور آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ آپ جو بھی سزا مجھے دینا چاہتی ہیں دے دیں، میری گردن کاٹ دیں، مجھے گولی مار دیں، سنگسار کردیں، میں اف نہیں کروں گا۔'' وسیم ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''تجھے آج ہی نائلہ سے شادی کرنی ہوگی، یہ ہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہے۔'' اس کی ماں نے فیصلہ سنادیا۔

''مجھے منظور ہے۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

اور پھر دو دن بعد گھر میں ہی سادگی سے میری اور وسیم کی شادی ہوگئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ہم نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ برادری والے سب عزیز اور رشتہ دار حیران تھے اور سوچتے تھے کہ یہ کرشمہ کیسے ہوگیا۔ عورتیں طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں، کوئی کہتی۔

''وسیم کو نائلہ میں کیا نظر آیا؟ اس سے تو فلاں لڑکی اچھی اور خوب صورت تھی۔ فلاں کے ساتھ شادی کرتا تو چارلس، ڈیانا کی جوڑی لگتی۔ فلاں میں کیا کمی تھی؟ فلاں تو ہیر تھی، شیریں تھی۔ وسیم رانجھا بن جاتا، فرہاد بن جاتا۔'' یہ تبصرے کئی دنوں تک جاری رہے، خود میرے ابو اور بہن آسیہ بھی حیران تھے کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ انہونی...... ہونی میں کیسے بدل گئی۔ مگر حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔ حقیقت صرف مجھے، میری امی، وسیم اور اس کی ماں کو معلوم تھی کہ وسیم کے پر کیسے کاٹے گئے ہیں۔

❁......☆......❁

وسیم اب بھی مجھ سے شرمندہ تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر اپنی ماں سے شرمندہ تھا۔ وہ اپنی ماں کی نظروں گر گیا تھا۔ ساری عمر کے لیے اس کا سر ان کے سامنے جھک گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وسیم بے قصور ہے، سارا قصور میرا اور میری ماں کا ہے مگر پھر بھی سزا وسیم کو مل رہی تھی۔

وسیم نے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے مجھے اپنی بیوی تسلیم کرلیا تھا۔ میں اب بہت ہی خوش تھی کہ میں وسیم کی بیوی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر مان تھا۔ غرور تھا کہ میرا شوہر لاکھوں میں ایک ہے، شکیل کو میں نے اب خواب سمجھ کر بھلا دیا تھا۔ میری ماں بھی خوش تھی کہ ان کی بیٹی انوار کی بہو بن گئی ہے جس نے ان کو ٹھکرا دیا تھا۔ اب میں وسیم کی بہت ہی خدمت کرتی۔ اس کا خیال رکھتی خالہ جان کو بھی بیٹیوں کی کمی محسوس نہ ہونے دیتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت خوش تھیں اور مجھ پر واری جاتی تھیں۔ وسیم سے اب انہیں کوئی گلہ نہ تھا کیونکہ اس نے ان کی بات جو مان لی تھی اور اب تو وہ پوتے پوتیوں کی خواہش کرنے لگی تھیں۔ میں اور امی دونوں ہی مطمئن اور مسرور تھیں۔

امی نے جو چاہا تھا وہ ہوگیا تھا۔ ان کا ڈراما کامیاب رہا تھا۔ میں اور امی جب بھی ملتیں، اس موضوع پر ضرور بات کرتیں اور اپنی کامیابی پر مسرت کا اظہار کرتیں۔

امی اب آسیہ کی شادی خالہ بلقیس کے بیٹے نوید سے کرنے کی خواہش مند تھیں۔ نوید بھی وسیم سے کم نہ تھا مگر وہ ہمارے گھر کم ہی آتا تھا۔ امی جب بھی مجھے تنہائی میں ملتیں تو آسیہ اور نوید کا قصہ لے کر بیٹھ جاتیں۔ وہ آسیہ کو ہر حالت میں خالہ بلقیس کی بہو بنانا چاہتی تھیں۔

وسیم نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا مگر کبھی کبھی جب وہ کمرے میں تنہا ہوتا تو وہ خیالوں میں کھو جاتا، ایسا لگتا جیسے پچھتاوے کی آگ نے اسے گھیر لیا ہے اور اس کا وجود اس میں جھلسنے لگا ہے۔ مگر میں نے اسے اتنا بے بس کردیا تھا کہ اب وہ اس آگ سے دامن نہ بچا سکتا تھا۔ اب اس آگ میں جلنا ہی اس کا مقدر ٹھہر گیا تھا۔

❁......☆......❁

دو ماہ بعد وہ مجھے اسی شہر لے گیا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ میں نے ابا جان کو کہہ کر آسیہ کو چند دنوں کے لیے اپنے پاس بلا لیا تھا تاکہ میری تنہائی کم ہو اور مکان کی صفائی وغیرہ کرالوں، ایک ہفتہ بعد وسیم نے اسے گھر چھوڑنے جانا تھا۔

اس روز چھٹی تھی، وسیم سو رہا تھا میں اور آسیہ کچن میں تھیں۔ شام کو آسیہ نے واپس جانا تھا۔ آسیہ نے اس روز بہت ضد کی کہ ''مجھے بتاؤ کہ تم نے وسیم کو شادی کے لیے کیسے رضا مند کیا اور تمہاری شادی کیسے ہوئی؟''

اس کے بہت زیادہ اصرار پر اسے میں نے وہ تمام قصہ بتادیا کہ میں نے کیسے وسیم کے پر کاٹے اور کیسے اس کو زیر کیا۔ آسیہ میری زبانی ایسی کڑوی سچائی جان کر ششدر رہ گئی۔ میں نے دیر نہ کی اور اسے رائے دی کہ نوید بھی اسی طرح ہی ہمارے دام میں پھنسے گا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب واضح ہے کہ تم نوید کو کسی طرح اپنے گھر بلاؤ۔''

''مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔''

''کیوں نہیں ہوگا۔''

''نوید کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے۔''

''میرا اور امی کا کہا مانو گی تو وسیم کی طرح نوید بھی غلام بن جائے گا۔ وسیم بھی بہت اونچا اڑا کرتا تھا۔ حسین سے حسین لڑکی کو ٹھکرا دیتا تھا مگر اب دیکھو کیسے پَر کاٹے ہیں میں نے اس کے۔ اڑنا تو اڑنا چلنا بھی بھول گیا ہے۔''

مجھے کیا معلوم تھا کہ وسیم باہر کھڑا ہماری گفتگو سن رہا ہے، اسے حقیقت معلوم ہوگئی تو اس نے مجھ سے دامن چھڑا لیا۔

❁......☆......❁

ہم تینوں ماں بیٹیاں دیر تک اپنی بربادی کا ماتم کرتی رہیں۔ وسیم نے اپنے ماں باپ اور برادری والوں کو سب کچھ بتادیا کہ وہ کیسے ہم ماں بیٹی کے جال میں پھنسا تھا۔ ہم ماں بیٹیاں تمام برادری میں رسوا ہوگئیں، کئی نے تو ہم سے تعلق ہی ختم کرلیا۔ امی کو اب شکیل یاد آیا اور وہ خود ہی اس سے ملنے چلی گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب وہ مجھ سے شادی کرے مگر اب اس نے بھی مجھے ٹھکرا دیا۔

برسوں بیت گئے ہیں، امی ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے آسیہ کی شادی ہوگئی تھی۔ میں اب اسی کے ساتھ رہتی ہوں، اس کے بچوں کا خیال رکھتی ہوں، اس کے گھر کے کام کرتی ہوں۔ بدلے میں روٹی مل جاتی ہے، میرے من میں اب کوئی امنگ اور خواہش نہیں ہے، ماضی یاد آتا ہے تو میں پچھتاووں کی آگ میں جلنے لگتی ہوں، اب یہی آگ میرا مقدر ٹھہر گئی ہے۔

❖

اصول پسند

مکرمی جناب عمران احمد'
ایڈیٹر نئے افق، کراچی
السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔
سیانے کہتے ہیں وعدہ کرنا آسان ہے لیکن نبھانا مشکل ہے۔ میں نے آپ سے اور قارئین سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ جب تک ہاتھوں میں لکھنے کی سکت ہے تفتیشی کہانیاں ارسال کرتا رہوں گا' میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور ان شاء اللہ قائم رہوں گا۔ لیجیے اب خالد صاحب سے ملیے اور مجھے اجازت دیجیے۔
ریاض بٹ
حسن ابدال

ان دنوں میرے تھانے کی حدود میں ایک مشہور سرکس نے دھوم مچائی ہوئی تھی۔

آج کل تو سرکس وہ رہا ہی نہیں...... گھبرایئے مت میں اس دور کے اور آج کل کے سرکس پر آپ کو بور نہیں کروں گا صرف کہانی سناؤں گا۔ میرے دور کے قارئین سب سمجھتے ہیں۔

حسب معمول میں تھانے پہنچا تو کانسٹیبل سلطان محمود نے آکر مجھے سلیوٹ کیا اور بولا۔

''سر! سرکس سے ایک لڑکی غائب ہوگئی ہے مطلب ہے کہ......''

''لڑکی غائب ہوگئی ہے۔'' میں نے زیرلب دہرایا۔

''جی ہاں سر! باہر دو بندے اطلاع دینے آئے ہیں۔''

کہانی یہ معلوم ہوئی کہ سرکس میں کام کرنے والی ایک لڑکی غائب ہوگئی تھی۔

میں نے ضروری تیاری کی اور کانسٹیبل سلطان محمود کو لے کر سرکس میں پہنچ گیا۔

اس وقت محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً سرکس میں الو بول رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ عجیب سی اداسی اور سوگواریت چھائی ہوئی ہے۔

سرکس کا مالک چھولداری میں بے ہوش پڑا تھا اور ایک ڈاکٹر اسے دیکھ رہا تھا۔

ہم ایک چھولداری میں بیٹھ گئے۔ رنگ ماسٹر اور دو تین بندوں کو ہم نے اپنے سامنے بٹھالیا۔ رنگ ماسٹر کا نام سانول معلوم ہوا۔

''سانول صاحب! یہ واقعہ کیسے ہوا اور آپ کو کس وقت پتا چلا۔'' میں نے رنگ ماسٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب! کیا بتائیں شمو بہت خوب صورت تھی۔ ہمارا سرکس ویران ہوگیا' وہی سرکس کی جان تھی۔'' رنگ ماسٹر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ سے کچھ اور پوچھا تھا۔'' میں نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ معاف کریں جی! ہماری تو مت ہی ماری گئی ہے۔ شمو رات کو شو کر کے ٹھیک ٹھاک اپنی چھولداری میں گئی تھی' صبح جب پروین اسے جگانے گئی تو اس کی چھولداری خالی تھی۔''

''کیا مطلب؟ کیا وہ اکیلی سوئی تھی؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی ہاں! وہ ایک چھوٹی سی چھولداری میں اکیلی ہی سوتی تھی۔''

''اس کی وجہ......؟''

''وہ ایسی ہی چڑچڑی طبیعت کی مالک تھی۔ اس کی کسی کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ اس کی وجہ سے ہمارا سرکس چلتا تھا اس لیے......''

''اس کا کام کیا تھا؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ رسّے پر جمناسٹک کے مظاہرے کرتی تھی۔''

ہم وہاں آدھے گھنٹے سے زیادہ رہے لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔

سرکس کا مالک مراد ابھی تک بے ہوش تھا۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ جونہی اسے پتا چلا شمو غائب ہے اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ لہرا کر زمین پر آرہا' اسے پکڑنے یا تھامنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا' اس کا سر بڑی زور سے زمین کے ساتھ ٹکرایا تھا۔

ہم نے رنگ ماسٹر سے کوئی کھرا کھوج لینے کی کافی کوشش کی تھی لیکن وہ صرف یہ کہتا رہا کہ مراد صاحب ہی کچھ بتاسکیں گے اور مراد صاحب تو بے ہوش تھے۔

خیر ہم تھانے واپس آگئے۔ راستے میں سلطان محمود نے مجھے بتایا تھا کہ سر وہ لڑکی لگتی ہی نہیں تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ربر کی کوئی گڑیا کرتب دکھا رہی ہو۔ بالکل جاپانی گڑیا تھی' اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ صرف اسی کو دیکھنے سرکس میں جاتا تھا۔

یہ بات میں نے اپنی کسی کہانی میں آپ کو بتائی تھی کہ سلطان محمود عورتوں کا رسیا تھا لیکن شرافت کے دائرے میں رہتا تھا ورنہ میں اب تک اس کو الٹا لٹکا چکا ہوتا۔ دوسرے اس کی کبھی کوئی شکایت نہیں آئی تھی' میں نے محرر سے کہہ کر شمو کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ درج کرلی۔

رپورٹ رنگ ماسٹر کی طرف سے درج کی گئی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس نے گھنٹے دو گھنٹے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔

آج رانا تنویر ایک کیس کے سلسلے میں عدالت گیا ہوا تھا۔ تین بجے اس سے ملاقات ہوئی' ہم نے اکٹھے چائے پی اور وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے گویا ہوا۔

''سر! لڑکی نک چڑھی اور خود پسند تھی۔ اس نے مجھ سے حاصل کی ہوئی معلومات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔'' ہوسکتا ہے کسی کے ساتھ اتنی دشمنی پال لی ہو کہ اس نے اسے غائب کردیا۔''

''ایک اور امکان بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''سر! میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' اس نے سگریٹ کا کش لے کر راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقابت کا معاملہ بھی ہوسکتا ہے' رقابت کاروباری بھی ہوسکتی ہے اور......''

''مجھے بھی یونہی محسوس ہورہا ہے۔ ہمیں ندیم سے مدد لینی چاہیے۔'' میں نے ایک مخبر کا نام لیتے ہوئے کہا۔

''سر! یہ ندیم بھی بڑے پائے کا بندہ ہے۔ اس نے بے شمار جاسوسی ناول پڑھے ہوئے ہیں اور خود بھی کسی جاسوس سے کم نہیں ہے۔'' رانا نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے ندیم کو بلا کر ساری بات سمجھا دی اور وہ سر ہلا کر چلا گیا۔

اے ایس آئی بھی کچھ دیر بعد چلا گیا اور میں

سوچ کے گھوڑے دوڑانے کے لیے اکیلا رہ گیا۔

"سر! رنگ ماسٹر صاحب آئے ہیں۔" محرر کی آواز سے میں خیالوں سے باہر آ گیا اور رنگ ماسٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ محرر باہر جا چکا تھا۔

میں نے رنگ ماسٹر کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

اس کا قد پانچ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ رنگت گندمی، آنکھیں خمار آلودسی، ماتھا تنگ اور ہونٹ پتلے تھے۔ عمر تیس کے قریب لگتی تھی، بظاہر دیکھنے میں وہ بے ضرر لگتا تھا۔

"سانول صاحب! آپ سے سرکس میں باتیں تو ہوئی تھیں، آپ نے بتایا تھا کہ اس سرکس میں آئے ہوئے آپ کو بیس دن ہی ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کہاں کام کرتے تھے؟"

یہاں دو باتوں کی وضاحت کردوں کہ چھولداری سے (جس میں شمو رہتی تھی) سلطان محمود نے کھرے اٹھائے تھے۔ ان کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سرکس میں سانول سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔

دراصل میں تھانے میں اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ تھانے کی اپنی ہی دہشت ہوتی ہے۔

سانول نے میری طرف دیکھا پھر بولا۔

"کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟"

سانول صاحب! میں آپ کی عزت کر رہا ہوں۔ مجھ سے عزت ہی کروائیں تو بہتر ہے ورنہ......؟" میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے چند لمحے توقف کیا پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیجیے کیوں...... کب اور کیسے جیسے لفظ استعمال نہ کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔" بندہ سمجھ دار تھا میرے موڈ اور رویئے کو دیکھ کر سیدھے رستے پر آ گیا۔

اس نے بتایا کہ وہ اس سے پہلے دوسرے سرکس میں کام کرتا تھا بقول اس کے سرکس کا مالک کنجوس تھا، علاوہ ازیں سرکس اتنا مشہور بھی نہیں تھا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ تم کو شمو کی کشش اس سرکس میں کھینچ لائی ہے تو تم کیا کہو گے؟" میں نے اس کی خمار آلود آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا پھر گویا ہوا۔

"تھانیدار صاحب! یہ وجہ بھی ہے لیکن اصل مسئلہ پیٹ کا ہے، اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو حسین سے حسین تر لڑکی بھی زہر لگتی ہے۔"

"بہت خوب......!" میں نے استہزائیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

اس کے بعد میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ اس سرکس کا رنگ ماسٹر اچانک نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس لیے بھی اسے اس سرکس میں آنے کا موقع مل گیا۔

میرے اس سوال کا وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کہ پرانا رنگ ماسٹر اچانک نوکری چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟

اگر سرکس کا مالک مراد بے ہوش نہ ہوتا تو ہمیں کافی آسانی ہوتی اب تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ ویسے ندیم سے ہمیں کافی توقعات تھیں کہ وہ اندر کی کہانی ضرور معلوم کرلے گا۔

میں نے رنگ ماسٹر کو جانے کی اجازت دے دی۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ صرف یہ ہوا کہ مراد اسپتال پہنچ گیا

تھا، وہ ہنوز بے ہوش تھا۔

دوسری صبح جب رانا تنویر میرے کمرے میں آیا تو اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اس نے بتایا کہ ساری رات وہ اسپتال میں رہا ہے، اس امید پر کہ جیسے ہی مراد کو ہوش آئے، وہ اس سے بات چیت کر سکے لیکن ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا۔

ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر مراد کے سر کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کانسٹیبل سلطان محمود وہاں موجود تھا۔

یہ میری سروس کے ان کیسوں میں شامل تھا جن کی تفتیش ایسی ہی وجوہات کی بنا پر مشکل ہو گئی تھی۔ میں نے رانا کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی تاکہ وہ نیند پوری کر کے تازہ دم ہو سکے۔

اس سرکس کا سابقہ رنگ ماسٹر بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔

اس کا اچانک نوکری چھوڑ کر چلے جانا مجھے کھٹک رہا تھا۔ میں جونہی کھانا کھا کر فارغ ہوا، مجھے اطلاع دی گئی کہ ندیم (مخبر) آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا، وہ مجھے اب تک حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کر کے چلا گیا اور میں ان معلومات کو اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔ ان معلومات سے روشنی کی ایک کرن نظر تو آئی تھی اور مجھے تفتیش کو آگے بڑھانے کا مواد مل گیا تھا۔

لیجیے آپ کو بھی ان معلومات سے آگاہ کردوں۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ شمو کی وجہ سے سرکس کی شہرت آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی تھی اور ایک سرکس کے مالک نے اسے (شمو کو) دگنے معاوضے کی پیش کش کرتے ہوئے اپنے سرکس میں آنے کی آفر کی تھی لیکن شمو نے ایک شرط رکھی تھی وہ شرط یہ تھی کہ عامر کو بھی اس قسم کی پیش کش کرے، عامر سرکس میں شیر کے ساتھ کرتب کرتا تھا۔

لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی تھی کیونکہ بقول اس سرکس کے مالک کے عامر کی اس کے پاس کوئی جگہ نہیں تھی۔ ویسے یہ بات ہضم ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ واقعی مراد کے سرکس کو آسمان سے زمین پر گرانا چاہتا تو شمو کی شرط ماننی چاہیے تھی۔

اس قسم کے حالات میں یہ کون دیکھتا ہے کہ کتنا پیسہ لگ رہا ہے؟ عجیب گورکھ دھندا تھا، ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کردوں کہ سانول ایک تیسرے سرکس سے آیا تھا جو ان دونوں سرکسوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور مقابلے میں بہت پیچھے تھا۔

بہرحال اب مسئلہ یہ تھا کہ اس سرکس کا پتا کیا جاتا کہ آج کل کہاں ہے۔

شام گہری ہونے سے ذرا پہلے رانا تنویر آ گیا۔ وہ اسپتال سے ہو آیا تھا اور تازہ ترین بلکہ آج کل کے حساب سے بریکنگ نیوز یہ تھی کہ مراد کا آپریشن ہو گیا تھا اور ڈاکٹروں نے کہا تھا اس کے بچنے کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ دراصل چوٹ لگنے سے اس کے سر سے خون باہر نہیں آیا تھا، اندر ہی رسنے لگا تھا لیکن مراد ابھی کسی قسم کے سوال و جواب کے قابل نہیں تھا۔

میں نے رانا کو ندیم سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کر دیا۔

"اوہ سر! آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟" اس نے ڈبیا سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں جب تک مطلوبہ سرکس کا پتا نہیں چلتا۔ عامر سے موجودہ حالات کے تناظر میں

ایک بھرپور انٹرویو کرلیا جائے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں اسے تھانے بلوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔" تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔

اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور چھبیس سال کے درمیان لگایا۔ قد چھ فٹ کے قریب تھا' نقش و نگار جاذب نظر تھے۔ جنس مخالف کے لیے سیکس اپیل رکھتا تھا۔

"عامر میاں! شمو کا کیا چکر ہے؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"تھانیدار صاحب! میں نے سرکس میں آپ کو بتایا تھا کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہی......" اس نے ابھی فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ میں نے تیکھی نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم نے کچھ باتیں چھپالی تھیں"

"کون سی باتیں؟" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی جو مجھے بالکل حقیقی لگی۔

"پہلی بات کہ سرکس کے مالک نے شمو کو ایک آفر کی تھی۔"

"لیکن جناب وہ بات تو نہ بن سکی تھی' اس لیے اس بات کو غیر ضروری سمجھ کر میں نے ذکر نہیں کیا تھا۔"

اب اس عقل کے اندھے کو ہم کیسے سمجھاتے کہ یہ بات کتنی اہم تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ شمو نے وہ شرط کیوں رکھی تھی؟"

"دراصل تھانیدار صاحب! ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" وہ ایک دم برسوں کا بیمار لگنے لگا پھر اس نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ شمو کو جلد از جلد ڈھونڈیں اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں......"

"مر جاؤں گا۔" رانا نے ہنس کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ مکمل کردیا۔

وہ کچھ نہ بولا بس خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم کچھ اشارہ' کوئی بات بتاؤ گے تو ہم آگے بڑھیں گے۔ ہم کوئی شرلاک ہومز اور واٹسن تو ہیں نہیں۔" رانا نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ سرکس کے مالک کو کیوں نہیں پکڑتے بلکہ میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔" اس نے جوش میں بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

قارئین میں دانستہ سرکسوں کے نام نہیں لکھ رہا۔

"دیکھو! جوان ہم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا یہ ہمیں پتا ہے' اب تم جاسکتے ہو لیکن ایک بات ذہن میں رکھ کر جانا کہ اگر کوئی اور بات تمہارے ذہن میں آجائے تو ضرور بتانا۔ چاہے وہ تمہاری نظر میں کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔" میں نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

اگلے دن ہمیں پتا چل گیا کہ سرکس آج کل کہاں ہے؟

وہ آج کل جس شہر میں تھا وہ ہمارے تھانے کی حدود میں نہیں آتا تھا۔

ضروری تیاری کے بعد میں نے ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور سرکس میں پہنچ گیا۔

اس سے پہلے متعلقہ تھانے میں ہم نے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی' تھانہ انچارج نے اپنے دو اہلکار ہمارے ساتھ کردیئے تھے۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے جب کہ اہلکار وردی میں تھے۔

سرکس کا مالک اونچے لمبے قد کا ایک پچاس سالہ شخص تھا۔ نام اس کا نصرت تھا۔

اس نے ہمیں عزت سے بٹھایا اور ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کرنے لگا تو ہم نے اسے روک دیا۔

کیونکہ ایک تو ہم متعلقہ تھانے سے چائے پانی پی کر آئے تھے۔ دوسرے ہم جس جگہ تفتیش کرنے جاتے تھے حتیٰ الامکان دعوتیں اڑانے سے اجتناب کرتے تھے۔ مجبوری کی بات دوسری تھی۔

"کیا آپ تک یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ مراد کے سرکس کی لڑکی شمو غائب ہے' میں نے پہلا سوال داغا تھا۔"

"بالکل جناب! یہ بات مجھے کل شام پتا چلی ہے۔" اس نے اطمینان اور اعتماد سے جواب دیا۔

اس دوران میں متواتر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو گھبراہٹ کے آثار تھے اور نہ ہی وہ بوکھلایا ہوا لگتا تھا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ شمو کو آپ نے غائب کروایا ہے تو آپ اس سلسلے میں اپنی صفائی میں کیا کہیں گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے نہ تو نظریں چرائیں اور نہ ہکلایا بلکہ بڑے تحمل سے بولا۔

"یہ آپ کس بناء پر کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟" میں نے اسے وجہ بتائی تو وہ ہنس پڑا۔

مجھے اس کی یہ بے موقع ہنسی کھل گئی لیکن میں نے اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھا اور اس کے جواب کا منتظر رہا۔

"تھانیدار صاحب! کاروبار میں یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے سرکس کی بہتری کے لیے ایک منصوبہ سوچا تھا جو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تو میں خاموش ہوگیا۔"

"لیکن اگر آپ شمو کی شرط مان لیتے تو......" میں نے جان بوجھ کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"مجھے عامر کی ضرورت نہیں تھی' خوامخواہ اس کو دگنا معاوضہ کیوں دیتا؟"

پتا نہیں یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی' بہرحال میں ایک شک اور کھٹک لے کر واپس آگیا۔ اپنے تھانے میں واپس آنے سے پہلے میں نے اپنے شک سے متعلقہ تھانے کے انچارج کو تفصیلاً آگاہ کردیا تھا' اس نے کہا تھا۔

"خالد صاحب! آپ بالکل فکر نہ کریں یہاں کے سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دیں۔"

واپس آکر مجھے پتا چلا کہ مراد کے متعلق ڈاکٹروں نے کہا تھا تقریباً ایک ہفتے بعد بات چیت کرنے کے قابل ہوسکے گا۔

شمو نک چڑھی تھی اس لیے سرکس کا کوئی بندہ بھی اس کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ پروین بھی زیادہ نہ بتاسکی تھی۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے۔ جب اچانک بادل گھر کر آئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی جو تقریباً پندرہ بیس منٹ جاری رہی۔ بارش تو بند ہوگئی لیکن بادل چھائے رہے۔

"سر یہ دیکھیں کیا ہے؟" اچانک سپاہی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اس نے ایک سادہ سا لفافہ لاکر میز پر رکھ دیا۔ میں نے لفافہ کھولا تو اندر سے ایک چھوٹا سا رقعہ برآمد ہوا۔ اگلے ہی لمحے میری نگاہیں رقعے پر لکھی تحریر پر پھسلنے لگیں' لکھا تھا۔

"جناب تھانیدار صاحب! اگر شمو کو برآمد کروانا

ہے تو نصرت کے سرکس پر نظر رکھیں۔ مراد کے سرکس والا رنگ ماسٹر آج کل نصرت کے سرکس میں ہے..... ایک مخبر!''

جو سپاہی لفافہ لے کر آیا تھا' اسے میں نے کہا کہ وہ جائے اور سلطان محمود کو بھیج دے۔ لفافہ کس طرح ملا تھا اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ہم نے سلطان محمود کو اسپتال سے واپس بلالیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ میرے سامنے تھا۔

''سلطان محمود یہ خط لے جاؤ اور مراد کے سرکس میں جا کر پتا لگانے کی کوشش کرو کہ سرکس کے کسی آدمی نے تو یہ خط نہیں لکھا۔''

وہ خط لے کر چلا گیا' اسے پتا تھا کہ خط پڑھ کر کس طرح پتا کرنا ہے۔ ہمارے مخبر اس طرح خط نہیں لکھا کرتے تھے اگر کبھی نامساعد حالات کے تحت خط لکھنا بھی پڑتا تھا تو اپنا وہ نام ضرور لکھتے تھے جو ہم نے ان کو دیا ہوتا تھا۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سلطان محمود واپس آ گیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا پھر کہا۔

''کیوں بھئی سلطان محمود! لگتا ہے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔''

''سر! ہمارے لیے کوئی سراغ ہی سب سے بڑا خزانہ ہے۔''

''اچھا کون سا سراغ لگا بھئی؟'' میں نے پھر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔'' سلطان محمود مجھے حیران پریشان کیے جا رہا تھا۔

پھر میں اس کے ساتھ اس جگہ تک گیا جہاں وہ مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ یہ ہمارے تھانے کی شمالی دیوار کے باہر والی جگہ تھی۔

''یہ دیکھیں سر!'' سلطان محمود نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس جگہ بیٹھ کر غور سے ان نشانات کو دیکھا اور اچھل پڑا یہ تو ویسے ہی نشان یا کھرے تھے جیسے ہم نے شمو کی چھولداری کے اندر اور باہر دیکھے تھے۔

وہ کھرے میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

لگتا یہ تھا کہ جونہی بارش تھمی کھروں والا شخص آیا اور خط اندر پھینک کر چلا گیا۔ زمین دھول والی تھی' بارش کی وجہ سے وہاں تھوڑا بہت کیچڑ سا بن گیا تھا' یہ مخصوص بوٹوں کے کھرے تھے' جنہوں نے مجھے کسی اور طرف سوچنے پر مجبور کر دیا۔

خط پھینک کر جانے والا میری تفتیش کی لائن بدلنا چاہتا تھا لیکن کیوں.....؟

اس کا مقصد کیا تھا؟

میں نے سلطان محمود کو مراد کے سرکس میں بھیجنے کا ارادہ بدل دیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ انتظار کرے۔ اپنی بیرک میں اور خود واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اب آپ کو یہ بتا دوں کہ خط یا رقعہ سپاہی کے ہاتھ کیسے لگا تھا۔ دراصل جس طرف خط پڑا تھا اس طرف باتھ روم تھے' سپاہی ضرورت کے تحت اس طرف گیا تھا۔

اب مجھے رانا تنویر کا انتظار تھا' وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا اور آتے ہی بولا۔

''سر! جب تک مراد بات چیت کرنے کے قابل نہیں ہوتا' یہ کیس آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ میں سرکس کے بندوں کو کھنگال چکا ہوں لیکن

کوئی کھرا کھوج ہاتھ نہیں آ رہا۔ لگتا ہے اندر اندر کوئی کھچڑی پکی ہے۔'' اس کے بعد وہ شاید اپنی جیب میں سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس ٹٹولنے لگا تھا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور تازہ صورت حال اس کے گوش گزار کرتے ہوئے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ چند لائنوں کے اس مختصر سے خط کو پڑھ کر اس نے سگریٹ کو دیا سلائی دکھائی اور دھواں فضا میں منتشر کرتے ہوئے بولا۔

''سر! اب کیا کیا جائے؟''

''تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''میرا خیال تو یہ ہے سر.....!'' ایک لمحہ کے لیے توقف کر کے اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور بولا۔ ''رنگ ماسٹر کے متعلق پتا کرنا چاہیے کیا وہ واقعی نصرت کے سرکس میں پہنچ گیا ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے' تم کانسٹیبل سلطان محمود کو ساتھ لے جاؤ اور پتا کرو۔''

وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا ظاہر ہے اسے دوسرے شہر جانا تھا اور پہلے متعلقہ تھانے میں جانا تھا۔ میں تھانے کے دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔

جب تفتیش کا ایک در بند ہوتا ہے تو کئی دوسرے در کھل جاتے ہیں۔ دوسرے دن گیارہ بجے وہ واپس آیا اپنے ساتھ وہ رنگ ماسٹر کو لے آیا تھا۔

قارئین یہ وہی رنگ ماسٹر تھا جو اچانک مراد کا سرکس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

رانا رنگ ماسٹر کو کیسے لے کر آیا تھا یہ قانونی گورکھ دھندے ہیں جن کا ذکر آپ کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوگا۔ آپ آگے کی کہانی سنیے۔

ہم نے رنگ ماسٹر کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور ان معلومات کی روشنی میں اس کو گھسنا شروع کر دیا جو ہمیں اب تک حاصل ہوئی تھیں۔

میں اس کا نام نہیں لکھوں گا اسے رنگ ماسٹر ہی لکھوں گا۔

''ہاں تو رنگ ماسٹر صاحب! آپ اچانک مراد کا سرکس چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر لگتی تھی' نین نقش واجبی اور سر سے بالکل گنجا تھا۔

آنکھیں ایسے چالاک اور شراب کے نشے کا عادی ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا' منہ سے کچھ نہیں بولا۔

رانا اٹھ کر اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور اس کے کاندھے کو زور سے ہلاتے ہوئے غصے سے بولا۔

''ہم تم سے مخاطب ہیں' جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''وہ..... وہ..... میں..... میں جناب.....!''

''لگتا ہے گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔''

رانا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ چکرا کر میری میز پر آ گرا۔

رانا نے گریبان سے پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کیا اور جونہی ایک تھپڑ اور مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

وہ ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں.....'' پھر اس نے اپنی رام کہانی ہمیں سنادی۔

وہ کافی عرصے سے مراد کے سرکس میں کام کر رہا تھا۔ شمو اسے اچھی لگتی تھی لیکن اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ وہ تو عامر کی دیوانی تھی' ایک رات وہ شراب کے نشے میں دھت شمو کی چھولداری میں گھس گیا' وہ

جاگ رہی تھی۔

سرکس اور ماحول پر ہو کا عالم طاری تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔

رنگ ماسٹر نے اس کے ساتھ دست درازی شروع کردی۔ شمو پھرتیلی تھی' اس نے رنگ ماسٹر کو گرالیا' وہ نشے میں دھت تھا' اس لیے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا تھا۔ چھولداری میں رسّی کا ایک گز بھر کا ٹکڑا پڑا تھا شمو نے اس سے رنگ ماسٹر کے پاؤں باندھ دیئے پھر اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ بھی باندھ دیئے اور خود سرکس کے مالک مراد کو جا جگایا اور سرگوشیوں میں اس کو ساری صورت حال بتادی شاید وہ بات کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ دوڑا دوڑا شمو کی چھولداری میں آیا۔ مراد جہاندیدہ بندہ تھا' اس نے رنگ ماسٹر کے ہاتھ اور پاؤں کھول دیئے اور بولا۔

''رات کے اندھیرے میں منہ چھپا کر یہاں سے دفع ہوجاؤ اور پھر کبھی شکل نہ دکھانا۔ میں سرکس میں خون خرابہ پسند نہیں کروں گا۔ عامر کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

رنگ ماسٹر کا نشہ ہرن ہوچکا تھا' وہ اسی رات اپنا مختصر سا سامان لے کر مراد کے سرکس سے چلا گیا۔

اور دو چار دن ادھر اُدھر پھرنے کے بعد نصرت کے پاس آ گیا اور اسے ساری بات بتادی۔

وہ پہلے ہی مراد سے خار کھاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد غالباً شمو کے غائب ہونے سے چھ دن پہلے نصرت اور اس رنگ ماسٹر نے ایک منصوبہ بنایا اور شمو کو دگنے معاوضے کی آفر کردی۔ یہ بات یاد رہے کہ شمو اس بات سے لاعلم تھی کہ رنگ ماسٹر نصرت کے پاس پہنچ چکا ہے۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے شمو عامر کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی' اس لیے اس نے عامر کو بھی یہی آفر دینے کی شرط لگادی۔

رنگ ماسٹر تو دونوں کو جدا کردینا چاہتا تھا اس لیے اس نے اس بات کی مخالفت کی۔ ورنہ نصرت عامر کو بھی دگنے معاوضے کی آفر کرنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ ایک دن اچانک انہیں پتا چلا کہ شمو غائب ہوگئی ہے' وہ دبک گئے اس کے بعد ہم نے کافی گھما پھرا کے اس سے یہ اگلوانے کی کوشش کی کہ اس نے شمو کو خود غائب کیا ہے یا اسے قتل کرکے لاش کہیں دبادی ہے۔

وہ زور زور سے سر ہلا کر انکار کرتا تھا' قسمیں کھاتا تھا' روتا تھا اندر سے بزدل اور ڈرپوک تھا۔ میں نے اسے دھمکی بھی دی کہ اسے الٹا لٹکا کر نیچے مرچوں کی دھونی دی جائے گی' تو ہر بات اس کی زبان پر آجائے گی' جو وہ ابھی تک چھپا رہا ہے۔

وہ رانا کے پاؤں میں گر گیا اور ایک ہی رٹ لگاتا رہا کہ اسے شمو کے متعلق کچھ پتا نہیں' وہ بے گناہ ہے۔ البتہ اس نے ایک بات ایسی کہہ دی کہ وہ ہمیں بے گناہ لگنے لگ گیا۔

بات ایسی تھی کہ ہمیں یقین ہونے لگا' ہم مجرم یا مجرموں کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔

ہم نے رنگ ماسٹر کو فی الحال حوالات میں بند کرنے کا فیصلہ کیا اور آگے کا منصوبہ سوچنے لگے۔

شام تک ہم مجرم یا ملزم کو پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔

ہمیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے پہلی دفعہ جرم کیا تھا وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔

ہم نے اسے کس طرح ڈھونڈا' اس کا اندازہ ذہین قارئین خود لگالیں گے۔ آیئے آپ کا تعارف مجرم سے کروائیں۔

اس کا نام شکور دین عرف شکرا ہے اور یہ ایک شکاری ہے۔ سرکسوں میں درندوں کے بچے سپلائی کرنا اس کا پیشہ اور ذریعۂ روزگار ہے۔ باقی کہانی شکور دین آپ کو خود سنائے گا۔

''تھانیدار صاحب! میں کیا کرتا مجبور ہوگیا تھا' میں کوئی چور' ڈاکو اور بدمعاش نہیں ہوں۔ خطروں میں گھر کر اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر شکار کرتا ہوں اور درندوں کے بچوں کو پکڑنے کے لیے بہت بڑے خطرے مول لیتا ہوں۔ جناب میں نے مراد کو دو بچے چیتے کے' ایک بچہ شیر کا اور ایک بچہ ریچھ کا لاکر دیا تھا' میں جانتا ہوں کہ مراد بیوپار کا کھرا ہے' اصول پسند ہے۔ وعدے کے مطابق رقم دیتا ہے لیکن کبھی کبھی حالات ایسے ہوجاتے ہیں کہ اصول کو توڑنا پڑتا ہے۔ تھانیدار صاحب! میری ماں بیمار ہے' مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی' میں نے اپنی مجبوری بتا کر مراد سے پیسے مانگے لیکن اس نے میری بے عزتی کردی اور کہا' جس دن کا وعدہ کیا ہے اس سے ایک دن پہلے بھی پیسے نہیں مل سکتے۔ میں نے مراد کی بڑی منت سماجت کی لیکن وہ پتھر ٹس سے مس نہ ہوا' مجھے یہ احساس تو تھا کہ شمو مراد کے سرکس کی جان ہے۔ ایک رات میں نے مراد کو زچ کرنے کے لیے شمو کو بے ہوش کرکے کاندھے پر ڈالا اور اپنے گھر لے گیا۔ اس وقت ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اتفاق سے میرا گھر سرکس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ تھانیدار صاحب! میں نے اسے بہنوں کی طرح رکھا ہوا ہے جیسی میری بہن ریحانہ ہے' ایسی شمو ہے۔ میں نے اسے ساری بات بتادی ہے۔''

''لیکن تم نے خط تھانے کے اندر پھینکنے کی حماقت کیوں کی۔ یہ ایک انتہائی بچکانہ حرکت تھی جب کہ تم خط ڈاک کے ذریعے بھی بھیج سکتے تھے۔'' میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری' چند لمحے تھوک نگلنے کے لیے توقف کیا پھر گویا ہوا۔

''تھانیدار صاحب! مجھے ایسے ہی کاموں میں مزہ آتا ہے۔ یہ عادت فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ ایڈونچر اور شکار کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں' اس کی وجہ بھی بتاؤں؟ جب مراد بے ہوش اور زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا تو میرے لیے مراد سے پیسے لینا کھٹائی میں پڑگیا۔ میں اس وقت تک آپ کو نصرت کے سرکس کی طرف متوجہ رکھنا چاہتا تھا۔ جب تک مراد ٹھیک ہوکر میرا مطالبہ نہ پورا کردیتا۔''

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ مراد تمہارے اوپر کیس بھی بنوا سکتا ہے؟''

''تھانیدار صاحب! میں چند دنوں بعد عزت کے ساتھ شمو اس کو واپس کردیتا لیکن اس کے اسپتال پہنچنے کی وجہ سے سارا پلان فیل ہوگیا۔''

قارئین آپ نے شکور دین کی نفسیات کا اندازہ لگایا وہ بے وقوفی کی حد تک دلیر تھا۔

بہرحال وہ مجرم تھا' ہم نے مقدمہ بنا کر سپرد عدالت کردیا اس سے پہلے دو گواہوں کی موجودگی میں شمو کو برآمد کرلیا تھا۔

رنگ ماسٹر کو ہم نے رہا کردیا تھا۔

○

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

نسرین کوثر......لاہور

ج:۔ تارا میرا تیل (کڑوا تیل) اس پر 11 مرتبہ سورۃ عبس (23واں پارہ) پڑھ کر دم کریں روزانہ وہ تیل سر پر لگائیں۔

ثمینہ ارشاد......رحیم یار خان

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
پھر دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسئلہ جلد ہو جائے گا۔

شائستہ غلام محمد......میلسی

ج:۔ "یا ولی یا والی" 101 بار پڑھیں ہر نماز کے بعد دعا مانگیں۔

صبا اقبال......گجرات

ج:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل (اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کر دیں چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔
رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

ث۔ش......کھاریاں

ج:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ اپنے رشتے کے لیے۔
"یا فتاح" روزانہ 1 تسبیح نتیجہ آنے تک۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

گل آرا......آزاد کشمیر

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اچھے اور جلد رشتوں کے لیے دعا کریں اور راضی بھی ہو جائیں۔

آمنہ بتول......بہاولپور

ج:۔ 41'41 پڑھیں رات سوتے وقت سورۃ الفلق اور سورۃ الناس اور اپنے جسم پر پھونک ماریں۔
بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھ کر اچھے رشتے کی دعا کریں۔ دورانیہ 3 ماہ۔

شہناز بیگم......کراچی

ج:۔ بڑا بیٹا نماز کی پابندی کرے۔ فجر کی نماز کے بعد 1 مرتبہ سورۃ یسین اور 1 مرتبہ سورۃ رحمن پڑھے۔
فوراً گھر لینا ٹھیک نہیں حاسدین کی دشمنی کا اندیشہ ہے۔ کچھ وقت ٹھہر کر جو مناسب ہو وہ فیصلہ کر لیں۔
سارے پیسے کاروبار میں نہ لگائیں۔

ریحانہ تبسم......لالہ موسیٰ

ج:۔ تبسم ارم اور عائزہ نوشین جب سو جائیں ان کے سرہانے کھڑے ہو کر الگ الگ سورۃ العصر 41 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ نیت یہ رکھیں کہ فرمانبردار ہو رہی ہیں۔ اتنی آواز میں پڑھیں کہ اگر جاگ رہی ہوں تو سن سکیں۔
رشتوں کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف رشتوں کے لیے دعا بھی کریں۔
اگر ممکن نہ ہو تو ہر فرض نماز کے بعد پڑھ کر تصور میں دونوں بیٹیوں کی شکل لا کر ان پر دم کریں۔ اللہ مہربان ہو۔

نغمانہ......کھاریاں

ج:۔ 11 مرتبہ سورۃ عبس 23 پارہ۔ بغیر بسم اللہ بغیر درود شریف۔ رات کو پڑھ لیں۔ دو بوتل پر دم کریں۔
ایک کو صبح پورے گھر کی دیواروں پر چھڑک دیں دوسری سب گھر والے تھوڑا تھوڑا استعمال کریں۔ روزانہ کا عمل ہے۔ 3 ماہ تک کرنا ہے۔
۲:۔ ایک تیل کی بوتل پر دم کریں۔ سورۃ عبس 11 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف روزانہ سر پر لگائیں۔ ان شاء اللہ سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔

رابعہ تنویر......لاہور

ج:۔ چونکہ آپ نے گھر کا مکمل پتا اور گھر کے افراد

کے نام تحریر نہیں کیے۔ اس لیے گھر کے حالات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گندے عمل کی وجہ سے ہوا ہے۔
روزانہ سورۃ بقرہ 1 مرتبہ پڑھ کر 2 بوتل پر دم کریں۔ ایک بوتل کا پانی پورے گھر میں چھڑکیں۔ دوسری تمام گھر والے صبح شام استعمال کریں۔ 3 ماہ تک جاری رکھیں۔ صدقہ بھی دیں۔

ماریہ شکیل......فیصل آباد

ج:۔ ہر فرض نماز کے بعد "سورۃ العصر" 21 بار پڑھیں۔ اول و آخر 3'3 بار درود شریف۔ تصور میں بھائی کو سامنے رکھ کر۔ پڑھنے کے بعد تصور میں بھائی پہ پھونک ماریں نیت اچھا اور فرمانبردار ہونے ہو۔

عاصمہ نورین......لاہور

ج:۔ رات سوتے وقت سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 19'19 بار۔ یہ وظیفہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ

حسیب احمد......ملتان

ج:۔ 11 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کے تیل پر دم کریں اور پانی پر' روزانہ تیل کی مالش کریں اور پانی زیادہ سے زیادہ پلائیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف ہر ماہ یہ عمل کر لیا کریں۔
رزق میں فراوانی کے لیے صدقہ دیا کریں۔ ہر نماز کے بعد سورۃ القریش 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

صائمہ......حجرہ شاہ مقیم

ج:۔ سورۃ ال عمران آیت 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھیں (دونوں) دعا بھی کریں۔
سورۃ عبس (23واں پارہ) 11 مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔
ان شاء اللہ آپ کی مراد جلد پوری ہوگی۔

ماہ نور......سرگودھا

ج:۔ "یا علیم" پڑھنے سے پہلے 11 بار درود شریف پڑھیں۔ رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار بعد نماز فجر پڑھیں اور دعا مانگیں۔

مس ناز......کراچی

ج:۔ اول و آخر 11'11 بار درود شریف۔ 141 بار سورۃ الفلق اور سورۃ الناس روزانہ پڑھ کر سب گھر والے پئیں اور در و دیوار پہ چھڑکیں۔ 40 دن بعد بہتری شروع ہوگی۔ یہ عمل 3 ماہ تک جاری رکھیں۔

اسماء......میرپور خاص

ج:۔ کاروباری ذہن نہیں ہے آپ کے شوہر کا۔ "سورۃ النصر" 30واں پارہ۔ بعد نماز عشاء 125 بار اول و آخر درود شریف 25'25 بار۔ روزانہ بلا ناغہ پڑھیں۔ بہت اچھا رسپانس ملے گا۔ پڑھنا صرف شوہر کے لیے ہے۔

مریم شاہین......گوجر خان

ج:۔ "یا لطیف یا ودود" 11'11 مرتبہ رات کے وقت اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

آمنہ......حیدرآباد

ج:۔ روزانہ 3 بار سورۃ 'الجن' پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پلائیں اور تیل پر دم کر کے سر میں لگائیں۔
ان شاء اللہ ایک ماہ میں فرق آ جائے گا۔

ن......خانیوال

ج:۔ رات کو سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 41'41 بار پڑھ کر بندش و رکاوٹ ختم ہونے کی دعا کریں۔
بعد نماز فجر سورۃ فرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھ کر رشتے کے لیے دعا کریں۔ 3 ماہ تک۔

نسیم فاطمہ......بھکر

ج:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔
بھابی کے لیے:۔ سورۃ ال عمران آیت نمبر 38 ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ پڑھیں اور دعا بھی کریں۔

ساحرہ......راولپنڈی

ج:۔ گھر بدلنے کی ضرورت نہیں۔ والدہ اور والد پڑھیں دونوں بھائیوں کے لیے۔ "یا حکم یا عظیم" ہر فرض نماز

کے بعد 313 بار اور صبح وشام 77 بار سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق سورۃ الناس پڑھ کر پانی پہ پھونک مار کر سب گھر والے پئیں اور چھڑکیں بھی۔ پانی زمین پر نہ گرے۔ باتھ روم والی سائیڈ پر نہ چھڑکیں۔ 3 ماہ تک۔

ع ظ.....شیخوپورہ

ج:۔ "یا حکم" اس کا ورد بغیر تعداد کے رکھیں۔ نیت' چچا میری بات مانیں اور والدہ کے ساتھ رہنے دیں۔ بی بی اللہ سے مانگیں۔ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ ابو کے خاندان میں شادی ہوگی۔

بشریٰ پروین.....میرپور خاص

ج:۔ دونوں بچیاں سورۃ الاخلاص 41 بار پڑھیں۔ رات سونے سے پہلے اللہ سے بندش ٹوٹنے کی دعا کریں۔ بعد فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھیں۔ پڑھ کر رشتے کی دعا کریں۔ اللہ عطا کرے گا۔ 3 ماہ تک پڑھیں۔

محمد احسان.....سرگودھا

ج:۔ استغفار کی کثرت کریں۔ علاقے کے مفتی صاحب سے رجوع کریں یہ شرعی مسئلہ ہے۔

سعیدہ.....سیالکوٹ

ج:۔ سورۃ الفلق' سورۃ الناس 141'141 بار دونوں سورتیں دن میں۔ اول و آخر 11'11 بار درود شریف۔ ایک بار پڑھ کر پانی پہ پھونک مار کر خود بھی پئیں سب کو پلائیں اور گھر میں چھڑکیں اور پڑھتے وقت نیت کریں کہ جو بھی بندش و رکاوٹ ہے وہ ختم ہو۔

بیٹا 125 بار "سورۃ النصر" اول و آخر 25'25 بار درود ابراہیمی روزانہ رات کو پڑھے۔ کامیابی کے لیے۔

پری.....چشتیاں

ج:۔ کزن سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 41 بار پڑھ کر دعا کرے کامیابی کے لیے۔
بہتر ہے نام تبدیل کردیں۔

محمد عزیر شاہ.....میانوالی

ج:۔ ۱۔ ہر نماز کے بعد "یا قوی" 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں یاد رہے گا۔ جب یاد ہوگا تب شوق بھی پیدا ہوگا۔ ۲۔ والدہ بھائی کے سرہانے رات کو کھڑی ہو کر 21 مرتبہ سورۃ العصر پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت یہ ہو کہ بھائی فرمانبردار ہو رہا ہے۔ ۳۔ خالہ رات کو 101 مرتبہ سورۃ لھب اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھیں۔ نیت یہ رکھیں کہ بیٹا واپس گھر کی طرف آ رہا ہے، ہمیشہ کے لیے دعا بھی کریں۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن

نام........ والدہ کا نام........ گھر کا مکمل پتا........

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں........

خُوشبُوسُخن

عمر اسرار

نظم

میرا دل!
اک پجاری تھا جس نے
تیرے دل کی پوجا کی تھی
میرا دل ایک خزانہ تھا
جس کی دولت تم تھے
یہ دل تاج محل تھا میرا
جس پر بجلی گرا دی تم نے
اور آج میری تربت
تمہارے ایک قطرہ آنسو
ایک پھول کو ترستی ہے

شہنی ارشاد.....کراچی

اجنبی شخص

لفظوں کا جادوگر
اجنبی سا شخص
جانے کیوں
اپنا اپنا سا لگتا ہے
جو بولے تو
محرم دل کا لگتا ہے
جو دیکھے تو
نظر آشنا سا لگتا ہے
وہ ایک اجنبی سا شخص
لفظوں کا جادوگر
جانے کیوں
اپنا اپنا سا لگتا ہے

ریحانہ سعیدہ.....لاہور

غزل

محبت جب دل میں گھر کرتی ہے
ازل سے ابد تک سفر کرتی ہے
اندھیری راتوں میں یہ کیسے دھوکے
داغ دل کو مثل قمر کرتی ہے
گر نہ دے سکے وفاؤں کا صلہ
تو جفاؤں کو در گزر کرتی ہے
سمجھنا آنسوؤں کو اس کے موتی
لٹا کر یہ شام و سحر کرتی ہے
مہک رہا ہے چمن آغوش میں
پنہاں ہے بوئے گل شکر کرتی ہے
اور کیا کہوں پہلوئے دل نہیں
بات دل سے نکلی اثر کرتی ہے

سید عبداللہ شاہد.....حیدرآباد

امکاں صورت

زیست سفر میں
لاکھ کدورت
لیکن تم ہی روز ازل سے
امکاں صورت
کٹھن مراحل کب رہتے ہیں
رستے سارے کٹ جاتے ہیں
سفر کی مشکل ہنس کر جھیلو
آبلہ پائی ایک حقیقت
سر کا سودا ہے سلامت
آئے نہ جنبش پائے جنوں میں
حرفِ پیماں رہے سلامت
تری خوش گفتاری ہے
زنداں میں زنجیر کا نغمہ جاری ہے
روز ازل سے امکاں کی صورت
رقص ہمارا جاری ہے

رقص ہمارا ظریف احسن
سوئے منزل جاری ہے
ظریف احسن...... کراچی

غزل

تم نے شوخی کا یہ انداز نیا رکھا ہے
طالب دید کو پردے میں چھپا رکھا ہے
نور وظلمت کا کھلونا یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے
تم نے مٹھی میں یہ جگنو جو چھپا رکھا ہے
باغباں ہم سے یہ اظہار تنفر کیسا
ہم نے گل زار کو گل زار بنا رکھا ہے
دل فراموش کرے کیسے بھلا اس کو جمال
یاد نے جس کی یہ طوفان اٹھا رکھا ہے
سمیع جمال...... کراچی

غزل

میرے اس کے درمیاں یہ رابطہ ہے اور بس
عمر بھر اک دوسرے کو سوچنا ہے اور بس
زندگی وعدہ ہے میں واپس پلٹ کر آؤں گا
میں نے بس اک بار اس کو دیکھنا ہے اور بس
یار تو نے منزلوں کا سوچ بھی کیسے لیا
عشق بس اک راستا ہے اور بس
کھڑکیاں سب بند ہیں احباب سارے سوچکے
میں ہوں یا پھر اک قلندر جاگتا ہے اور بس
رات دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے آج بھی
آج بھی کمرے میں، میں ہوں اک دیا ہے اور بس
خواب زادی آ کبھی خوابوں سے ہٹ کر بھی ملیں
خواب تو ہیں خواب ان کو ٹوٹنا ہے اور بس
اے شب گریہ مری آنکھیں مکمل رو چکیں
آخری اک اشک پلکوں پر کھڑا ہے اور بس
زندگی! سب کچھ سلامت ہے میرا اس کے بغیر
ہاں مگر اک دل مرا ٹوٹا پڑا ہے اور بس

میثم علی آغا

غزل

وہ مل جائے تو یک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے
ہمیں ہر موڑ پر اس کی کمی محسوس ہوتی ہے خزاں
میں بھی انہیں اک تازگی محسوس ہوتی ہے
وصال یار میں ہیں زندگی کی رونقیں پنہاں
بچھڑ جانا قیامت کی گھڑی محسوس ہوتی ہے
کسی بھی حال میں اخلاق سے عاری نہیں ہوتا
کہ اس کی دشمنی بھی دوستی محسوس ہوتی ہے
علاج زخم دل میں اک جدت پائی جاتی ہے
نمک پاشی بھی اب چارہ گری محسوس ہوتی ہے
ہمارے ہاتھ میں کشکول شاید اچھا لگتا ہے
ہمیں تو بھیک بھی کیسی بھلی محسوس ہوتی ہے
نگاہوں میں چراغ آ گہی روشن ہوا جب سے
قمر کو ہر طرف اک روشنی محسوس ہوتی ہے
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

یہ صدیوں کی تم سے رفاقت ہے جانم
جو پہلے تھی اب بھی محبت ہے جانم
ہمیں بخشتے ہو سدا جام الفت
یہ ہم پر تمہاری عنایت ہے جانم
یہ تاروں بھری رات ہے کتنی تنہا
تمہاری بہت ہی ضرورت ہے جانم
مری خواہش دل پگھلنے چلی ہے
ترے لمس کی یہ حرارت ہے جانم
تری اک ہنسی ہے اداسی پہ غالب
تری چال بھی کیا قیامت ہے جانم
یہی رات دن مشغلہ بن گیا ہے
تجھے سوچنا میری عادت ہے جانم
نہ بدلا ہے رانا نہ بدلے گا رانا

بھلا مجھ سے کیسی شکایت ہے جانم
قدیر رانا...... راولپنڈی

دل

دل اک مندر
اس مندر کے بھگوان ہو تم
دل اک گرجا
اس گرجا کے بلوان ہو تم
دل اک مسجد
اس مسجد کے امام ہو تم
دل اک گگن
اس گگن کے چاند ہو تم
دل اک جسم
اس جسم کی جان ہو تم
دل اک منزل فہد
اس منزل کا نشان ہو تم
محمد فہد...... تحصیل جتوئی

غزل

تیز ہواؤں کا شور ہو بے شک کتنا
چراغ آخر شب میں نہیں بجھنے والا
باغباں لاکھ کوشش کر کے دیکھ لے
مرے گھر کا شجر ہے نہیں گرنے والا
حوادث زمانہ سے جو الجھتا رہا تمام عمر
کسی نئے طوفان سے ہے نہیں ڈرنے والا
اسی کی باتوں سے تو یوں لگتا ہے مجھے
اب کی بار وہ ہے نہیں رکنے والا
کوئی اسے بھی تو سمجھائے ذرا لوگو
یہ کام اس طرح سے ہے نہیں ہونے والا
وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

ہم نے جو تیرے ساتھ گزاری تھی ایک شام
کتنی ہمیں وہ جان سے پیاری تھی ایک شام
زلفوں کی خوشبوؤں سے ہواؤں کے شہر میں
ہے یاد وہ جو تم نے نکھاری تھی ایک شام
میں اس کو بھول جاؤں یہ ممکن نہیں کبھی
مہکی ہوئی جو خوب کنواری تھی ایک شام
کیا بزم شاعران غزل گو کا رنگ تھا
ہم لب کشا تھے خوب تمہاری تھی ایک شام
بچھڑے جو ہم کسی سے تو محسوس یہ ہوا
ہر شام کائنات پر بھاری تھی ایک شام
واجد کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اسے بھلا
مل بیٹھ کے جو ہم نے سنواری تھی ایک شام
پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... بلیر، کراچی

غزل

آ تجھ کو بتاؤں کہ تنظیم گلستاں کیا ہے
رت خزاؤں کی ہے فصل بہاراں کیا ہے
بیچ کر عزت ناموس زندہ رہو گے کب تک
کالے سورج، سرخ آندھی میں بے چشم رہو گے کب تک
جو پجاری ہیں زر وسیم کے مٹ جائیں گے
پیار ملت سے کریں گے تو صلہ پائیں گے
کل انہیں کڑی دھوپ میں سایہ نہ ملے گا
ظلم اتنے کیے ہوں گے کہ ٹھکانہ نہ ملے گا
دوستی کے لبادے میں خنجر لگا کرتے ہیں
یوں بھی کچھ لوگ اپنوں سے دغا کرتے ہیں
غیر قوموں کی حمایت میں لڑا کرتے ہیں
میر جعفر، میر صادق کا کردار ادا کرتے ہیں
بس یہی وقت ہے کہ گلستاں سے کرو پیار
اپنی منزل کو پکارو، اپنی راہوں سے کرو پیار
میرے ہم دم، میرے دوست وقت کی پکار سنو
اس دیس کے بندوں سے بڑا پیار کرو
ارشد بخاری

نظم

میری اک نظم سے دوستی ہوگئی ہے
اب وہ سورج ڈھلتے ہی
رات کے پچھلے پہر کا انتظار کیے بغیر
میری کالونی کی چوڑی سڑکوں پر
گھنٹوں تلک آوارہ گردی کرتی رہتی ہے
اونچے لمبے سرو کے درختوں سے لپٹتی ہے
تو کبھی......
سفید مرمریں مجسمے سے اٹھکھیلیاں کرتی ہے
کبھی سنگی بینچ پر لیٹ جاتی ہے
تو کبھی......
نرم شبنمی کارپٹ گراس پر دبے پاؤں چلتی ہے
کبھی علاقے کی واحد سپر مارکیٹ میں کھڑی
شوکیسوں میں سجی چیزوں کو حسرت سے دیکھتی ہے
تو کبھی......
خوشیاں بانٹتے ہوئے داتا بن جاتی ہے
میری ایک نظم سے دوستی ہوگئی ہے
اب اکثر وہ رات ڈھلے
میرے آنگن کی اونچی باڑ ٹاپ کر
پورچ میں کھڑی گاڑی کے پاس سے سرکتے ہوئے
روش پہ رکھے گملوں سے بچتے بچاتے
گلاب کے کانٹوں سے زخم کھاتے
دبیز گھاس پر چل کر فوارے تک جا کر
اچھلتے پانی سے منہ پہ چھینٹے اڑاتی ہے
پھر مستی میں رقص کرتی گنگناتی ہے
تھکن جب اس کی دودھیا پنڈلیوں میں سرسراتی ہے
تب وہ برآمدے میں لگے کین کے جھولے پر
بیٹھ کر گھنٹوں تلک آوارہ غزلیں گاتی ہے
اسے جب میرے جاگنے کا احساس ہوتا ہے
میرے کمرے سے آتی روشنی کا ادراک ہوتا ہے
تب وہ میری فرنچ طرز کی بنی کھڑکی کو
بڑے ہی پیار سے کھٹکھٹاتی ہے
اس کی نازک کلائی میں پڑی چھ کالی چوڑیاں
بہت ہی کھنکھناتی ہیں
میں جب اسے سہارا دے کر کمرے میں لاتا ہوں
وہ میری رائٹنگ ٹیبل پر جھکی
میری تحریریں پڑھتی ہے
مجھ سے باتیں کرتی ہے
پھر جب صبح کاذب ہوتی ہے وہ میرے بیڈ پر آتی ہے
میرے گھنے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیر کر مجھ کو
سلاتی ہے
مجھے تمہارا احساس دلا کر
میرے جذبات سے کھیلتی ہے
میرے کانوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتی ہے
گہری نیند میں جانے سے قبل
اسے بانہوں میں بھرنے کو
اپنی بانہیں پھیلاتا ہوں
وہ میرے سینے پر لپٹی مچل مچل سی جاتی ہے
پر بڑی بے وفا ہے وہ
آنکھ کے جھپکتے ہی اوجھل ہو جاتی ہے

نازسلوش ذشے...... میر پور، آزاد کشمیر

⌘

ذوق گہی

عفان احمد

جو چاہتا ہے کہ اسے دنیا اور آخرت میں عزت ملے تو وہ اللہ کی اطاعت کرے دنیا و آخرت کا مالک اللہ ہی ہے۔ ساری عزتیں اسی کے پاس ہیں۔ وہ جس کو عزت دے وہی عزیز ہوگا۔ جس کو وہ ذلیل کردے اسے دنیا کی کوئی طاقت عزت نہیں دے سکتی۔ قول، عمل کے بغیر اللہ کے ہاں بے حیثیت ہے۔ وہ اتنا بے نیاز ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کے گھاٹ اتار کے تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق پیدا کردے جو اس کی اطاعت کرے۔

وسیم اختر......راولپنڈی

آنکھوں والے اندھے

رات کا وقت تھا، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ اپنے مریدوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے اور مسکرا دیتے۔ مریدوں کو تعجب ہوا سب نے یک زباں ہو کر سوال کیا حضرت اپنی مسکراہٹ کا سبب بتانا پسند فرمائیں گے۔ آپ نے فرمایا۔ ضرور، میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے اللہ پاک نظر آتے ہیں۔ خوشی میں مسکرا دیتا ہوں۔ تم نے بھی اللہ پاک کا دیدار کرنا ہے تو میرے ہمراہ اوپر دیکھو جب آپ نے اوپر نگاہ فرمائی تو سب نے تقلید کی۔ آپ نے فرمایا۔ تم نے اللہ پاک کو دیکھا۔ سب نے گردن جھکا لی اور شرمندہ ہو کر بولے۔ جناب ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا۔ آپ مسکرا دیے فوراً فرمایا جان بوجھ کر اندھے مت بنو کیوں جھوٹ بولتے ہو، جب میں اللہ پاک کو دیکھ رہا ہوں تو تمہاری بینائی کو کیا ہوا۔ یقیناً وہ تمہیں بھی نظر آرہا ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ آنکھوں والے اندھے مت بنو۔ اپنی بینائی سے کام لو۔ اللہ کی محبت کا آنکھوں میں سرمہ ڈالو تا کہ تمہاری بینائی بحال ہو۔ تم عارفانہ محبت کا دعویٰ تو کرتے ہو مگر تقلید نہیں کرتے۔ تم مرشد کی باتیں سنتے ہو مگر عمل نہیں کرتے۔ تم ان لوگوں کی طرح مت بننا جو آنے والے وقتوں میں مزاروں کی پوجا پاٹ کریں گے۔ عرق گلاب سے مزاروں کو دھوئیں گے دھمال ڈالیں گے۔ قبروں پر چادریں چڑھائیں گے، بدعت و شرک میں مبتلا ہو جائیں گے اصل فریضہ جو نماز ہے ترک کردیں گے۔ یقیناً یہی لوگ جہنمی ہوں گے۔ آسمان کی طرف دیکھو۔ یہ جو چاند ستارے ہوا میں معلق نظر آرہے ہیں۔ نہ ہی تمہارے باپ دادا نے بنائے ہیں نہ میرے باپ دادا نے۔ یہ سب میرے اللہ پاک کی قدرت کے نشان ہیں وہ بڑی خوبیوں والا ہے۔ وہ اپنی ان نشانیوں میں صاف نظر آرہا ہے۔ انسان کو اختیار نہیں کہ ایک چھٹانک کی بٹی کو فضا میں معلق کردے۔ یہ اللہ پاک کی قدرت ہے کہ زمین سے بھی کئی گناہ وزنی سیارے فضا میں معلق ہیں۔ مریدوں نے بابا گنج شکرؒ کی بات سنی اور مارے شرم کے انگلیاں چبانے لگے۔

بشیر احمد بھٹی......بہاول پور

معلومات

☆ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی اور مسلمانوں کے عظیم رہنما سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شائع کیا تھا۔

☆ زمین اور زمین میں موجود چیزوں کا مطالعہ علم ارضیات کہلاتا ہے۔

☆ ملک شمالی یمن کا دارالحکومت صنعا ہے۔

امریکی محکمہ دفاع کی عمارت کو پینٹا گون کہتے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق تقریباً سوا دو سال خلیفہ رہے۔

☆ قرطبہ اسپین (ہسپانیہ) ملک کا ایک مشہور شہر ہے۔

☆ پاکستان کا سب سے بڑا ریگستان تھرپارکر سندھ میں ہے۔

☆ آسمانی کتاب زبور عبرانی زبان میں نازل ہوئی۔

☆ شہزادے محمد سلیم جہانگیر چشتی کی ملکہ نور جہاں کا اصل نام مہر النساء تھا۔

☆ گریٹ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے والد مغل بادشاہ نصیر الدین ہمایوں تھے۔

☆ انڈیا کے شمالی ملک نیپال کی کرنسی روپیہ کہلاتی ہے۔

پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

فرق

بیوی نے شرماتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔ ''آپ ذرا بھی رومینٹک نہیں ہے۔ راحیلہ کا شوہر اسے میرا چاند اور میرا تارا کہہ کر بلاتا ہے۔''

شوہر نے جواب دیا۔ ''بھئی وہ ماہر فلکیات ہے اور تم تو جانتی ہو کہ میں حیوانوں کا ڈاکٹر ہوں۔''

☆......☆

صفائی پسند

ایک گوالے سے کسی نے پوچھا۔ ''آج کل کاروبار کیسا چل رہا ہے۔''

گوالے نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ آپ کو تو پتا ہے میں ہر چیز میں صفائی کا کتنا رکھتا ہوں۔ آج کل میں دودھ میں بھی پانی ابال کر ڈالتا ہوں۔

☆......☆

بچے ہمارے عہد کے

بچہ: ''امی جان! آپ سرکس میں کام کرتی ہیں۔''

ماں: ''نہیں تو' یہ بات تم سے کس نے کہی ہے؟''

بچہ: ''امی! ساتھ والی پڑوسن کہہ رہی تھیں کہ آپ ڈیڈی کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔''

ریاض بٹ...... حسن ابدال

احسان کی ترغیب

ایک راستے میں ایک نوجوان میرے سامنے آیا، ایک بکری اس کے پیچھے بھاگی چلی آرہی تھی۔ میں نے اس سے کہا یہ رسّی اور پٹا ہے اس کی وجہ سے بکری تیرے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ اس نے فوراً اس کا پٹا اور زنجیر کھول دی اور دائیں بائیں طرف دوڑنا شروع کردیا۔ بکری راستہ پر اسی طرح اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں جو اور گھاس تھی۔ جب وہ کھیل کود سے اپنی جگہ واپس آیا تو مجھے دیکھ کر بولا اے عقل مند! یہ رسّی اس کو میرے پیچھے نہیں لیے چلتی ہے بلکہ احسان کی رسّی اس کے گلے میں پڑی ہوئی ہے، ہاتھی والا چوں کہ ہاتھی پر احسان اور مہربانی کرتا ہے اس لیے وہ مستی کی حالت میں بھی اس پر حملہ نہیں کرتا ہے۔

فائدہ: اے نیک آدمی! بروں پر مہربانی کر، کتا جب تمہاری روٹی کھاتا ہے تو تمہاری حفاظت بھی کرتا ہے۔

ایس اکبر خان...... بھکر

شب خون

عبداللہ شاہد

ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نام پر اپنی روایاتوں کو فراموش کردینے والوں کا قضیہ' ان لوگوں کا فسانہ جو جائز اور ناجائز کا فرق بھول کر انسان سے حیوان بن جاتے ہیں۔ دولت کی ہوس میں اندھے ہوجانے والوں کا المیہ' جنہیں دینی اقدار تو دور کی بات ہے شرف انسانیت بھی یاد نہیں رہتا۔
ایک ہائی کلاس سرمایہ دار گروپ کی کہانی جو فرعون بنتے ہوئے موسیٰ کو فراموش کر بیٹھے تھے۔

اچھی کہانیاں پڑھنے کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص

ہائی کلاس کے غیر متوازن شب وروز وقت کی مسیحائی کے دشمن ہی تو ہوتے ہیں۔ حرص وہوس زدہ غافل اور ننگ ہستی مزاج کے لوگ' رات گئے تک بدمستی اور معصیت میں مشغول رہتے ہیں اور دن چڑھے تک شیطانی خمار میں غرقاب...... اور مردود رہتے ہیں۔ ایسے دولت مندوں کو دن کی زندگی بخش حرارت اور جوش وتمازت نصیب نہیں ہوتی! مردان شاہ جس کی عمر پچاس سال تھی' ایک ایسی ہی دولت مند ہائی کلاس فیملی کا خدمت گزار اور محکوم شخص تھا۔

طلوع وقت وہ منظر معمول کا تھا۔ مردان شاہ تازہ دم ہونے کے خیال سے کشادہ سرسبز لان میں چہل قدمی کررہا تھا۔ اس کے ایک طرف وسیع وعریض اراضی پر محیط ایک عالیشان کوٹھی موجود تھی۔ کوٹھی کی سرخ پتھروں سے بنی محرابی چھت کے جھومر پر ''امتیاز ہاؤس'' لکھا جگمگا رہا تھا۔ امتیاز کریم کا شمار ملک کے بڑے اور نامی گرامی تاجروں میں ہوتا تھا۔ چمڑے کی صنعت سے وابستہ ہزاروں افراد...... اس کی فیکٹریوں میں دن رات ذریعہ معاش میں مصروف کار تھے۔ اس کا کاروبار امپورٹ ایکسپورٹ لائن میں قابل قدر نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ایران' عراق اور مشرق وسطیٰ سے یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ متمول اور باوقار شخص مردان شاہ کا آقا ومالک تھا۔

امتیاز کریم کے والد شاہ عبدالکریم ایک شریف النفس' منکسر المزاج اور خوددار شخص تھے۔ وہ چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ امتیاز کریم اور اعجاز کریم' بڑا بیٹا امتیاز نوعمری سے ہی کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اعجاز جو شاہ کریم اور ان کی بیگم صبیحہ بی بی کا لاڈلا بیٹا تھا' اس وقت ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ شاہ اور ان کی بیگم کو بیٹی نہ ہونے کا ہمیشہ قلق اور ملال رہتا تھا لیکن وہ مشیت ایزدی پر خوش اور شکر بجالاتے تھے اور محلے اور عزیز رشتے داروں کی بچیوں پر محبتوں اور شفقتوں اور تحفے تحائف کے ذریعے اپنے قلبی جذبات کا مداوا کرلیا کرتے تھے۔

ابھی امتیاز کریم کی عمر تیرہ چودہ برس تھی اور وہ والد کی دکان پر کام کرتے تھے کہ اسی دوران ایک روز سترہ اٹھارہ برس کا ایک غریب الہ یار اور مفلوک الحال نوجوان دکان میں داخل ہوا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر خدمت گاری کی...... تصویر بن گیا۔ یہ مردان شاہ تھا' اس کے ماں باپ فوت ہوچکے تھے۔ ایک بہن اور بھائی دنیا کی خودغرضی اور بے ثباتی کا شکار ہو کراس سے بچھڑ گئے تھے اور وہ دنیا میں دربدر اور اکیلا رہ گیا تھا۔ مردان کی حالت زار دیکھ کر شاہ کریم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا۔ اب مردان بھی ان کے بیٹے امتیاز کے ساتھ دکان پر کام کرنے لگا اور ان کے ساتھ رہنے لگا۔ مردان کے شاہ کریم کے دست ارادت میں آئے ابھی چھ سات ماہ گزرے تھے کہ ان کا چھوٹا چہیتا بیٹا اعجاز کریم اچانک ایک روز ہیضے کا شکار ہوکر نوعمری میں انتقال کرگیا۔ لاڈلے کم سن بیٹے کی موت کے صدمے سے شاہ کریم کی بیگم کو سکتہ ہوگیا اور وہ شدت غم سے بیمار ہوکر بستر سے لگ گئیں۔ دکھ وصدمے کے یہ شب وروز شاہ کریم کو بھی بے قراری اور اضمحلال میں مبتلا رکھتے تھے۔ ادھر مردان اور امتیاز بھی ان کی غم ناکی دیکھ کر افسردہ نظر آتے تھے پھر کوئی ڈھائی تین ماہ کے مختصر عرصے میں صبیحہ بی بی بھی بیٹے کے صدمے سے اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ زندگی کے بوجھ کو ڈھونے کی غرض سے شاہ کریم تنہا رہ گئے۔ پھر بڑے بیٹے امتیاز اور گاہے بگاہے اپنی خدمتوں سے خوش آرام اور خاطر طبع رکھنے والے خادم مردان کے درمیان چند برس گزر گئے۔

اب امتیاز جوانی کے جوش وخروش سے دوست یاری میں سرگرم نظر آنے لگا تھا۔ شاہ کریم سے نظر بچا کر وہ اٹھکیلیاں اور شوخیاں مارنے لگ جاتا۔ ادھر شاہ کریم اس کی منگنی اپنی سالی کی بیٹی سے کرچکے تھے۔ محض اس وجہ سے کہ بیٹا بدفعلیوں میں نہ پڑجائے۔ صبیحہ بی بی کی جدائی کو برداشت کرتے کرتے اب وہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے پہلو بہ پہلو مردان دیکھ رہا تھا کہ مالک کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی لیکن وہ شاہ کریم کے دل کے بھید سے ناواقف تھا۔ ایک روز شاہ کریم نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ وہ امتیاز کے ساتھ ساتھ اس کا بھی گھر بسانے کا سوچ چکے ہیں اور اس کے لیے ایک نیک خصلت لڑکی دیکھ چکے۔ وہ اسے مردان شاہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اپنے آقا کی یہ بندہ پروری دیکھ کر محبت وخلوص سے اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔ مخدوم نے اس جیسے غریب اور لاوارث کو اپنے سگے بیٹے کی خوشیوں کے برابر خوشیاں دینے کا فیصلہ سنایا تھا اور اپنے دست رحم وکرم سے اسے گدا سے شاہ بنادیا تھا۔ پھر اپنے داتا کی نیازمندی سے مردان کا سر جھکتا چلا گیا۔ امتیاز اور مردان شاہ کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے کچھ ماہ تک شاہ کریم ان کے درمیان رہے پھر وہ انتقال کرگئے۔

اپنی موت سے ایک ہفتے پہلے شاہ کریم نے بیٹے کے حوالے سے مردان کو چند ضروری باتوں سے آگاہ کیا تھا اور عہد لیا تھا کہ وہ امتیاز اور اس کی بیوی بچوں کی اپنی جان سے بڑھ کر دیکھ بھال رکھے گا اور بڑے بھائی کی حیثیت سے اچھے برے حالات میں اس کا ساتھ نبھائے گا اور سہارا بنے گا۔ شاہ کریم کو امتیاز کے کاروباری انداز واطوار دیکھ کر بعض خدشات لاحق تھے۔ ان کے خلاف مزاج امتیاز کو دولت پرستی کا جنون تھا اور شاہ کو ڈر تھا کہ پیسے کا یہ خبط امتیاز کو گمراہ نہ کردے۔

مردان شاہ اپنے مالک سے کیے عہد کو نبھانے کے جذبے سے امتیاز کریم کا سایہ بن گیا اور عمر میں چار پانچ سال کے تفاوت کے باوجود وہ چھوٹے مخدوم کے آگے خدمت گزاری کے ذوق وشوق کا مثالی نمونہ بن گیا۔

امتیاز کریم کو وراثت میں چار کمروں پر مشتمل ایک مکان ملا تھا۔ امتیاز اور اس کی بیوی حلیمہ بی بی کے استعمال میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ مہمان خانے کے طور پر مخصوص تھا۔ باقی ایک کمرے میں مردان شاہ اور اس کی بیوی حسنہ رہتے تھے۔ دونوں گھرانوں میں

باہمی تعلقات اور میل جول سگے بھائیوں جیسا تھا لیکن مردان شاہ کو اپنے ان داتا شاہ کریم کی وصیت بخوبی ازبر تھی اور جسے اسے اور اس کی بیوی کو نبھانا تھا۔ دونوں میاں بیوی امتیاز اور حلیمہ کے ساتھ روزمرہ کے کاموں میں ان کے مراتب کا خیال رکھتے اور سید گھرانے کی پاسداری میں مخدوم اور خادم کے درمیان حدود کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ مبادا اپنے مالک کی تفویض کی گئی ذمہ داری سے غفلت اور نمک حرامی کے مرتکب ہوں۔ محبت، خلوص اور وفاشعاری کے اس حرارت بخش ماحول میں وقت کا پنچھی اونچے نیچے ہلکورے لیتا محو پرواز رہا۔ سال ڈیڑھ سال بعد حلیمہ بی بی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شاہ کے پوتے کی پیدائش پر مردان شاہ اور حسنہ کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ دونوں میاں بیوی خوشی و مسرت سے پورے گھر میں کہرام مچائے دکھائی دیتے تھے۔ شرجیل کی پیدائش پر امتیاز خود بھی فخریہ نگاہوں سے حلیمہ کو دیکھ رہا تھا۔ اولاد نرینہ کی خوشی سے گھر کے طول و عرض جھکتے محسوس ہوتے تھے لیکن محض ایک دن میں شاہ گھرانے کی ان خوشیوں نے غم ناکی کا روپ دھار لیا۔ زچگی میں عوارض کے باعث حلیمہ کا انتقال ہوگیا۔ اپنے مالک و آقا پر اپنی ہست و بود کو تج دینے کا وعدہ کرنے والے مردان شاہ کے لیے سیدانی کی ناگہانی موت صدمے کی بات تھی۔ امتیاز نومولود شرجیل کو گود میں لیے ہوئے تھا۔ غم و رنج سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یہ بات مردان شاہ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ جان آفرینی سے چھوٹے شاہ کی جانب بڑھا اور ننھے شرجیل کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے خلوص و محبت سے بولا۔

''امتیاز شاہ، آپ بچے کی تنہائی کا زیادہ ملال نہ کریں۔ مجھے اس پر غیرت اور کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے کہ خادم ہونے کے باوجود مخدوم دکھ اور پچھتاوا محسوس کریں۔ شرجیل شاہ کی دیکھ بھال اور نگہداشت میرے اور حسنہ کے لیے سعادت مندی کا مقام ہے۔ آپ اس بچے کی پرورش کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ سیدزادے کی خدمت گاری مجھ پر اور میری نسل پر قرض ہے اور میرے لیے یہ عزت کی بات ہے کہ میں شاہ کریم سے کیے گئے عہد کو خوش اسلوبی سے پورا کروں۔'' مردان شاہ نے نومولود شرجیل کے ننھے منے ہاتھ کا عقیدت و محبت سے بوسہ لیا پھر اس نے قریب کھڑی حسنہ کی گود میں شرجیل کو دیا۔ ادھر امتیاز کریم اپنے باپ کے وفاشعار مرید کی تواضع و مروت سے مرعوب ہوگیا تھا اور بیوی کی اچانک موت پر اس کی دم سازی سے اس کے دل کا بوجھ اور تفکر ہلکا ہوگیا تھا۔ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد زندگی معمول کی ڈگر پر گزرنے لگی۔ امتیاز کریم نے اپنے مزاج اور خواہش کے مطابق خود کو کاروباری جھمیلوں میں مصروف کرلیا۔ وہ حسب ضرورت مردان شاہ کی موجودگی سے فائدہ بھی اٹھاتا اور عمر میں بڑا اور جہاں دیدہ ہونے کی بدولت اس سے مشکل معاملات میں مشورے بھی لیتا۔ ویسے مردان شاہ نے امتیاز کے گھر اور بچے کے آرام اور انتظام کو اپنی ذمہ داری بنالیا تھا۔ اس کی بیوی حسنہ اپنی خانگی خوبیوں اور سلیقہ مندی کے ساتھ اس کی ہمنوا اور بہترین معاون تھی۔ اللہ نے عجز و انکساری سے گندھے مردان شاہ اور حسنہ کو بھی اولاد نرینہ سے نوازا تھا۔ جس کا امتیاز کریم نے خرم شاہ نام رکھا تھا۔ یہ مردان شاہ کی نیاز مندانہ خواہش تھی کہ چھوٹے شاہ اس کے بچے کا نام رکھیں۔ وہ اور اس کی بیوی مخدوم کی اس عنایت پر خوشی سے نہال ہوگئے تھے۔ وقت کی چال سبک رو گھوڑے کی مانند رواں دواں تھی۔ اس کے بعد بیس

پچیس برس ترقی، خوشحالی اور پرآسائش زندگی کی تگ و دو میں اور سودے بازی اور سمجھوتوں کو نبھانے میں گزر گئے۔ امتیاز کریم نے چمڑے کے کاروبار میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کی تھی۔ اس نے درخشاں نامی ایک حسین و جمیل دوشیزہ سے شادی کی اور کچھ عرصے بعد اوسط درجے کے مکان سے ایک عالی شان کوٹھی میں شفٹ ہوگیا تھا۔ ترقی اور پرتعیش زندگی کی جانب امتیاز کی یہ پیش قدمی اس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ تاہم مردان شاہ کے لیے یہ انقلابی پیش رفت خلاف توقع اور حیران کن تھی۔ کچھ برس گزرے اور اس کی ترقی کا عقدہ جب مردان شاہ کے سامنے کھل کر آیا تو امتیاز کریم کی ناعاقبت اندیشی سے خود مردان شاہ شرمندگی سے محجوب ہوگیا۔ وہ اپنی حیثیت میں خادم اور غلام تھا۔ اختلاف اور اعتراض کرنے سے وہ شاہ کریم کے خاندان سے وابستہ اپنی نظریاتی عقیدت اور احسان فراموشی میں معتوب اور گناہگار ہوجاتا۔ لہٰذا وہ امتیاز شاہ کو ایک دوبار سمجھانے کے بعد خاموش اور افسردہ رہنے لگا۔ مردان شاہ اور حسنہ بھی امتیاز کریم کی ارادت مندی میں رہنے کی وجہ سے کوٹھی سے متصل اس رہائشی حصے میں منتقل ہوگئے تھے جو خادموں کے لیے مخصوص تھا۔ خرم شاہ کے بعد مردان شاہ کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا حسنہ نے خود سے عمرانہ نام رکھا تھا۔ خرم جواں سالی میں قدم رکھ رہا تھا جبکہ عمرانہ دس گیارہ برس کی تھی۔ امتیاز کریم نے اپنے چمڑے کے کاروبار کو پھیلا دیا تھا اور بیرون ملک ایکسپورٹ امپورٹ کرنے لگا تھا۔ اس کی دوسری بیوی درخشاں بیگم بھی اس کے ہمراہ کاروباری دوروں میں ساتھ رہتی تھی۔ ان مصروفیات کی وجہ سے کوٹھی کا نظم و نسق مردان شاہ کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ امتیاز نے اپنے باپ کے وفادار اور نمک خوار غلام کو روز اول سے ہی خادم خاص کا درجہ دیا تھا۔ اور اسے انتظامی اور خانگی امور کی دیکھ بھال کی غرض سے اختیارات کا حق دیا تھا۔ مردان شاہ کی سرکردگی میں ملازمین اپنے اپنے کاموں کو یوں خوش اسلوبی سے کرتے دکھائی دیتے تھے جیسے وہ مردان شاہ کے گھرانے کے افراد ہوں۔ اس کی درویشانہ طبیعت اور مربیانہ محبت و شفقت سے سبھی مرعوب ہوجاتے تھے۔ چند ایک ملازم اس سے متاثر ہوکر بہت گرویدہ ہوگئے تھے۔ وہ مردان شاہ کے اچھے اخلاق اور بلند کردار کی وجہ سے اس کا ادب و احترام کرتے تھے۔ مردان شاہ جو عجز و منکسر المزاجی کا پیکر دکھائی دیتا تھا، ہر طرح کے انتظامی اختیارات کے باوجود نوکروں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر اہمیت دیتا تھا اور بلاتفریق ان کے دکھ سکھ اور جنون کی پاسداری کرتا تھا۔ وہ اپنے آقا و مالک شاہ کریم کے رحم و کرم سے خوب بہرور تھا اور اپنے ارادت مندوں سے معاملات میں راہ سلوک کی اونچ نیچ جانتا تھا۔ امتیاز کریم جب درخشاں بیگم کے ساتھ بیرون ملک کے دورے پر ہوتا تو امتیاز ہاؤس کی عالیشان کوٹھی اپنی شان و شوکت کے باوجود ایسا امن و آشتی کا گہوارہ نظر آتی جیسا کہ قیمتی سنگ مرمر، منقش محرابیں اور ریشمی پردوں کی خوش نمائی اجاگر کرتے دریچے اور طرح دار موشگافیوں سے تعبیر کی گئی قدآور کوٹھی کی پرشکوہ عمارت نیک اور ذاتی حمیت سے پرورش پانے والے قناعت پسند اور خوددار انسانوں کا برزخ ہو۔ کوٹھی کے ملازمین کی تعداد درجن سے زائد تھی اور یہ سب کوٹھی سے متصل اس رہائشی پورشن میں بنے کوارٹرز میں رہتے تھے جو اگرچہ کوٹھی کے جھومر سے قدرے ہٹ کر اور نیچے اوسط انداز میں بنے ہوئے تھے۔ خادم خاص ہونے کی وجہ سے مردان شاہ اس وقت ان کے

لیے مثالی نمونہ ہوتا۔ وہ شاہ کریم کے پوتے شرجیل شاہ کو اپنے ہمراہ لیے ان کے درمیان وسیع وعریض لان میں موجود ہوتا۔ اور ملازمین کے گھریلو معاملات کی پوچھ تاچھ کرتا اور اپنے تئیں ان کی مشکلات کا...... حل بتاتا۔ ان ملازمین میں سے اکثر کا تعلق گاؤں اور نواحی قصبوں سے تھا۔ جو باری باری پانچ چھ مہینوں میں بیوی بچوں اور گھر والوں سے ملنے کی غرض سے چھٹی لے کر جاتے تھے اور وقت مقررہ پر ڈیوٹی پر پہنچ جاتے تھے۔ امتیاز کریم کا بڑا بیٹا شرجیل ویسے تو مزاج کے لحاظ سے باپ کا پرتو تھا' اعلیٰ حسب نسب اور دولت مندی کا غرور اس کے تیوروں سے جھلکتا تھا۔ تاہم مردان شاہ کی تربیت کی وجہ سے وہ نوکروں سے اچھے رویے سے پیش آتا تھا۔ شرجیل شاہ کی عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی اور وہ شہر کے اعلیٰ کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ مردان شاہ کے بیٹے خرم شاہ سے ڈیڑھ دو برس بڑا تھا۔ مخدوم اور سید ہونے کی تفریق کے باوجود وہ خرم شاہ سے برادرانہ ہنسی مذاق کرتا تھا اور اسے اپنے دیگر مشاغل میں بھی شامل رکھتا تھا۔ جبکہ پندرہ سولہ برس کا خرم جو ہائی اسکول کا لائق طالب علم تھا۔ اپنے بابا مردان شاہ کی تواضع وانکساری اور ارادت مندی کی عمدہ مثال بن جاتا تھا۔ یہ ان ہی دنوں کا واقعہ تھا کہ جب امتیاز اور درخشاں کاروباری وزٹ پر باہر گئے ہوئے تھے۔ امتیاز کے درخشاں سے دو بچے ہوئے تھے۔ جنہیں گورنس سنبھالتی تھی۔ اس کرسچین آیا کا نام مارگریٹ تھا۔ امتیاز کی ہدایت پر وہ چوبیس گھنٹے ان کی دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت کی نگرانی کرتی تھی۔ درخشاں بیگم سے بھی پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام عدنان شاہ رکھا گیا تھا۔ جبکہ امتیاز نے اکلوتی بیٹی کا نام مشعل رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ کوٹھی میں مارگریٹ کے لیے چند کمروں پر مشتمل ایک کشادہ پورشن مخصوص تھا جس میں وہ عدنان شاہ اور مشعل کے ساتھ رہائش پزیر تھی۔

امتیاز کریم کے یہ دونوں بچے شرجیل شاہ کے ناروا سلوک کی وجہ سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ اپنے بچوں کی وجہ سے درخشاں بیگم کا رویہ بھی شرجیل کے ساتھ اختلافی رہتا تھا۔ کوٹھی میں صرف مردان شاہ وہ چھتنار درخت تھا جہاں سوتیلے بہن بھائیوں کے گلے شکوے اور امتیاز و درخشاں بیگم کے اعتراضات اور طعنے اختلافات دور ہو جاتے تھے۔ ہر ایک کو اپنی شکایت کا جواب مل جاتا تھا۔ یوں کوٹھی میں مردان شاہ کی موجودگی دراصل امتیاز کریم کی کامیابیوں اور گھریلو امن وسکون کا محور تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مردان شاہ کی بے لوث خدمتوں اور احسانات کو قدرے جھک کر مان لیتا تھا۔

غرض اس دفعہ امتیاز کریم کے بیرون ملک جانے کے دو دن بعد مردان شاہ کی بیوی حسنہ موسمی بخار کی لپیٹ میں آ کر اسے داغ مفارقت دے گئی۔ خرم اور عمرانہ ماں کی ناگہانی موت کی وجہ سے روتے بلکتے رہ گئے۔ خادم خاص کی بیوی کے انتقال سے امتیاز کے بچے اور کوٹھی کے تمام خادم حزن وملال کی صورت دکھائی دے رہے تھے۔ مردان شاہ سے محبت اور قلبی وابستگی کی وجہ سے ان کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

اس کے بعد "امتیاز ہاؤس" کی رکھوالی کرتے ہوئے مردان شاہ کو چھ سات برس اور گزر گئے۔ اب اس کے بالوں میں سفید بال چاندی کی مانند چمکنے لگے تھے۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو رہی تھی۔ وہ جب نوجوان تھا اور شاہ کریم کے حلقہ ارادت میں خدمت گاری کرتا تھا تو ایک دن اس کے پیرومرشد نے اس کے پایہ استقلال اور ریاضت سے خوش ہو کر اسے اپنے قریب بلایا اور دست مبارک سے اس کی دستار بندی کی تھی۔ شاہ کریم نے اسے

چند تسبیحات تفویض کی تھیں اور گہرے سبز رنگ کا عمامہ اس کے سر پر باندھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ عمامہ اس کی شخصیت کا خاصہ بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ خشخشی بزرگانہ ریش نے کوٹھی کے تمام افراد کی نگاہوں میں مردان شاہ کو مربی وعالی مقام بنایا تھا۔ ایک عہد کو نبھانے اور اس کی پاسداری کے لیے شب وروز لمحہ بہ لمحہ اپنی خوشیوں' تمناؤں اور سکھ وآرام کو اس جذبے سے قربان کرنا کہ شاہ گھرانے کی عظمت وتقدس پر آنچ نہ آنے پائے' اس مسلک کو مردان شاہ نے بحسن وخوبی نبھایا تھا اور اب برسوں گزر جانے کے بعد خیر وبھلائی کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے نشان منزل بن گیا تھا۔

❁......❁......❁

گزرے مہ وسال میں کچھ اطمینان بخش تبدیلیاں بھی معرض وجود میں آئی تھیں۔ مردان شاہ نے اپنے دونوں بچوں کی شادی کے فرض کو ادا کیا تھا۔ اس کا ایک لائق معتمد جو کوٹھی میں باغبانی کے کام کے لیے مخصوص تین افراد میں سے ایک تھا اور اپنے کام میں مشاق' محنتی اور دیانت دار تھا۔ اس کا نام دانیال احمد تھا۔ مردان شاہ نے اپنی بیٹی عمرانہ کی شادی دانیال سے کردی تھی۔ شادی کے دو ہفتے کے بعد دانیال نے بصد اصرار مردان شاہ سے گاؤں جانے کی اجازت طلب کی اور نوکری ختم کر کے عمرانہ کو لے کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ غرض بیٹی کو داماد کے ساتھ رخصت کر کے مردان شاہ مطمئن ہو گیا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے خرم اور اس کی بہو زیب النساء کی خوشیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ادھر کوٹھی میں بھی یہ پیش رفت ہوئی تھی کہ امتیاز کریم نے شرجیل شاہ کی شادی اپنے جیسے دولت مند گھرانے میں کردی تھی۔ شرجیل شاہ کی بیوی کا نام سونیا تھا۔ بیٹے کی شادی پر درخشاں بیگم نے سوتیلی ماں ہونے کی وجہ سے اپنی ناپسندیدگی اور جلاپے کا اظہار کیا تھا لیکن امتیاز کے رعب ودبدبے کی وجہ سے وہ منافقانہ مسکراہٹ سے شرجیل اور سونیا سے اپنے ارمانوں کو جتاتی رہیں۔ بہرکیف کوٹھی میں بیٹے کی دلہن آ گئی تھی۔ اور اسی وجہ سے امتیاز کریم کی خوشی دیدنی تھی۔ اس وقت مردان شاہ کے پختہ کار چہرے پر سنجیدہ تبسم کے ساتھ غور وفکر جھلک رہا تھا۔ سونیا ایک اچھی' مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ شرجیل شاہ نے بھی اسے پسند کیا تھا مگر کسی فکر ناگفتنی سے مردان شاہ کے چہرے پر سرد مہری ہویدا تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ امتیاز نے اعلیٰ سوسائٹی میں اپنی حیثیت اور مرتبہ بننے کی ہوس میں جو ناجائز اور گمراہ کن ذرائع اختیار کیے تھے اور شاہ کریم کی تعلیم وتربیت سے یوں انحراف کیا تھا کہ نسلی خاندانی اور موروثی نیک نامی اپنی پہچان کھو بیٹھی تھی۔ محض شاہ کا لفظی سطحی اور بودا نام رہ گیا تھا۔ سونیا کی آمد کہیں امتیاز کریم کے گھناؤنے جنون کی وجہ سے اس کی جاہ پرستی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ اتنا سوچ کر مردان شاہ نے سامنے کھڑے امتیاز کریم کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا حرص وطمع سے سرخرو چہرہ بیٹے کی شادی کی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ مردان شاہ نے عجز وانکسار سے امتیاز کریم سے اجازت لی اور کوٹھی سے نکل کر اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔

شرجیل کی شادی کے موقع پر درخشاں بیگم کے دونوں بچے عدنان شاہ اور مشعل کوٹھی میں موجود نہ تھے۔ درخشاں بیگم نے دونوں بہن بھائی کو تعلیم کی غرض سے امریکہ بھیج دیا تھا۔ گزشتہ چار برسوں سے وہ دونوں باہر اعلیٰ تعلیمی یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ مردان شاہ خود بھی سوتیلے بہن بھائیوں کی چپقلش کے خیال سے عدنان شاہ اور مشعل سے ٹیلی فون پر

خیر و عافیت لے لیتا تھا۔ شرجیل شاہ کا رویہ مشعل کے ساتھ اگرچہ اچھا اور مصالحانہ تھا لیکن عدنان شاہ اس سے کھلم کھلا اختلاف کرتا تھا اور سوتیلے بھائی سے اپنی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کا مزاج شمال جنوب کی اختلافی سمتوں کی مانند تھا جو امتیاز کے لیے دردسر بنا رہتا تھا اور جسے محض مردان شاہ کی بزرگانہ اور ہمہ جہت ذات کے سوا کوئی دوسرا سلجھا نہیں پاتا تھا۔ شرجیل اور عدنان دونوں مردان شاہ کی قدامت اور مرتبے کا احترام کرتے تھے۔ اور اس کی مشاورت اور صلح جوئی کو اہمیت دیتے تھے۔ اب شرجیل کی شادی کو ایک برس ہو چلا تھا۔ سونیا نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا اور امتیاز کریم اور درخشاں بیگم کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دونوں کی ترغیب یہی تھی کہ شرجیل کو بچے کی خواہش سے بچنا چاہیے لیکن اللہ کی قدرت نے بچے کی پیدائش سے امتیاز کریم کی مطلق العنانی اور زر پرستی کے جنون کو دل آویز چرکا لگایا تھا۔

ادھر مردان شاہ نے اپنے آقا شاہ کریم کے پڑپوتے کو جوش مسرت سے گود میں اٹھالیا تھا اور عقیدت سے اس کے ننھے ہاتھوں کا بوسہ لیا تھا۔ پھر شرجیل شاہ اور سونیا کی خواہش پر اس نے سیدزادے کا نام عظام شاہ رکھا اور شرجیل اور سونیا کو اس سعادت پر مبارک باد دی۔ اس کے بعد وفور جذبات سے کانپتے ہاتھوں سے اس نے کاندھوں سے گرتی چادر کو سنبھالا۔ سر پر سبز عمامے کو درست کیا اور عظام شاہ کی ولادت کی خوشی میں صدقہ وخیرات کے ارادے سے اپنے ماتحت ملازموں کو آوازیں دیتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ خادم خاص کے لیے سادات کی خوشیوں اور ان کی جدی پشتی روایتی عقیدت مندی کو پورے جوش وخروش سے منانا ہی اپنے مسلک سے وفاداری اور خدمت گزاری کے جذبوں کا خراج تھا۔ مردان شاہ کی ہدایت پر فقرا و مساکین میں عظام شاہ کے نام پر صدقہ وخیرات اور لنگر تقسیم کیا گیا اور تین روز تک کوٹھی میں جشن منایا گیا۔

❁......❁......❁
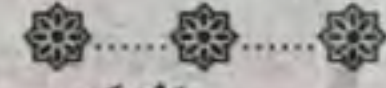
صبح کا سورج اپنی حرارت بخش کرنوں سے سرسبز لان کو تابندگی عطا کر رہا تھا۔ مردان شاہ نے کاندھے پر اپنی دستار کو پھیلا کر حلقوم کر رکھا تھا اور سبک روی سے چلتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ وہ لان میں گھاس کی کاٹ چھانٹ کرتے اسفندیار کے قریب آیا۔ مردان شاہ کو دیکھ کر اسفندیار کام چھوڑ کر سلام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سلام شاہ جی!" اسفندیار نے نیازمندی سے جھک کر مردان شاہ سے ہاتھ ملایا۔ وہ جوان عمر مالی وسیع وعریض لان کے سبزے میں کام کرنے والے دیگر باغبانوں کے مقابلے میں نوآموز تھا۔ اسے کوٹھی میں کام کرتے ہوئے محض چھ سات ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! سناؤ بھائی گاؤں کب جا رہے ہو؟ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی محبت تازہ ہو جائے تو انسان میں جان آجاتی ہے۔" مردان شاہ نے متانت آمیز لہجے میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس کے ہاتھ میں گلاب کی ایک سوکھی اور خشک ٹہنی تھی جس میں پیوست کانٹوں کو وہ بات کرتے ہوئے یوں کھرچ کر جدا کر رہا تھا گویا وہ اسے بید بنانا چاہتا ہو۔

"شاہ جی، نوکر کی ذات مالک کی تابعداری ہوتی ہے۔ امتیاز صاحب نے مجھ سے صرف ایک دو بار بات کی ہے۔ میری مشکلات کے بارے میں شاہ جی آپ ہی جانتے ہیں۔ آپ نے مجھے گاؤں جانے کی اجازت دی ہے۔ آپ کا احسان مند ہوں مگر شاہ جی!" اسفندیار نے ہاتھ باندھے ہوئے مودبانہ لہجے میں جواب دیا اور پھر کسی خیال کے تحت جھجکتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ مردان شاہ کانٹا کھرچتے ہوئے باغبان کے جوان چہرے پر فکر و تذبذب کی پرچھائیں دیکھ رہا تھا۔

"یار خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے تو کھل کر بتاؤ۔" مردان شاہ نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ دوسری جانب اسفندیار اس بات سے شش و پنج میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دل کی خواہش کو بیان کر دے یا ناراضی کے اندیشے سے نہ بتائے۔

"سنو بھائی، فکرمندی کو دل کا روگ بناؤ گے تو وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاؤ گے۔" مردان شاہ نے ناصحانہ لہجے میں کہتے ہوئے پرشفیق نگاہوں سے جوان باغبان کی جانب دیکھا۔ سوکھی ٹہنی کانٹوں کی زہرخندی سے صاف ہو چکی تھی۔ مردان شاہ نے چند ثانیے ہموار و لچکیلی ٹہنی کو بید کی مانند ہولے ہولے سے بائیں ہتھیلی پر مارا۔ جیسے خود کو باور کرا رہا ہو۔ ادھر نوآموز اسفندیار نے ہمتوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"وہ...... وہ شاہ جی، میں نے تنخواہ کے علاوہ کچھ پیشگی رقم کی درخواست کی تھی۔ اس لیے مزید ایک دو دن کے لیے رک گیا ہوں۔ آج پیشگی مل جاتی ہے تو کل صبح گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔" اس کا مدعا سن کر مردان شاہ خفگی آمیز محبت سے بولا۔

"تو یار ایسی بات مجھے پہلے بتانا چاہیے تھی۔ تم نرے احمق ہو اسفندیار۔"

"وہ شاہ جی، مجھ سے بھول ہو گئی۔ میں نے پیشگی کے لیے خرم شاہ سے کہا تھا۔" اسفندیار نے ہاتھ کے اشارے سے دور کوٹھی کے ستونوں کے قریب کھڑے خرم شاہ کی جانب توجہ دلاتے ہوئے بتایا۔ اس کی توجیہہ سے مردان شاہ اپنی جگہ چونک گیا۔ پھر اس نے پرسوچ نظروں سے رخ موڑ کر وسیع وعریض لان سے علیحدہ سنگی روش کے ستونوں کی جانب دیکھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا خرم پورچ سے باہر کھڑی ہائی لیکس مرسیڈیز کی دھلائی اور صفائی کے کام میں منہمک نظر آ رہا تھا۔

"ہاں بھائی تم نے سچ کہا ہے۔ خرم شاہ کی بے پروائی کی وجہ سے تمہیں پریشانی ہوئی ہے۔ مجھے اس بات پر افسوس ہے۔ میں اس سے بازپرس کروں گا لیکن آئندہ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے کہہ دیا کرو۔ خرم شاہ میرا بیٹا تو ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح کوٹھی کا ایک ملازم ہے۔ تنخواہ اور پیسوں کے معاملات سے اس بیچارے کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس سے پیشگی کا کہہ کر تم نے بھی بھول کی ہے۔" مردان شاہ نے انکساری اختیار کرتے ہوئے نرم لہجے میں نوآموز باغبان کو سمجھایا۔ اس کی اخلاقی جرأت سے اسفندیار متاثر ہو کر شرمندگی سے یوں سر کھجانے لگا جیسے وہ کوٹھی کے خادم خاص اور منتظم سے شکایت کر کے پچھتا رہا ہو۔

"تم دوپہر کے وقفے میں منشی سے پیشگی کی رقم لے لینا۔ میں اسے ہدایت کر دوں گا۔" مردان شاہ کی بات سن کر اسفندیار نے نیازمندی سے سر ہلایا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

صبح کے گیارہ بجے کا وقت ہو چلا تھا۔ ایلی ویشن کے ستونوں کے پاس پہنچ کر مردان شاہ نے اپنے بیٹے سے کچھ دیر بات چیت کی اور نوآموز باغبان کی شکایت پر اس سے پوچھ گچھ کی۔ خرم شاہ نے اپنی بھول کا اعتراف کرتے ہوئے باپ کے سامنے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔ مردان شاہ کو وہاں ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دفعتاً کوٹھی کی اندرونی کشادہ راہداری سے ایک خادم تیز تیز چلتا ہوا صدر دروازے سے باہر آیا۔ پھر کچھ فاصلے پر مردان شاہ کو کھڑا دیکھ کر

وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"شاہ جی! سائیں آپ کو بلا رہے ہیں۔" خادم نے قدرے سرعت سے امتیاز کریم کا پیغام مردان شاہ کے گوش گزار کیا۔

"خیریت تو ہے عبدالباسط! سائیں آج کیسے جلدی بیدار ہو گئے؟" مردان شاہ نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ خادم جسے اس نے عبدالباسط کے نام سے مخاطب کیا تھا' توضیحی لہجے میں جواب دیتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ بھول گئے شاہ جی؟ عدنان شاہ اور مشعل بی بی پانچ برس کے بعد آج پہلی فلائٹ سے امریکہ سے لوٹ رہے ہیں۔ اس لیے امتیاز صاحب اور بیگم صاحبہ انہیں ایئر پورٹ سے لانے کی غرض سے کچھ دیر میں بنگلے سے نکلنے والے ہیں۔"

"ارے ہاں یار! عدنان اور مشعل امریکہ سے آ رہے ہیں' میں تو واقعی بھول گیا تھا۔" مردان شاہ نے قدرے خجالت سے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں خشک اور ہموار ٹہنی موجود تھی۔

"پانچ برس ہو گئے دونوں بچوں کو دیکھے ہوئے' اب تعلیم مکمل کر کے آ رہے ہیں تو کیسے قابل اور لائق ہوں گے۔" اتنا کہہ کر مردان شاہ نے خشک ٹہنی تھرتھراتے ہوئے عبدالباسط کے ہاتھ میں تھمائی اور جذباتی ترنگ میں مچل کر بولا۔

"اب مزہ آئے گا یار! ہم دونوں بچوں کی آمد پر دل کے ارمانوں کو پورا کریں گے اور پورے جوش و خروش سے جشن منائیں گے۔"

"کیوں نہیں شاہ جی! یہ ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" عبدالباسط جو مردان شاہ کا دست راست اور کوٹھی کے انتظامی کاموں میں اس کا معاون تھا' نے مردان شاہ کا خوشی سے دمکتا چہرہ دیکھ کر تال سے تال ملائی۔ قریب موجود خرم بھی باپ کی رندانہ کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا پھر ہاتھوں سے لان کی مٹی کو جھاڑتے ہوئے مردان شاہ نے سفید چادر کے دامن سے چہرے کو صاف کیا اور کوٹھی کی اندرونی کشادہ راہداری کی جانب بڑھ گیا۔

❁ .... ❁ .... ❁
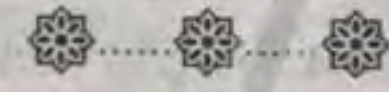
دن کا وقت تھا' مردان شاہ راہداری سے گزر کر جگمگاتے ہال کے احاطے میں داخل ہوا۔ سنہری کلس کے نیچے قدرے وسط میں موجود صوفوں پر امتیاز کریم اور درخشاں بیگم بات چیت میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ مردان شاہ کو آتا دیکھ کر درخشاں بیگم خاموش ہو گئی۔ وہ آج نیلے رنگ کی زرق برق ساڑھی میں تھیں اور اپنے بچوں کی آمد کی خوشی میں خصوصیت کے ساتھ تیار ہوئی تھیں۔ درخشاں بیگم عمر کے لحاظ سے امتیاز کریم سے چھ سات برس چھوٹی تھیں۔ وہ اگرچہ متوسط طبقے سے تعلق تھیں تاہم امتیاز کے کاروباری جنون نے اس کے طبقاتی فرق کو مٹا دیا تھا۔ دوسری جانب تھری پیس سوٹ میں ملبوس امتیاز کریم' مردان شاہ کو قریب آتا دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے مردان شاہ؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" امتیاز کریم نے قدرے جھلاتے ہوئے استفسار کیا۔

"سائیں' میں ادھر قریب ہی ہوا خوری کے لیے ٹہل رہا تھا۔ آپ کا پیغام ملتے ہی حاضر ہو گیا ہوں۔ فرمائیے کیا حکم ہے میرے لیے؟" مردان شاہ نے حسن تواضع سے قدرے جھک کر کہا۔

"عدنان اور مشعل آج امریکہ سے آ رہے ہیں۔ انہیں ایئر پورٹ پر ویلکم کہنے کی غرض سے کیا تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو؟"

"سائیں' دل کی بات تو یہ ہے کہ میں بچوں کو ویلکم کرنے کے لیے آپ کے ہمراہ چلوں۔ انہیں دیکھے پانچ برس ہو گئے ہیں۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ آپ اور بیگم صاحبہ بچوں کو ایئر پورٹ سے لے آئیے میں یہاں عدنان شاہ اور مشعل بی بی کی آمد کی خوشی میں ملازمین کے ساتھ ایک شاندار پارٹی کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔" مردان شاہ نے پرخلوص جذبوں سے درخواست کی۔

"بابا شاہ کریم کے وصال کو برسوں گزر گئے ہیں لیکن تمہاری نیاز مندی کے رنگ ڈھنگ نہیں بدلے۔ تم ان فضولیات سے نجانے کب نکلو گے مردان شاہ۔" امتیاز کریم نے پرمذاق لہجے میں مسکرا کر کہا۔ درخشاں بیگم جو سونے کے گلوبند کی نوک پلک سنوار رہی تھیں معاً چہک کر مردان شاہ سے بولیں۔

"یہ تم نے اچھا سوچا ہے مردان شاہ' عدنان اور مشعل کا استقبال شاہ گھرانے کے مقام اور مرتبے کے مطابق دھوم دھام سے ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں درخشاں بیگم! اس بات سے آپ بے فکر ہو جائیں۔" سیدانی کی حمایت پا کر مردان شاہ نے جوش و خروش سے اپنی خواہش کی توثیق کی۔

"بس کرو یار مردان شاہ ان باتوں کو چھوڑو اور گاڑیاں نکلواؤ۔" امتیاز کریم نے قدرے ناراضی سے کہا۔ جواباً مردان شاہ نے ہاتھ باندھے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"سائیں! پجارو اور ہائی لیکس دونوں الرٹ کھڑی ہیں۔"

"یہ عبدالباسط کہاں رہ گیا مردان شاہ۔"

"جی وہ خرم کے ساتھ باہر موجود ہے۔ آپ حکم کریں سائیں۔"

"ٹھیک ہے مردان شاہ' عبدالباسط کو پجارو میں ایئر پورٹ روانہ کر دو۔ گارڈ محمد حسین اور کفایت اللہ اس کے ہمراہ ہوں گے۔ ان کی موجودگی سے عدنان شاہ اور مشعل بی بی کو سہولت رہے گی۔" امتیاز کریم کی ہدایت پر مردان شاہ نے "بہت اچھا سائیں" کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں عبدالباسط ہال میں داخل ہوا تھا۔ امتیاز اور درخشاں بیگم نے اسے سرسری انداز میں دیکھا۔ پھر ان کے سامنے مردان شاہ نے چند لمحے عبدالباسط کو پجارو میں روانگی کی غرض سے ہدایات کی تھیں۔ اس کے بعد عبدالباسط دوبارہ باہر کی جانب پلٹ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں امتیاز کریم اور درخشاں بیگم بھی ایئر پرٹ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امتیاز کریم نکٹائی درست کرتے ہوئے مردان شاہ کے قریب آیا اور ایک چھوٹی سی چٹ مردان شاہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مردان شاہ' یہ میسج شرجیل کو پہنچا دینا' وہ اور صوفیا اوپر اپنے کمرے میں ابھی تک سو رہے ہیں شاید!" امتیاز کریم نے لمحہ بھر توقف کیا پھر ملوکیت کے غرور سے بارعب لہجے میں دوبارہ بولا۔

"تم دروازے پر دستک دینے کے بعد شرجیل کو یہ چٹ دیتے ہوئے بتانا کہ یہ آج کا پروگرام ہے۔ سمجھے مردان شاہ!" امتیاز کریم نے اپنی بات جتاتے ہوئے پرمعنی نظروں سے خادم خاص کے چہرے کو دیکھا۔

"سائیں امتیاز' میں سمجھ گیا ہوں' آپ فکر نہ کریں۔" مردان شاہ نے تحریر شدہ پرچا لیتے ہوئے امتیاز کریم کو مطمئن کرتے ہوئے جواب دیا۔ اگلے لمحے وہ شرجیل شاہ کو جگانے اور امتیاز کریم کا پیغام پہنچانے کی غرض سے زینے چڑھنے لگا۔

مردان شاہ نے دائیں کوریڈور کی جانب چلتے ہوئے اس کاغذی چٹ پر نظر ڈالی اور اس پر لکھا ہوا امتیاز کریم کا میسج پڑھا۔ چٹ پر تحریر تھا "بیٹا شرجیل! یزدانی انڈسٹری کے ڈائریکٹر سے چار بجے سونیا کی

میٹنگ کا وقت طے ہوا ہے۔ تم سونیا کو لے کر وقت مقررہ پر پہنچ جانا۔ رقم کی ڈلیوری ڈائریکٹر بعد میں کرے گا۔" اس پیغام کو مردان شاہ نے دوبارہ پڑھا تو سونیا کے تذکرے پر اسے ناگواری کا احساس ہوا۔ دراصل اس نے کبھی امتیاز کریم کے کاروباری لین دین کے معاملات میں تجسس نہیں کیا تھا اور نا ہی اس کی میٹنگوں کے بارے میں دلچسپی لی تھی۔ الغرض وہ اس تحریر پر الجھن آمیز سوچوں سے چلتا ہوا شرجیل کے بیڈروم کے قریب آیا۔ قدرے کھلا دروازہ مردان شاہ کو بتا چکا تھا کہ شرجیل اور سونیا جاگ گئے ہیں۔ اس کے کانوں سے سونیا کے نومولود بچے کی قلقاریوں کی آواز بھی ٹکرا رہی تھی۔ عظام شاہ ڈیڑھ دو برس کا ہو گیا تھا۔ مردان شاہ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر دروازے پر دھیمی دستک دی۔

"سائیں شرجیل اٹھ گئے آپ!" مردان شاہ نے کھنکھارتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔ شرجیل شاہ اور سونیا جو کسی بات پر بحث و تکرار کر رہے تھے اس کی آواز پر چونکتے ہوئے خاموش ہو گئے پھر چند لمحے توقف سے شرجیل شاہ کا نرم لہجہ مردان شاہ کی سماعت سے ٹکرایا۔

"اندر آ جاؤ مردان شاہ۔" مردان شاہ اس کا جواب پا کر بیڈروم میں داخل ہوا۔ اس کے سامنے شرجیل شاہ سلیپنگ سوٹ میں صوفے پر بیٹھا اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا جبکہ سونیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر جہازی بیڈ کے اس طرف رکھے آرام دہ پنگوڑے میں ننھا عظام شاہ چہک رہا تھا۔ مردان شاہ میانہ روی سے چلتے ہوئے صوفے کے نزدیک پہنچا اور خاکسارانہ لہجے میں شرجیل شاہ سے بولا۔

"سلام شرجیل بابا!" اس کا سلام سن کر شرجیل شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بڑے سائیں نے یہ پیغام آپ کے لیے دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آج کا پروگرام ہے۔" مردان شاہ نے تحریر شدہ چٹ شرجیل کی جانب بڑھاتے ہوئے حسب عادت عاجزی سے کہا۔ جواباً شرجیل شاہ نے باپ کی بھیجی ہوئی چٹ پر ایک نگاہ ڈالی اور تفہیمی انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے مردان شاہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اب تم جاؤ اور ہمارے لیے خادم سے کہہ کر ناشتا لگوا دو۔" اس کا حکم سن کر مردان شاہ نے منکسرانہ لہجے میں "جی اچھا سائیں" کہتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ پھر بیڈروم سے نکلتے ہوئے مردان شاہ نے پنگوڑے میں کھیلتے ہوئے عظام شاہ کے ننھے منے ہاتھوں کو محبت وعقیدت سے چوما۔ اس کے نرم بالوں میں پیار ومحبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے چند جملے نیاز مندانہ لہجے میں ادا کیے۔ سونیا بی بی کو جھک کر سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ دفعتاً کسی خیال سے وہ چونک کر رک گیا۔ ننھے عظام شاہ کا معصومیت سے چھلکتا چہرہ اس کی نگاہوں میں آ گیا۔ شرجیل شاہ اور سونیا کی غیر موجودگی میں مردان شاہ ہی سیدزادے کو کھلاتا تھا اور لاڈ پیار سے اس کے ناز نخرے اٹھاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ شرجیل شاہ اور سونیا جب تیار ہو کر ناشتے کی غرض سے نیچے آئیں وہ سیدزادے کو کچھ دیر لاڈ پیار کے لیے کمرے سے لے جا سکتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا مردان شاہ دوبارہ بیڈروم کی جانب پلٹا اور محبت وشفقت سے عظام شاہ کے بارے میں خیال آرائی کرتے ہوئے دروازے کے قریب آیا۔ اسو قت یکا یک سونیا بی بی کی غصے سے برہم ہوتی تیز آواز مردان شاہ کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس بوڑھے یزدانی سے میٹنگ کے لیے تم نے

کیوں ہاں کر دی شرجیل؟ اس شیطان نے مجھے پچھلی بار بکاؤ مال اور فاحشہ کا طعنہ دیا تھا اور میرے جسم کو نوچ نوچ کر بخیے کرتا رہا تھا آج میں دوبارہ اس ابلیس سے میٹنگ کروں۔ ناٹ اینڈ نیور شرجیل! تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔ سنا تم نے!" سونیا بی بی کے الفاظ مردان شاہ کی سماعتوں میں دھماکہ کر رہے تھے۔ لمحوں میں اس کا دل وذہن چھلنی ہو گئے۔ یہ امتیاز کریم کے گھناؤنے کاروباری دوروں کا شاخسانہ تھا یا اعلیٰ سوسائٹی میں اونچا مقام حاصل کرنے کا گمراہ کن طرز فکر جس نے اس کے پیرومرشد شاہ کریم کے آبائی خاندان کی نسل پاکیزگی، تقدس اور معصومیت کو داغ دار کر دیا تھا۔ شاہ گھرانے کی غیرت، شرم وحیا، اور بلند مرتبے کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ شاہ کریم مرحوم کی بہو کی زبان سے میٹنگ کا مفہوم جان کر دروازے کے قریب کھڑا مردان شاہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

"شور نہ مچاؤ اور غور سے میری بات سنو۔" جواب میں شرجیل شاہ کی معاندانہ آواز گونجی۔ "میں نے ڈائریکٹر سے بات کی ہے وہ اب تمہارے ساتھ زیادہ بے ہودگی نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنی خواہش پوری کرے گا اور بس!" شرجیل سائیں کی عیارانہ تسلی سن کر باہر کھڑے مردان شاہ کا چہرہ جوش غیرت سے متغیر ہو گیا۔ کراہیت آمیز سوچوں سے اس کا دراوزے کے پاس کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ کندھے پر موجود سفید دستار اس کی قامت سے پھسل کر نیچے گرنے لگی تھی۔ اس نے دیوار کا سہارا لیتے اور اپنی ہمتوں کو مجتمع کرتے ہوئے گرتی چادر کو ہاتھ بڑھا کر سنبھالا۔ اس لمحے سونیا بی بی کی احتجاج کرتی آواز مردان شاہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ اپنی بے عزتی کی بھڑاس نکالتے ہوئے اس نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں! میں نے کہا ہے نا، میں اس عیاش ڈائریکٹر سے نہیں ملوں گی، شیطان قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے مگر......" اس کے شرم انگیز جملوں سے مردان شاہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

"اب زیادہ نخرے مت کرو، چار بجے میٹنگ کا وقت طے ہے۔ اس لیے ذہنی طور پر خود کو اس میٹنگ کے لیے تیار رکھو۔"

"تم یزدانی سے زیادہ خبیث اور کمینے ہو۔ اپنی بات منوانے کے لیے تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ایک بچے کی ماں بھی ہوں۔ مجھ پر نہیں تو اس بچے پر رحم کرو خدا کے لیے۔" شرجیل کے رعب ودبدبے سے سونیا بے بس ہو گئی تھی۔ اس نے آخرکار التجائیہ لہجے میں شوہر سے کہا تھا۔ دونوں کی تیز بحث وتکرار سے عظام شاہ ڈر گیا تھا۔ مردان شاہ کی زخمی سماعتوں میں اس کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ سیدزادے کے رونے کی آواز سن کر تڑپ گیا۔ بیوی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے شرجیل شاہ سرد مہری سے بولا۔ "تمہاری باتوں سے میں ایموشنل نہیں ہو سکتا۔ یزدانی سے میٹنگ کروڑوں کا معاملہ ہے۔ بابا سائیں نے اسی لیے اسے خوش کرنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ بات تمہیں یاد رکھنا ہے سونیا۔" شرجیل کے جملوں کی بازگشت سے مردان شاہ کے دل وذہن میں امتیاز کریم کے لیے نفرت اور حقارت کے جذبات اٹھ رہے تھے۔ یہ محض اس کی بے غیرتی اور مجرمانہ روش تھی کہ اس نے دولت مندی کے جنون میں شاہ کریم کے اعلیٰ حسب نسب کی بھی پروا نہیں کی تھی اور باصفا اور نیک طینت خاندان کی عزت وناموس کو اپنے شیطانی کاروبار کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ بیڈروم سے مسلسل عظام شاہ کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مردان شاہ نے اپنے دل فگار جذبوں پر بمشکل ضبط کیا ہوا تھا۔ اب اس میں اتنی

سکت نہیں تھی کہ وہ دروازے پر دستک دے اور اندر جا کر روتے ہوئے سیدزادے کو لائے۔ کمرے میں چند لمحے سناٹا چھایا رہا پھر شرجیل شاہ نے قضیہ نمٹاتے ہوئے معمول کے لہجے میں کہا۔

"اب تم بچے کو سنبھالو یہ کھیلتے کھیلتے کیوں رونے لگا ہے۔ مجھے تیار ہونا ہے اس لیے واش روم میں جا رہا ہوں' او کے سونیا۔" اتنا کہہ کر شرجیل شاہ نہانے کی غرض سے واش روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سونیا' عظام شاہ کو گود میں لے کر چپ کرانے لگی تھی۔ کمرے سے باہر کھڑے مردان شاہ کے چہرے پر کم ہمتی اور ناتوانی کے تاثرات تھے یوں جیسے اس کے جسم کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ امتیاز کریم کے کاروبار کی ساری حقیقت وہ جان گیا تھا۔ برسوں پہلے وہ شاہ کریم کے پاس سہارا اور پناہ لینے کی غرض سے آیا تھا اور ان کی نیک صفات اور التفات سے متاثر ہو کر ان کا مرید اور غلام ہو گیا تھا لیکن آج امتیاز کریم کی غلیظ سوچ اور مجرمانہ کاروبار کا عقدہ کھلنے سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

پھر سارا دن کیونکر گزرا...... مردان شاہ کو اس بات کا ہوش نہیں تھا۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ عدنان شاہ اور مشعل ایئر پورٹ سے امتیاز ہاؤس کی عالیشان کوٹھی میں داخل ہوئے تو تمام خادموں اور ملازموں نے دھوم دھام سے ان دونوں کا استقبال کیا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں جشن کی غرض سے برقی قمقموں سے چراغاں کیا گیا تھا اور کچھ دیر کچہری کے لیے نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ محض پرخلوص خادموں کی جانب سے عقیدت کا اظہار تھا جو مردان شاہ کی معیت اور رہنمائی میں شاہ کریم کے پوتے اور پوتی کی پانچ سال بعد کوٹھی آمد پر جوش و خروش سے دیوانوں کی مانند یہاں سے وہاں لپکتے دوڑتے تھے اور وفور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کچہری اور کھانے کے بعد خادموں نے ڈھول شہنائی کا بھی انتظام کیا تھا۔ اس سارے شور شرابے کے دوران مردان شاہ کی قلبی کیفیت پر افسردگی اور خاموشی چھائی نظر آتی تھی۔ امتیاز کریم کے کاروبار کی اصلیت جاننے کے بعد اس کے دل و ذہن پر جو تازیانہ لگا تھا' اس نے خادم خاص کو دل گرفتہ اور صدمہ سے دوچار کیا تھا۔ وہ اگرچہ بے حس اور لب بستہ دکھائی دیتا تھا لیکن گہرے قلق اور رقت انگیزی کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھلک جاتی تھیں۔ برسوں کی بے لوث خدمت اور عقیدت مندی پر اس نے جو ٹھوکر کھائی تھی' اس نے شاہ گھرانے سے وابستہ نظریاتی حقیقت کو مسخ کر دیا تھا۔ پرستش کا بلند و بالا مینار ڈھے گیا تھا۔ اس پر مستزاد وہ جشن منانے والے خادموں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ جس وقت ڈھول کی تھاپ پر خادموں کی ٹولیاں دائرے کی شکل میں لہک لہک کر ناچ رہی تھیں' خوشی و مسرت کے گیت گا رہی تھیں' وہ اندرونی دکھ سے مبہوت ہو کر یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہو۔ کوئی بھی اس کی قلبی کیفیت کو نہیں جانتا تھا سوائے خود مردان شاہ کے! دراصل حالت جذب کی اس کیفیت میں اس کا دل رو رہا تھا۔ سب کی نظروں سے محجوب اور باطنی پہنائیوں میں چھپا زخمی دل! شہنائی کی سریلی آواز عجز و انکسار کی تصویر اور بردباری کے پیکر سے دل گداز سروں میں بے وقت کے حزن و ملال کا سبب جیسے دریافت کر رہی تھی مگر مردان شاہ مست و سرشاری کے کسی بھی جذبے سے متاثر ہوئے بغیر خاموش بت کی مانند ساکت و جامد تھا۔ درون میں کہیں گریہ زاری کرتے اس کے دل سے یہ شعر دردبھری سماعتوں میں گونج رہا تھا۔

بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا
کوئی بے تاب تہہ خاک تڑپتا ہوگا

❁......❁......❁

اس نے امتیاز کریم کو سمجھانے کے بجائے چپ سادھ لی تھی لیکن قدرت نے شاہ کریم اور اس کی اولاد سے مردان شاہ کی ارادت مندی کی مزید آزمائش لینی تھی۔ اس کی ہمتوں کا سوا امتحان ابھی باقی تھا۔ مردان شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امتیاز کریم اپنی حرص و طمع کی خواہش میں برائی کی ان انتہاؤں کو چھو رہا تھا جنہیں کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور جاننے کے بعد مردان شاہ شرم و غیرت سے پانی پانی ہو گیا۔ محبتوں' عقیدتوں اور عبادتوں کا وہ دیوتا جس کا نام گرامی شاہ امتیاز کریم تھا' آن واحد اس کی نظروں کے سامنے گر کے پاش پاش ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ مردان شاہ کے ساتھ کچھ یوں پیش آیا کہ ایک روز شام میں امتیاز کریم کی دعوت پر چند مہمان کوٹھی آئے۔ کوٹھی کا منتظم انہیں لے کر وسیع ہال میں داخل ہوا۔ جہاں امتیاز کریم نے پرجوش انداز میں ان خاص مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پورے تزک و احتشام سے معانقہ و مصافحہ کیا۔ اس وقت وسطی فانوس کے نیچے کوٹھی کے سبھی مکین موجود تھے۔ شرجیل شاہ اور سونیا بی بی رشک بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ درخشاں بیگم کی ہمراہی میں عدنان شاہ اور مشعل کے چہرے خوشی و مسرت سے تمتما رہے تھے۔ دراصل امتیاز کریم نے اپنے دیرینہ دوست اور مشہور بزنس مین ضیاالدین کاکڑ اور اس کی فیملی کو عدنان شاہ اور مشعل کی رسم نسبت کے مقصد سے آج کوٹھی میں انوائٹ کیا تھا۔ کاکڑ صاحب اور ان کی بیگم کے ہمراہ ایک بیٹی نیلوفر اور بیٹا بختیار موجود تھے۔ وہ پسندیدگی کی نظروں سے اپنے مطمح نظر کو دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ ملاتے ہوئے عدنان شاہ نے نظر بچا کر نیلوفر کو آنکھ دبا کے اس کے خوب صورت اور حسین پیکر کی داد دی تھی۔ جس سے نیلوفر کے سیبوں جیسے گالوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔ ادھر مشعل جو فیروزی رنگ کی جھلملاتی میکسی میں شہزادی کی مانند بہت باوقار اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ بختیار اس کے پرتمکنت حسن و جمال سے مسحور ہو کر آگے بڑھا تھا تاہم وہ مشعل کے گداز ہاتھ کو چھوتے ہوئے ذرا لڑکھڑایا تھا۔ کارپٹ اس کے پاؤں سے الجھ گیا تھا۔ اس کی خجالت سے امتیاز اور کاکڑ صاحب سمیت سبھی لوگ ہنس پڑے تھے جبکہ مشعل شرم و حیا سے اپنی جگہ جھینپ گئی تھی اور بختیار کے شوق عالم کو یوں حیرت و تاسف سے دیکھنے لگی جیسے اسے بختیار سے ایسی حماقت کی امید نہیں تھی۔ اپنے بچوں کے محبت خیز جذبوں سے چمکتے دمکتے چہروں کو دیکھتے ہوئے درخشاں بیگم اور کاکڑ صاحب کی بیوی ناہید بیگم ایک دوسرے کو ذومعنی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد سب افراد اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ صوفوں سے کچھ فاصلے پر مردان شاہ ہاتھ باندھے عاجزی و انکساری سے کھڑا تھا۔ اس کی تقلید میں نائب عبدالباسط اور ڈائننگ ہال کا سپروائزر نذر محمد امتیاز کریم کے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ امتیاز کریم اور ضیاء الدین کاکڑ پندرہ بیس منٹ تک اپنے بچوں کے رشتے طے کرنے کی غرض سے گفت و شنید کرتے رہے۔ یہ وٹے سٹے کی رشتے داری تھی۔ دونوں ہائی کلاس کے کاروباری اور معقول گھرانے تھے۔ انہوں نے حق ملکیت کے اصول کے تحت بیٹے کے بدلے بیٹی کا رشتہ منظور کیا تھا۔ بات چیت مکمل ہونے کے بعد ہال میں موجود تمام افراد کے چہروں پر خوشی و مسرت کے جذبات تمتمانے لگے۔ دراصل امریکہ سے آنے کے بعد عدنان شاہ اور مشعل پہلی بار نیلوفر اور بختیار سے ملے تھے۔ امتیاز کریم نے ان کی نسبت طے کرنے کی

غرض سے محض زبانی بات چیت کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ بچوں میں پہلے چند روز کے دوران انڈراسٹینڈنگ ہو جائے۔ عدنان شاہ اپنی ہونے والی شریک حیات نیلوفر کو اور بختیار کاکڑ خوب صورت اور پیاری سی شہزادی مشعل کے مزاج سے آشنا ہو جائیں تو زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔ عرصہ دراز سے وہ کاکڑ صاحب سے کاروباری میٹنگ کرتا آیا تھا۔ اس لیے اسے کاکڑ صاحب پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ بعد میں کوئی بڑی ڈیمانڈ یا تعرض نہیں کریں گے۔ امتیاز کریم نے اسی پلاننگ کے تحت رسم منگنی کی تقریب کاکڑ صاحب سے کہہ کر ایک ہفتے بعد رکھی تھی تاکہ عدنان شاہ اور مشعل اس رشتے داری کے لیے ایڈجسٹ منٹ کرلیں۔ جگمگاتے ہال کے خوشگوار ماحول میں جب سونیا کی گود میں عظام شاہ کھیلتے کھیلتے رونے لگا تو مردان شاہ کے اشارے پر عبدالباسط تیزی سے اس طرف لپکا اور سونیا سے عظام شاہ کو اپنی گود میں لے لیا۔ مبادا امتیاز کریم کو مہمانوں کی موجودگی میں خفت محسوس نہ ہو۔ عبدالباسط خادم خاص کی ہدایت پر بچے کو بہلاتے ہوئے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے امتیاز کریم پروقار لہجے میں قریب کھڑے مردان شاہ سے بولا۔

"سناؤ مردان شاہ اس بات چیت کی خوشی میں کاکڑ صاحب کی خاطر داری کا کیا اہتمام کیا ہے؟ یا انہیں کچھ انتظار کرواؤ گے۔" جواباً مردان شاہ نے ہاتھ باندھ کر جھک کر کہا۔

"سائیں آپ کے حکم کے مطابق کاکڑ صاحب کی خاطر مدارات کی غرض سے ایسا اعلیٰ اور عمدہ انتظام کیا گیا ہے کاکڑ صاحب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ کھانا لگا دیا گیا ہے۔" مردان شاہ کے برملا جواب پر امتیاز کریم نے تفخر آمیز مسکراہٹ سے ضیاء الدین کاکڑ کی جانب دیکھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد سب افراد دوبارہ جگمگاتے ہال میں لوٹ آئے۔ شرجیل شاہ اور سونیا آرام کی غرض سے اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امتیاز کریم اور کاکڑ صاحب سے کچھ فاصلے پر درخشاں بیگم اور ناہید بیگم کی چونچلے بازی پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ وہ پہناوے اور دکھاوے کی طرح داریوں سے بات بے بات بڑھکیں مارتیں اور جانوروں کی مانند منہ کھول کر ہنسنے لگتیں۔ ان بیگمات کی گپ بازی کے دوران عدنان شاہ نے امتیاز کریم سے آؤٹنگ کی غرض سے اجازت طلب کی اور نیلوفر کا ہاتھ تھامتے ہوئے باہر نکل گیا۔ حسب عادت مردان شاہ امتیاز کریم کے صوفے کے بائیں جانب انکساری سے ہاتھ باندھے حکم حاکم بجالانے کی غرض سے کھڑا تھا۔ بیگمات کی پرتعیش اور بے باکانہ گپ بازیوں سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ تاہم وہ طبیعت پر جبر کیے خاموش کھڑا تھا۔ یہ عالیشان کوٹھی کے ماڈرن اور طاغوتی روشنیوں سے جگمگاتے ماحول کا حصہ تھا کہ لڑکا اور لڑکی کھلی آزادی اور بے باکی سے اپنی من چاہی زندگی گزاریں۔ عیش و سرود کی ہوس میں بلا روک ٹوک اپنی من مانیاں کریں۔ مردان شاہ کی نظروں کے سامنے عدنان شاہ بلاؤز اور اسکرٹ پہنے نیلوفر کو اپنی باہوں میں لیے باہر نکل گیا تھا۔

ابھی اس بات کو دس منٹ گزرے تھے کہ درخشاں بیگم نے مشعل اور بختیار کی بے چینی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر ہاتھ کے اشارے سے امتیاز کریم کو دونوں کی بے تابی کی جانب توجہ دلائی۔ ادھر امتیاز کریم کو دو دھڑکتے دلوں کی بے قراری کا شاید پہلے سے ہی احساس تھا اس نے سر اٹھا کر پروقار لہجے میں قریب کھڑے مردان شاہ سے کہا۔

"سنو مردان شاہ تم سے ایک خدمت کی ضرورت

حاسد کا انجام

جناب بکر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص ایک بادشاہ کا مقرب تھا۔ وہ روزانہ بادشاہ کے روبرو کھڑا ہو کر بطورِ نصیحت کہا کرتا تھا کہ احسان کرنے والے کے احسان کا بدلہ دو۔ برے شخص سے برائی سے پیش نہ آؤ۔ بدخو شخص کے لیے اس کی خوئے بد ہی کافی ہے۔ بادشاہ اس مقرب کی ان نصائح کے باعث اس کو بہت دوست رکھتا تھا۔ ایک شخص نے اس مقرب پر حسد کیا اور بادشاہ سے کہا۔ "یہ شخص آپ کے بارے میں کہتا ہے کہ بادشاہ گندہ دہن ہے۔" بادشاہ نے کہا۔ "اس بات کی کیا دلیل ہے؟" حاسد نے کہا۔ "آپ اپنے قریب اسے بلائیے اور دیکھیے کہ وہ اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لے گا تاکہ بو سے محفوظ رہے۔" ادھر یہ حاسد مقرب کو اپنے گھر لے گیا اور خوب لہسن والا کھانا کھلایا۔ بادشاہ نے جب اس مقرب کو اپنے قریب بلایا تو اس نے اس خیال سے کہ بادشاہ کی لہسن کو بو نہ پہنچے۔ اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ بادشاہ نے یقین کرلیا کہ وہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ اپنے قلم سے خلعت یا انعام کا حکم لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی حکم خود نہیں لکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے عامل کو لکھا۔ اس خط لانے والے کی فوراً گردن اڑادو اور اس کی کھال میں بھس بھر کر ہمارے پاس روانہ کردو۔ مقرب جب یہ فرمان لے کر باہر نکلا تو حاسد نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "خلعت کا حکم نامہ ہے۔" حاسد نے کہا۔ "مجھے دو۔" مقرب نے شاہی فرمان اس کو دے دیا۔ حاسد یہ فرمان لے کر عامل کے پاس گیا اور خلعت طلب کی۔ عامل نے کہا۔ "فرمان میں لکھا ہے کہ تجھے قتل کر کے تیری کھال میں بھس بھروادوں۔"

حاسد نے کہا۔ "یہ خط تو دوسرے شخص کے لیے لکھا گیا تھا۔ تم بادشاہ سے معلوم کرلو۔" عامل نے کہا۔ "بادشاہ کے حکم میں چوں وچرا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے حاسد کو قتل کر دیا۔ دوسرے دن مقرب بادشاہ کے حضور میں گیا اور حسب معمول نصائح بیان کیں۔ بادشاہ بہت متعجب ہوا اور پوچھا "میرے فرمان کا تو نے کیا کیا؟" مقرب نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے فلاں شخص (حاسد) نے لے لیا۔" بادشاہ نے پوچھا "پھر تو نے میرے قریب آکر اپنا ہاتھ منہ پر کیوں رکھا تھا؟" مقرب نے کہا۔ "اس شخص نے مجھے کھانے میں لہسن کھلایا تھا۔ میں نے یہ پسند نہیں کی کہ اس کی بو آپ تک پہنچے۔" بادشاہ نے کہا "تم ہر روز نصائح میں یہ بات بھی کہا کرو کہ انسان کی خرابی کے لیے اس کا برا ہونا کافی ہے جیسا کہ اس حاسد کا حال ہوا۔"

محمد ندیم......کورنگی کراچی

پیش آ گئی ہے۔"

"حکم کیجیے سائیں امتیاز۔" جواباً مردان شاہ نے قدرے چونک کر عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"یار بات یہ ہے کہ بختیار ہماری مشعل بی بی کے ساتھ باہر تفریح کی غرض سے جانا چاہتا ہے مگر ہماری مشعل بی بی موصوف کے ساتھ جانے سے پتا نہیں کیوں جھجک رہی ہیں۔ امریکی ماحول میں رہنے کے باوجود اس کے دل سے ڈر نہیں نکلا۔"

"جی سائیں، آپ نے درست فرمایا ہے۔" مردان شاہ نے لجاجت سے حسن وفاداری سے کہا۔

"تو مردان شاہ ایسا کرو کہ تم ان دونوں بچوں کے ہمراہ چلے جاؤ۔ تمہاری موجودگی سے مشعل بی بی کا حوصلہ رہے گا۔ محض ایک دو گھنٹے یہ دونوں تفریح کر کے لوٹ آئیں گے۔ سمجھے! سائیں۔" امتیاز کریم

نے مصلحت آمیزی سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"جو حکم سائیں کا!" خادم خاص نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس دوران بختیار پرشوق جذبوں سے مشعل کا گورا اور گداز ہاتھ تھامتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا مردان شاہ نے بزرگانہ حلاوت اور متانت سے دونوں کے دمکتے چہروں کو دیکھا۔ امتیاز کریم کی منظوری پاکر بختیار نے مسکراتے ہوئے امتیاز کریم سے "تھینک یو انکل" کہا اور مشعل کو لیتے ہوئے صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر مردان شاہ نے بھی امتیاز سے سلام کیا اور کوٹھی کے ہونے والے داماد بختیار کاکڑ کے پیچھے میانہ روی سے قدم اٹھاتے ہوئے چل پڑا۔

❀......❀......❀
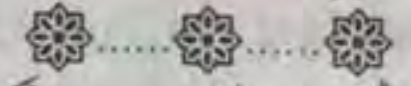
مردان شاہ کو کوٹھی سے نکلے خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وہ اندازاً سات بجے مشعل اور بختیار کے ساتھ کار میں بیٹھا ان کی دلجوئی اور سیر و تفریح کی غرض سے روانہ ہوا تھا۔ اس وقت رات گہری ہونے کے ساتھ مردان شاہ کے صبر و برداشت کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ ایک چھوٹے اور خوب صورت لاؤنج میں بیٹھا مشعل کا کمرے سے واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ فکرمندی سے اس کی نگاہیں بار بار دیوار پر لگے وال کلاک کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ دراصل مردان شاہ کو بختیار کا مشعل بی بی کے ساتھ حد سے بڑھی بے تکلفی اور بے باکی سے ہنسی مذاق کرنا خاصا ناگوار محسوس ہوا تھا۔ گاڑی میں اس کی موجودگی کے باوجود بختیار کی حرکتوں سے وہ شرم و غیرت سے گڑ گیا تھا۔ مزید بختیار کی تیز ڈرائیونگ سے مشعل بی بی جذباتی ہلچل سے واشگاف انداز میں قہقہے مارنے لگتی لیکن مردان شاہ گاڑی کے تیز جھٹکوں سے بار بار اپنے سر کے سبز عمامے کو گرنے سے سنبھالتا۔ اندازاً ڈیڑھ دو گھنٹوں تک بختیار ڈرائیونگ کرتے ہوئے بیہودہ طریقوں سے یوں ٹریک بدلتا رہا گویا وہ ڈگڈگی پر بندریا کو نچا رہا ہو۔ مردان شاہ جس کے خمیر میں وفاشعاری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بختیار کی اس دھینگا مشتی پر صبر اور خندہ پیشانی سے کام لیتے ہوئے خاموش رہا۔ دوسری جانب بختیار نے مشعل بی بی سے محبت بھری باتیں کرتے ہوئے کار کا رخ موڑا تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل خوب صورت اپارٹمنٹ تھا جسے بختیار نجی کاموں اور عارضی رہائش کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ مردان شاہ انیکسی کے لاؤنج میں بیٹھا بختیار کے غیر سنجیدہ اور بے ہودہ رویوں کے بارے میں سوچ سوچ کر مضطرب اور پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اسے انتظار کرتے ہوئے کافی سارا وقت گزر گیا تھا۔ بختیار اس کی نظروں کے سامنے مشعل بی بی کو لے کر کمرے میں گیا تھا۔ اس کے بعد گویا دونوں مردان شاہ کو بھول بیٹھے تھے یوں جیسے وہ بے وقعت اور فضول شے ہو۔ ادھر انتظار کی صلیب پر اس کی حالت دگرگوں ہوتی جارہی تھی وہ محض امتیاز کریم کے حکم کی پاسداری کی خاطر اس تکلیف دہ آزمائش سے دوچار تھا۔ اسے بختیار سے اس بدلحاظی اور نالائقی کی ہرگز امید نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رات بھی گہری ہوتی جارہی تھی۔ آخر مردان شاہ کندھے پر سفید چادر درست کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ گیا۔ اب اس میں مزید انتظار کی ہمت نہیں تھی۔ وہ محض شاہ کریم سے کیے وعدے کو نبھانے کا سوچ کر امتیاز کے ساتھ کوٹھی میں آیا تھا مگر امتیاز نے ہائی کلاس ماحول میں آنے کے بعد سادات گھرانے کی خودداری اور نیک نامی کے خلاف جو مذموم کاروباری طریقے اختیار کیے تھے اس سے اب کوٹھی میں مردان شاہ کی خدمت گاری بے معنی اور شاہ کریم سے ارادت مندی ہی فوت ہوگئی تھی۔ مردان شاہ دس پندرہ منٹ تک بے چینی اور اضطراب

سے کمرے سے باہر لاؤنج میں ٹہلتا رہا بند دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے چند لمحے سوچا تھا پھر اس سے قبل وہ دروازے پر دستک دیتا کمرے کے اندر سے بختیار کا وحشت انگیز قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ وہ مشعل بی بی کو اپنی بانہوں میں لیے شاید کچھ ہی فاصلے پر موجود تھا اور عیش و نشاط سے مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میری جان مشعل، تمہارے بابا سائیں نے میرے ساتھ تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی پردہ باقی نہ رہے۔" بختیار کے جملے سن کر مردان شاہ کی پیشانی غیرت کے مارے عرق آلود ہوگئی۔ جواباً مشعل بی بی کی مست نشیلی آواز اس کے کانوں میں سنگ ریزوں کی مانند ٹکرائی۔

"بختیار، تمہارا یہ مائنڈ پہلے سے تھا تو مردان شاہ کو اپنے ساتھ یہاں انیکسی میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟ خادموں اور نوکروں کی نظروں سے پرائیویسی رکھنا ضروری ہے۔ ممیا نے امریکہ سے آنے کے بعد مجھے یہی لیڈ وائز کی تھی۔" معصوم اور بھولی بھالی مشعل بی بی نے اپنے لفظوں سے جس بالغانہ سوچ کا اظہار کیا تھا اسے سن کر مردان شاہ کا چہرہ کم مائیگی اور شرم سے متغیر ہوگیا۔ پھر بختیار کا جواب سن کر اس عجز و انکسار کے پتلے کے سارے جذبات منجمد ہوگئے۔ اب امتیاز کریم کے حکم کی پاسداری میں وہاں مزید رکنا خود کو ذلتوں کی گہرائیوں میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ بختیار نے کہا تھا۔

"تمہارے بابا سائیں کے اس خاص خادم نے گاڑی میں میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ میں اسے یہاں سزا دینے کی غرض سے لایا ہوں۔ وہ واپسی کے انتظار میں رات بھر کڑھتا سڑتا رہے گا۔ تم بے فکر رہو جانِ من۔" کوٹھی کے ہونے والے نام نہاد داماد بختیار کاکڑ کے حقارت آمیز جملوں سے مردان شاہ نے چند لمحے دکھ اور افسوس سے سوچا۔ شیطان اور جگمگاتی روشنیوں میں عصمتوں کا گھناؤنا کاروبار کرنے والے اشراف کی اولادوں کا تخم بھی منہ زور اور شریر ہوتا ہے۔ محض حیوانیت! دینی و مذہبی حدود سے آزاد اور سماجی واخلاقی روایات سے ماورا کھلی حیوانیت، جس کی نفی انسانیت کرتی ہے۔ مردان شاہ نے اس بارے میں امتیاز کریم کو جواب دہی کا بھی سوچا تھا وہ مشعل کو اپنے ہمراہ نہ لانے پر ناراضی کا منافقانہ اظہار ضرور کرے گا۔ انیکسی کے خوب صورت لاؤنج میں وہ فکر و تشویش سے اندازاً دس منٹ تک سوچتا رہا پھر وہ ایک صائب فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہوگیا اور سفید دستار کو کندھوں پر درست کرتا میانہ روی سے چلتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر کی جانب نکل گیا۔

❀......❀......❀

تاریک رات کی گھمبیرتا گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ یہ چاند کی آخری راتوں میں سے ایک رات تھی۔ اس وقت رات دوسرے پہر میں داخل ہورہی تھی۔ ایک بج چکا تھا۔ کوٹھی کے اندر پارٹی اپنے جوبن پر تھی۔ امتیاز کریم سمیت سبھی شرفا سرور و مستی میں شراب و شباب سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ معزز مہمانوں کی انجوائے منٹ کی غرض سے شہر کی رقاصائیں باری باری لشکارے مارتی، جلوے لٹاتے ہوئے مہمانوں سے خراج وصول کررہی تھیں۔ ایک جانب متحرک ڈانسنگ ہال کے رنگ و نور میں بعض افراد شراب کے جام چڑھاتے ہوئے ان ڈانسرز کے ساتھ خود بھی ناچ رہے تھے۔ امتیاز کریم اور کاکڑ مے نوشی کرتے ہوئے خود بھی حسیناؤں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ رنگ و روشنیوں کے جگمگاتے ماحول میں برپا وحشتوں کے ننگے ناچ میں بیگمات کا کچھ اتا پتا نہ

تھا۔ عدنان شاہ اور بختیار مدہوشی کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے اپنی اپنی منگیتروں کے ساتھ بے باکانہ مشغول ہوگئے تھے۔ شرجیل اور سونیا بھی پارٹی کے اس رنگین ماحول میں مستغرق دکھائی دے رہے تھے اور بامحاورہ ایک حمام میں سبھی ننگے کے مصداق جوش اور جذبات کا اظہار کررہے تھے۔ وسیع ہال کی شیطانی روشنیوں میں ہنگامہ خیزی عروج پر تھی۔ اس وقت مہمانوں کی خاطر داری کی غرض سے نائب عبدالباسط اپنے ماتحت خادموں کے ساتھ ہال میں موجود تھا۔ رسم منگنی کے وقت مردان شاہ اسے ہدایات دینے کے بعد ایسے باہر گیا تھا جیسے وہ امتیاز کریم کی کوٹھی سے بہت دور نکل جانا چاہتا ہو۔ کئی گھنٹے گزر گئے تھے لیکن وہ سوسائٹی کا اخلاق سوز اور بے ہودہ روایات سے متنفر ہونے کی وجہ سے دوبارہ ہال کی جانب نہیں پلٹا تھا۔ ادھر عبدالباسط اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ مردان شاہ کی سوچ وفکر سے باخبر ہو اور واقعی یہ درست تھا۔ نائب عجز وانکساری سے گندھے مردان شاہ کے دل جلے جذبوں سے آگاہ اور اس کے فکر وتدبر کا ارازدار تھا۔ آج کی رات کو اپنی شان وشوکت کی دھاک بٹھانے کی غرض سے امتیاز کریم نے خود سے دلچسپی لیتے ہوئے تیاری کی تھی اور خصوصی طور پر پروگرام ترتیب دیا تھا۔ لیکن عاجزی اور تواضع کی مورت نظر آنے والے مردان شاہ نے بھی ایک پروگرام بنایا تھا جسے عبدالباسط جانتا تھا۔ اس کی سوچ کے عین مطابق خادم خاص کوٹھی سے باہر فرنٹ کے بلند ستونوں سے ملحق چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اس کے افسردہ چہرے پر زودرنجی کے تاثرات تھے اور فکر انگیز سوچوں سے وہ یوں خاموش دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی غم ناک خیال اس کے دل سے خون نچوڑ رہا ہو اور وہ اسے ترک کرنے میں نہایت لاچاری محسوس کررہا ہو۔ اس وقت مردان شاہ کے ہاتھ میں حسب عادت ایک خشک اور خزاں کھائی ٹہنی بھی نظر آرہی تھی۔ وہ دکھ وتذبذب سے سوچتے ہوئے گل وبرگ سے محروم ٹہنی کو بھی دیکھ رہا تھا جس میں محض کانٹے رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک کشمکش میں رہنے کے بعد اس کی افسردہ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ جذباتی تلاطم قدرے کم ہوا تو وہ پر اعتمادی سے خشک ٹہنی کے کانٹوں کو یوں کریدتے ہوئے صاف کرنے لگا جیسے وہ ٹہنی کو بید کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہو لحظہ بہ لحظہ کانٹوں کو ٹہنی سے جھاڑتے ہوئے وہ تیز ہوا کی سرسراہٹ کو اپنے قرب وجوار میں سن رہا تھا۔ اب مردان شاہ کو محض وقت کا انتظار تھا۔

رات کے تین بجنے میں کچھ وقت باقی تھا کہ جب پارٹی کے مہمان کیف وسرور میں لہراتے ہوئے کوٹھی سے رخصت ہونے لگے۔ ادھر امتیاز کریم نے اپنے خاص مہمانوں کو قیام کی غرض سے روک لیا تھا۔ جگمگاتے ہال کی رونق کم ہونے لگی تو ضیاء الدین کاکڑ اور ناہید بیگم سونے کے ارادے سے اوپری منزل کی جانب بڑھ گئے۔ بختیار اور نیلوفر اپنے اپنے ہونے والے جیون ساتھی کو بانہوں میں دبوچے اوپر کمروں میں پہلے ہی جاچکے تھے۔ آخر میں تمام مہمانوں کو گڈ نائٹ کہنے کے بعد امتیاز کریم بھی اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ اس وقت مردان شاہ پرشکوہ ہال کے قریب کھڑا تھا۔ امتیاز کریم نے اوپر جانے سے پہلے خادم خاص کو مہمانوں کے بارے میں ضروری ہدایات دی تھیں۔ حسب عادت اس نے بہت اچھا سائیں کہتے ہوئے سر تسلیم خم کیا تھا۔ اس وقت مردان شاہ کے ہاتھ میں وہ خشک ٹہنی موجود تھی جس کے پیوست کانٹوں کو صاف کرتے ہوئے اس نے ایک سفاکانہ فیصلہ کیا تھا۔ ہال کے وسطی حصے میں رکھے سوفوں کی جانب آتے ہوئے اس کے باریش چہرے پر حزن وملال طاری تھا۔ خشک ٹہنی جو لچکدار بید دکھائی دیتی تھی کو اپنی ہتھیلی پر ردھم کے ساتھ مارتے ہوئے وہ آشفتہ جذبوں سے استاد محمد جمن کا گایا ہوا کلام گنگنانے لگا۔

یار ڈھاڈی عشق آتش لائی اے......
سانوں لگ گئی بے اختیاری......
سینے دے وچ میں سمائی اے......
یار ڈھاڈی عشق آتش لائی اے......

سوفوں کے عقب میں دیوار پر لگے گھڑیال میں تین بج کر پانچ منٹ ہورہے تھے۔ مردان شاہ گنگناتے ہوئے ایک سوفے پر یوں بیٹھ گیا جیسے غم ناک ازخود رفتگی سے مچل گیا ہو اس کی ہدایت پر نائب عبدالباسط نے ہال کے جگمگاتے فانوس یکے بعد دیگرے بجھائے سوفوں کے نزدیک موجود نائٹ بلب کو روشن کیا اور نیم تاریکی میں چلتے ہوئے مردان شاہ کے قریبی سوفے پر بیٹھ گیا۔

''شاہ جی، کیا آپ خرم شاہ کو بھی کارروائی میں ساتھ لیں گے؟'' عبدالباسط نے پراسرار لہجے میں مردان شاہ سے پوچھا۔

''نہیں عبدالباسط میں نے بیٹے اور بہو کو حیات آباد جانے کی غرض سے تیاری کا کہا ہے۔ زیب النساء کی فکرمندی کے خیال سے اسے کارروائی کا نہیں بتایا ہے۔ تم نے محمد حسین کو ادھر ہال میں آنے کا کہہ دیا تھا نا؟'' جواباً مردان شاہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا اور عبدالباسط سے دریافت کیا۔

''جی ہاں شاہ جی، وہ کوٹھی کے باقی خادموں کے ساتھ یہاں سامان کا تھیلا لے کر پہنچے گا۔'' نائب کی بات سن کر مردان شاہ کے چہرے پر سرد مہری عود کرآئی تھی اور ہاتھ میں ہولے ہولے سے بید تھرتھرا رہی تھی۔ بیس پچیس منٹ بعد امتیاز کریم کا پرسنل سیکریٹری گارڈ محمد حسین کوٹھی کے ان چار خادموں کے ہمراہ چلتے ہوئے نیم تاریک ہال میں داخل ہوا جو مردان شاہ نے کارروائی کے لیے تفویض کیے تھے۔ ان میں محمد حسین کا دست راست گارڈ کفایت اللہ، باغبانی کے شعبے کا انچارج شاہ نواز، ایڈمنسٹریشن میں منشی کے ساتھ کام کرنے والا کلرک، معین الدین اور باورچی نذر محمد شامل تھے۔ یہ سب مردان شاہ کے مرید اور معتقد تھے۔ ان کے علاوہ باقی تمام ملازمین کو مردان شاہ کی ہدایت پر چھٹی کرکے گھر بھیج دیا گیا تھا محمد حسین کے کاندھے سے رائفل لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھی کفایت اللہ نے چرمی تھیلا اٹھایا ہوا تھا۔ پھر وہ پانچوں خادم صوفوں کے نزدیک مردان شاہ کے قریب آگئے۔ محمد حسین نے تھیلا کھول کر مردان شاہ کے سامنے رکھ دیا اور مودبانہ لہجے میں بولا۔

''شاہ جی! ہتھیار لے آیا ہوں۔ آپ جب چاہیں کارروائی شروع کرسکتے ہیں۔'' اس کی بات سن کر مردان شاہ نے تھیلے میں موجود آتشیں اسلحے کا جائزہ لیا پھر اس نے سائلنسر لگے پستول کو چیک کرتے ہوئے سنگدلانہ اور مہیب لہجے میں کہا۔

''تم سب مسلح ہوکر تیار ہوجاؤ ہم ٹھیک دس منٹ بعد کارروائی کے لیے پہلی منزل کا رخ کریں گے۔ انسان کے جسم میں غیرت اور ناموس کا احساس باقی نہ رہے تو وہ حیوانوں سے بدتر ہوجاتا ہے۔ امتیاز سائیں بھی حیوان بن گیا ہے۔ اس نے رشتوں کے تقدس کو اپنے مجرمانہ کاروبار کے ذریعے جس طرح پامال کیا ہے اسے اس کی سزا دینا ضروری ہے۔'' نفرت انگیز جذبوں سے مردان شاہ کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا۔

''جو حکم شاہ جی......!'' باغبان شاہ نواز نے تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ عبدالباسط اور

دیگر خادموں نے بھی مردان شاہ کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے ساتھ نبھانے کا عہد کیا پھر سب نے اپنے اپنے ہتھیار کا انتخاب کیا۔ عبدالباسط نے بھی سائیلنسر لگے پستول کو چنا، کلرک معین الدین اور باغبان شاہ نواز نے اپنے لیے شاٹ گن کا انتخاب کیا باورچی نذر محمد نے ٹی ٹی پستول کو آزمانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ گارڈ محمد حسین اور کفایت اللہ پہلے ہی رائفل سے مسلح اور چوکس نظر آرہے تھے۔ ٹھیک دس منٹ بعد یہ سب لوگ نقاب لگائے اور دو گروپوں کی شکل میں زینے سے اوپری منزل کے کمروں کی جانب بڑھنے لگے......!

پھر گناہوں کی اس تاریک رات میں امتیاز کریم سمیت تمام افراد کو قتل کردیا گیا۔ یہ کل دس افراد تھے۔ مردان شاہ نے اپنے گروپ کی رہنمائی کرتے ہوئے امتیاز کریم، درخشاں بیگم، بختیار اور مشعل بی بی، بڑے بیٹے شرجیل شاہ اور سونیا بی بی کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا جبکہ دوسرے گروپ میں نائب عبدالباسط نے ضیاء الدین کاکڑ، ناہید بیگم عدنان شاہ اور نیلوفر کو خون میں نہلا کر ابدی نیند سلادیا۔ اس شب خون میں انسانیت نے منہ زور بے ہودہ اور آزاد حیوانیت کی شدومد سے نفی کی تھی اور اس کا خاتمہ کرکے آبائی غیرت وناموس کی تذلیل کا پورا بدلہ لیا گیا تھا۔ مردان شاہ اپنے ارادت مند ساتھیوں کے ساتھ کوٹھی سے باہر آیا تو اس کی دستار کی چادر میں ایک شیر خوار بچہ رو رہا تھا۔ یہ نومولود عظام شاہ تھا، شرجیل اور سونیا کا بیٹا! مردان شاہ کے ہاتھوں سے قتل ہونے والے امتیاز کریم دیگر خاندان کے افراد گناہگار اور معصیت میں ڈوبے گمراہ لوگ تھے وہ سادات کی عفت سے کھلا انحراف کرنے والے لوگ تھے۔ معصومان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن عظام شاہ ایک معصوم بچہ تھا جس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس وقت مردان شاہ کی بہو زیب النساء اور بیٹا خرم شاہ تیار ہوکر صدر دروازے کے قریب آگئے۔ دونوں پوتیاں اور کچھ رخت سفر ان کے ساتھ تھا۔ مردان شاہ نے نومولود عظام شاہ کو بہو کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی، یہ بچہ سادات کی آبرو کی نشانی ہے اب اس کی پرورش کی ذمہ داری تم پر ہے۔ نیک بچے کی سعادت مندی اس کے ماں باپ کی تعلیم وتربیت پر منحصر ہوتی ہے۔" زیب النساء اور خرم شاہ نے بچے کو پیار ومحبت سے چمکارا۔ ان کی دونوں بچیوں نے بھی عظام شاہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ انہیں ننھا منا بھائی میسر آگیا تھا۔ یہ ساڑھے چار بجے کا وقت تھا۔ صبح صادق ہونے کو تھی۔ اس کے بعد سب لوگ ہائی لیکس اور پجارو میں جا بیٹھے۔ خرم شاہ بیوی بچوں کو لے کر کار میں امتیاز ہاؤس سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے عقب میں حفظ ماتقدم کے خیال سے مردان شاہ اپنے ساتھی خادموں کے ہمراہ پجارو میں سوار ہوا تھا۔ جس وقت فجر کی اذان ہورہی تھی دونوں گاڑیاں امتیاز کریم کی طاغوتی اور وحشتوں بھری کوٹھی سے دور نکل آئی تھیں۔ اب ان گاڑیوں کا رخ حیات آباد کی جانب تھا۔ جہاں مردان شاہ کا داماد دانیال اور بیٹی عمرانہ ان سب کی آمد کے منتظر تھے۔

⌘